ترکیب نماز
اور ائمہ اربعہ کے اختلافی مسائل

ہاتھ سینہ پر، یا ناف کے نیچے باندھنے کی بحث:

سوال: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا نماز میں زیر ناف ہاتھ باندھنا، یا سینہ پر ہاتھ باندھنے سے منع کرنا (ثابت ہے، یا نہیں؟)

الجواب

وذکر عن علی: من السنة فی الصلاة وضع الکف علی الأکف تحت السرة. (رواہ أبوداؤد وأحمد واللفظ له)(۱)

پس سنت کہنا حضرت علی رضی اللہ عنہ کا "**وضع الکف علی الکف**" کو "**تحت السرة**" دال ہے اس پر کہ یہ فعل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ہے۔(۲) (فتاویٰ دارالعلوم دیوبند: ۱۸۵/۲-۱۸۶)

سینہ پر ہاتھ باندھنا درست ہے، یا نہیں:

سوال: سینہ پر ہاتھ باندھنا درست ہے، یا نہیں؟

الجواب

عندالحنفیہ سنت ناف سے نیچے ہاتھ باندھنا ہے۔(۳) فقط (فتاویٰ دارالعلوم دیوبند: ۱۷۲/۲)

---

(۱) غنية المستملی، صفة الصلاة: ۲۹٤، ظفیر (سنن أبی داؤد، باب وضع الیمنٰی علی الیسریٰ فی الصلاة (ح: ۷٥٦)/ سنن الدارقطنی، باب أخذ الشمال بالیمین فی الصلاة (ح: ۱۱۰۲)/ السنن الکبریٰ للبیهقی، باب وضع الیدین علی الصدر فی الصلاة (ح: ۲۳٤۱)/ مسند الإمام أحمد، مسند علی بن أبی طالب (ح: ۸۷٥)/ أحکام القرآن للطحاوی، تأویل قوله تعالیٰ: فصل لربک وانحر: ۱۸٥/۱، طبع استانبول. انیس)

(۲) عن علقمة بن وائل بن حجر عن أبیه قال رأیت النبی صلی اللّٰہ علیه وسلم یضع یمینه علیٰ شماله فی الصلاة تحت السرة. (رواہ ابن أبی شیبة وإسنادہ صحیح {آثار السنن، أبواب صفة الصلاة، باب فی وضع الیدین تحت السرة} ظفیر) (رقم الحدیث: ۳۳۰، ص: ۱۱۱، انیس)

(۳) (وضع) الرجل (یمینه علیٰ یسارہ تحت سرته، إلخ). (الدر المختار علیٰ هامش رد المحتار، باب صفة الصلاة: ٤٥٤/۱، ظفیر) (فروع قرأ بالفارسية أو التوراة أو الإنجیل، انیس)

ہاتھ سینہ پر باندھنا:

سوال: سینہ پر ہاتھ رکھنا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب ــــــــــــــــ حامداً و مصلیاً

مرد کو ناف کے نیچے ہاتھ باندھنا سنت ہے اور عورت کو سینہ پر، اگر مرد نے سینہ پر ہاتھ باندھ کر نماز پڑھی، تب بھی نماز ہو جائے گی، مگر تارک سنت ہوا۔(۱) واللہ سبحانہ تعالیٰ اعلم وعلمہ اتم واحکم

حررہ العبد محمود گنگوہی، معین مفتی مدرسہ مظاہر علوم سہارن پور، ۱۴/۱۲/۱۳۵۴ھ

صحیح: عبد اللطیف عفی عنہ، مدرسہ مظاہر علوم، ۱۵/ ذی الحجہ ۱۳۵۴ھ۔ (فتاویٰ محمودیہ: ۵/۵۸۸)

ہاتھ ناف کے اوپر باندھنا:

سوال: نماز میں تحریمہ باندھنا ناف کے اوپر حدیث سے ثابت ہے، یا نہیں؟

الجواب ــــــــــــــــ

ناف کے اوپر اور نیچے ہاتھ باندھنا دونوں حدیث سے ثابت ہیں،(۲) حنفیہ نے حدیث زیر ناف کو معمول بہ بنایا ہے۔(۳) فقط (فتاویٰ دار العلوم دیوبند: ۲/۱۸۳)

---

(۱) ترک السنة لایوجب فساداً ولاسهواً، بل إساءة لو عامداً غیر مستخف، وقالوا: الإساءة أدون من الکراهة.(الدر المختار)

وفی رد المحتار: "(قوله:عامداً غیر مستخف)فلو غیر عامد فلا إساءة أیضاً،بل تندب إعادة الصلاة". (کتاب الصلاة ،فصل فی بیان تألیف الصلاة: ۱/٤٧٤ ،سعید)(باب صفة الصلاة،مطلب:سنن الصلاة،انیس)

(ووضع یمینه علی یساره تحت سرته مستفتحاً لما روینا،وهو سنة القیام". (زیلعی،ص: ۱۱۱)(تبیین الحقائق للزیلعی،کتاب الصلاة،باب صفة الصلاة: ۱/۲۸۹ ، دار الکتب العلمیة،بیروت)((فصل)أی فی بیان الشروع فی الصلاة وبیان إحرامها وأحوالها،انیس)

(۲) أن علیا رضی اللّٰه عنه قال: من السنة وضع الکف علی الکف فی الصلاة تحت السرة.(رواه أبو داؤد،باب وضع الیمنٰی علی الیسریٰ فی الصلاة (ح:٧٥٦)/عن إبراهیم قال:یضع یمینه علی شماله فی الصلاة تحت السرة.(مصنف ابن أبی شیبة،وضع الیمین علی الشمال (ح:٣٩٣٩)/عن وائل بن حجر قال:صلیت مع رسول اللّٰه صلی اللّٰه علیه وسلم ووضع یده الیمنیٰ علی یده الیسریٰ علی صدره.(باب وضع الیمین علی الشمال فی الصلاة قبل افتتاح القراءة (ح:٤٧٧)/عن طاؤس قال:کان رسول اللّٰه صلی اللّٰه علیه وسلم یضع یده الیمنیٰ علی یده الیسریٰ ثم یشد بهما علی صدره وهو فی الصلاة.(المراسیل لأبی داؤد،باب ماجاء فی الاستفتاح (ح:٣٣)،مؤسسة الرسالة بیروت. انیس)

(۳) یضع یمینه علی یساره بعد التکبیر،إلخ، تحت السرة،إلخ، وذکر عن علی: من السنة فی الصلوٰة وضع الأکف علی الأکف تحت السرة.رواه أبو داؤد وأحمد واللفظ له،إلخ.(غنیة المستملی،صفة الصلاة: ٢٩٤،ظفیر)

تحت السرۃ ہاتھ باندھنا:

سوال: حنفیہ نماز میں ہاتھ کہاں باندھتے ہیں ''فوق السرۃ'' یا ''تحت السُرۃ''، مفتیٰ بہ اور معمول بہ روایت کیا ہے، اولویت کس میں ہے؟

الجواب ــــــــــــــــــــــــــــ

حنفیہ کے نزدیک تحت السرۃ والی حدیث ماخوذ بہ اور معمول بہ ہے، فوق السرۃ والی حدیث معمول بہ نہیں ہے اور خلاف اولویت میں ہے، نماز ہر طرح ہوجاتی ہے۔(۱) فقط (فتاویٰ دارالعلوم دیوبند: ۲/۱۷۹) ☆

(۱) (ووضع) الرجل (يمينه علىٰ يساره تحت سرته آخذًا رسغها بخنصره وإبهامه) هو المختار. (الدر المختار علىٰ هامش ردالمحتار، باب صفة الصلاة: ۱/ ٤٥٤، ظفير) (فروع قرأ بالفارسية أو التوراة أو الإنجيل، انيس)

(يضعهما) الرجل (تحت السرة، إلخ)، قال الشيخ كمال الدين بن الهمام كون الوضع تحت السرة أو الصدر لم يثبت فيه حديث يوجب العمل فيحال على المعهود من وضعهما حال قصد التعظيم في القيام والمعهود في شاهد منه تحت السرة وذكر عن علي رضي الله عنه "من السنة في الصلاة وضع الأكف على الأكف تحت السرة، رواه أبو داؤد رحمه الله وأحمد رحمه الله واللفظ له، إلخ. (غنية المستملي، صفة الصلاة: ١٩٤، ظفير)

(مسند الإمام أحمد، مسند علي بن أبي طالب (ح: ٨٧٥)/ سنن أبي داؤد، باب وضع اليمنى على اليسرى في الصلاة (ح: ٧٥٨) انيس)

☆ **زیر ناف ہاتھ باندھنے کو غلط کہنے والے کا جواب:**

سوال: حالت نماز میں زیر ناف ہاتھ باندھنا غلط ہے اور سینہ پر ہاتھ باندھنا صحیح ہے؟

الجواب ــــــــــــ حامداً و مصلیاً

آپ نے زیر ناف ہاتھ باندھنے کو غلط بتایا ہے، اس کی کیا دلیل ہے؟ ظاہر ہے کہ آپ نے اپنی طرف سے تو یہ حکم لگایا نہیں ہوگا، کہیں سے اجتہاد تو کیا نہیں ہوگا، دین کے مسئلہ میں رائے کو دخل دیا نہیں ہوگا، ضرور آپ کے پاس اس بات کی حدیث ہوگی اور وہ قوی ہوگی، ضعیف پر تو عمل کرتے نہ ہوں گے۔ اب اس مسئلہ سے متعلق پوری حدیث سند اور حوالہ کے ساتھ تحریر فرمادیں؛ کیونکہ بغیر دلیل اور بغیر حدیث کے اس قسم کی باتیں کرنا کوئی اچھا کام نہیں ہے؛ بلکہ گمراہی پھیلانا ہے، اللہ تعالیٰ آپ کو ہم سب کو گمراہ ہونے اور گمراہ کرنے سے بچائے اور ہادیٔ عالم رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال و اعمال کے اتباع کی توفیق دے اور دین کی سمجھ عطا فرمائے۔ (آمین) فقط والسلام

أملاہ العبد محمود غفرلہ دارالعلوم دیوبند، ۲۰/۱۱/۱۴۰۰ھ۔ (فتاویٰ محمودیہ: ۵/۵۸۷-۵۸۸)

ہاتھ سینے پر باندھنے کی تحقیق:

سوال: ہاتھ سینہ پر باندھنا از روئے قرآن و حدیث و فعل صحابہ رضی اللہ عنہم درست ہے یا نہیں؟ ==

قرأت خلف الامام:

سوال: قرأت خلف الامام میں کیا قول ہے؟

الجواب

حنفیہ کے نزدیک امام کے پیچھے قرأت فاتحہ جائز نہیں ہے۔

عن أنس رضی اللّٰہ عنه قال: صلّی رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیه وسلم، ثم أقبل بوجهه فقال: (أتقرؤن والإمام یقرأ) فسکتوا فسألهم ثلاثاً فقالوا إنا لنفعل، قال: (فلا تفعلوا).

قال علی رضی اللّٰہ عنه: من قرأ خلف الإمام فلیس علی الفطرة.

وعن عبد اللّٰہ بن دینار، عن عبد اللّٰہ بن عمر رضی اللّٰہ عنهما قال: یکفیک قراءة الإمام فهؤلاء جماعة من أصحاب رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیه وسلم قد أجمعوا علیٰ ترک القراءة خلف الإمام. (۱) (فتاویٰ دار العلوم دیوبند: ۲/۲۱۷، وایضاً: ۲۵۳)

قرأت خلف الامام جائز ہے، یا نہیں:

سوال: امام کے پیچھے قرأت جائز ہے یا نہیں؟

الجواب

امام ابوحنیفہؒ کے مذہب میں مقتدیوں کو سورۂ فاتحہ وغیرہ پڑھنا ممنوع ہے۔ (۲)

==

الجواب

ہاتھ ناف کے نیچے باندھنے چاہئیں۔

قال فی الهدایة: ویعتمد بیده الیمنیٰ علی الیُسریٰ تحت السرة. لقوله علیه السلام: إن من السنة وضع الیمین علی الشمال تحت السرة، إلخ. (أن علیاً رضی اللّٰہ عنه قال: من السنة وضع الکف علی الکف فی الصلاة تحت السرة. (رواه أبو داؤد، باب وضع الیمنیٰ علی الیسریٰ فی الصلاة (ح: ۷۵۶) انیس) **ولأن الوضع تحت السرة أقرب إلی التعظیم.** (الهدایة، باب صفة الصلاة: ۱/۹۵-۹۶، ظفیر)

وفی حدیث إبراهیم النخعی رحمة اللّٰہ علیه مایدل علیه روی أبوحنیفة رحمة اللّٰہ علیه عن حماد رحمة اللّٰہ علیه عن إبراهیم النخعی رحمة اللّٰہ علیه أن النبی صلی اللّٰہ علیه وسلم کان یعتمد بیده الیمنیٰ علی الیسریٰ تواضعاً، إلخ. (حاشیة الهدایة، باب صفة الصلاة تحت قوله وضع الیمین: ۱/۹۶، ظفیر) فقط (فتاویٰ دار العلوم دیوبند: ۲/۱۸۷-۱۸۸)

(۱) شرح معانی الآثار: ۱/۱۲۸-۱۲۹، ظفیر (کتاب الصلاة، باب القراءة خلف الإمام (ح: ۱۳۰۲-۱۳۰۶-۱۳۱۸/انیس)

(۲) (والمؤتم لایقرأ مطلقاً) ولا الفاتحة فی السریة اتفاقاً (فإن قرأ کره تحریماً (إلیٰ قوله) بل یستمع) إذا جهر (وینصت) إذا أسر لقول أبی هریرة رضی اللّٰہ عنه کنا نقرأ خلف الإمام فنزل ﴿وَإِذَا قُرِءَ الْقُرْآنُ فَاسْتَمِعُوا لَهُ وَأَنْصِتُوا﴾. (الدر المختار علیٰ هامش رد المحتار: ۱/۵۰۸، ظفیر) (کتاب الصلاة، باب صفة الصلاة، فصل فی القراءة، انیس)

امام شافعیؒ ضروری فرماتے ہیں؛ مگر حنفیوں کو امام شافعیؒ کا مذہب اس بارے میں اختیار کرنا جائز نہیں ہے۔ حدیث مسلم شریف میں: "وإذا قرأ فأنصتوا". (۱) یعنی جب امام پڑھے تم چپ رہو۔

دوسری حدیث میں ہے: امام کی قرأت مقتدی کی قرأت ہے۔ (۲) فقط (فتاویٰ دار العلوم دیو بند: ۲/۲۵۶) ☆

فاتحہ خلف الامام کی بحث:

سوال: کسی حدیث سے اللہ تعالیٰ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا قراءۃ فاتحہ خلف الامام کو منع کرنا (ثابت ہے یا نہیں؟)

الجواب

اللہ تعالیٰ نے بھی منع فرمایا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی۔

(۱) مشکوٰة، باب القراءة في الصلاة: ۸۱، ظفير) (الفصل الأول، رقم الحديث: ۸۲۷/الصحيح لمسلم، باب التشهد في الصلاة (ح: ٤٠٤) انيس)

(۲) عن ابن عمر أنه سأل عن القراءة خلف الإمام قال: تكفيك قراءة الإمام. (موطأ الإمام مالك برواية محمد بن الحسن الشيباني، باب فتتاح الصلاة (ح: ١٦٦)

عن جابر عن النبي صلى الله عليه وسلم قال: "من صلى خلف إمام فإن قراءة الإمام له قراءة". قال محمد: وبه نأخذ وهو قول أبي حنيفة رحمه الله تعالىٰ. (باب القراءة خلف الإمام وتلقينه (ح: ٨٦) دار الكتب العلمية بيروت. انيس)

☆ قرأت خلف الامام درست ہے، یا نہیں:

سوال: قرأت خلف الامام جائز ہے یا ناجائز؟ اگر ناجائز ہے تو کیا دلیل ہے؟

الجواب

قرأت خلف امام نزد امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ جائز نیست۔ لقوله عليه السلام: "من كان له إمام فقراءة الإمام له قراءة". (رواه الطحاوي والإمام محمد في مؤطاه وإسناده صحيح كما في آثار السنن)

وقوله عليه السلام: "وإذا قرأ فأنصتوا". (الحديث، رواه مسلم وغيره) (دیکھئے: مشكوٰة، باب القراءة في الصلاة، ص: ۷۹-۸۱ (الفصل الأول، رقم الحديث: ۸۲۷، انيس) / آثار السنن، باب في ترك القراءة خلف الإمام: ۱/۸۷، ظفير) (في الصلوات كلها، رقم الحديث: ٣٦٤، انيس) والله تعالىٰ اعلم

کتبہ عزیز الرحمٰن مفتی مدرسہ عالیہ دیو بند

ويكره عندهما لما فيه من الوعيد ويستمع وينصت. (الهداية) قال العلامة بدر الدين العيني في شرح الهداية: وفي شرح التأويلات عن سعد بن أبي وقاص رضي الله عنه: "من قرأ خلف الإمام لاصلوٰة له". وروى أيضاً نهى عن ذلك جماعة من الصحابة رضي الله عنه (جميل الرحمن) دیکھئے: البناية في شرح الهداية، فصل في القراءة: ۲/۱۷۱، ظفير) (فتاویٰ دار العلوم دیو بند: ۲/۲۶۷)

قال اللّٰہ تعالیٰ: ﴿وَإِذَا قُرِءَ الْقُرْاٰنُ فَاسْتَمِعُوْا لَهُ وَأَنْصِتُوْا﴾(۱)

وفی حدیث مسلم رحمه اللّٰہ:"وإذا قرأ فأنصتوا". (۲)(فتاویٰ دار العلوم:۲/۱۸۵-۱۸۶)

فاتحہ خلف الامام پر عمل کی بحث:

سوال: بزرگان دین میں سے کسی نے فاتحہ خلف امام ورفع الیدین وآمین بالجہر مسائل پر عمل کیا ہے، یا نہیں؟

الجواب

بعض نے کیا ہے؛ مگر اکثر صحابہ وتابعین وتبع تابعین کا عمل اس کے خلاف ہے اور خود احادیث مرفوعہ بھی اس کے خلاف وارد ہیں ۔(۳) فقط (فتاویٰ دار العلوم دیوبند:۲/۲۲۳)☆

(۱) سورة الأعراف، رکوع:۲٤، رقم الآية:۲۰٤، ظفير

(۲) مشکٰوة، باب القراءة فى الصلوٰة، ص: ۸۱/و اٰثار السنن، أبواب صفة الصلاة، باب فى ترک القراءة خلف الإمام فى الجهرية، ظفير)(رقم الحديث: ۳٥۹، ص: ۱۲۹/الصحيح لمسلم، باب التشهد فى الصلاة (ح: ٤۰٤)انيس)

(۳) (والمؤتم لايقرأ مطلقاً)ولا الفاتحة فى السرية اتفاقاً، ومانسب لمحمد ضعيف كما بسطه الكمال (فإن قرأ كره تحريماً)وتصح فى الأصح. وفى درر البحار عن مبسوط خواهر زاده: إنها تفسد ويكون فاسقاً، وهو مروى عن عدة من الصحابة فالمنع أحوط. (الدر المختار)

(مروى عن عدة من الصحابة)قال فى الخزائن: وفى الكافى: ومنع المؤتم من القراءة مأثور عن ثمانين نفرًا من كبار الصحابة منهم المرتضى والعبادلة، وقد دون أهل الحديث أساميهم. (رد المحتار، باب صفة الصلاة، فصل فى القراءة: ۱/٥۰۸، (مطلب: السنة تكون سنة عين وسنة كفاية، انيس)

"إذا قرىء فأنصتوا". (الصحيح لمسلم، باب التشهد، ظفير)(كتاب الصلاة، رقم الحديث: ٤۰٤، ص: ۱۷٤، بيت الأفكار، انيس)

☆ فاتحہ خلف الامام کی تحقیق:

سوال: نماز میں امام کے پیچھے سورہ فاتحہ پڑھنا از روئے قرآن وحدیث وفعل صحابہ رضی اللہ عنہم درست ہے یا نہیں؟

الجواب

امام کے پیچھے سورہ فاتحہ یا کوئی سورۃ پڑھنا نص قطعی اور احادیث صحیحہ سے ممنوع ہے۔قرآن شریف میں ہے:

" وَإِذَا قُرِءَ الْقُرْآنُ فَاسْتَمِعُوْا لَهُ وَأَنْصِتُوْا". (الآية)(سورة الأعراف، ركوع: ۲٤، رقم الآية: ۲۰٤، ظفير)

اور حدیث مسلم میں ہے:

"وإذا قرء فأنصتوا". (دیکھئے: وآثار السنن، أبواب صفة الصلاة، باب ترک القراءة خلف الإمام فى الجهرية: ۱/۸٥، رقم الحديث: ۳٥۹، ص: ۱۲۹، انيس) مشكوة، باب القراءة فى الصلاة: ۸۱، ظفير)

اور دوسری روایت میں ہے:

"من كان له إمام فقراءة الإمام قراءة له". (الحديث. أو كما قال صلى الله عليه وسلم)(آثار السنن، باب فى ترک القراءة خلف الإمام فى الصلوات كلها: ۱/۸۷)(رقم الحديث: ۳٦۷، انيس)(فتاویٰ دار العلوم دیوبند: ۲/۱۸۷)

فاتحہ خلف الامام:

سوال: شاہ رفیع الدین صاحب قدس سرہ دہلوی نے تحریر فرمایا ہے کہ امام کے پیچھے سورۂ فاتحہ پڑھنا جائز ہے اور پڑھنے میں کوئی حرج نہیں، نہ پڑھنے میں خوف ہے نماز کے نہ ہونے کا، اس مسئلہ میں کیا حکم ہے؟

الجواب

جب کہ حدیث شریف میں صاف امر ہے: "**وإذا قرأ فأنصتوا**". (۱)

اور دوسری حدیث شریف میں ہے: "**من كان له إمام فقراءة الإمام له قراءة**". (۲)

اور نیز قرآن شریف میں ارشاد ہے: ﴿ **وَإِذَا قُرِءَ الْقُرْآنُ فَاسْتَمِعُوْا لَهُ وَأَنْصِتُوْا** ﴾ (الآية) (۳)

اس صورت میں مقتدی کو امام کے پیچھے فاتحہ وغیرہ پڑھنے کی گنجائش نہیں ہے؛ جیسا کہ کتب فقہ میں مفصلاً مذکور ہے اور حنفیہ کو اپنے امام کے مذہب پر عمل کرنا چاہیے۔ فقط (فتاویٰ دار العلوم دیوبند: ۲۳۹/۲) ☆

(۱) مشكوة، باب القراءة في الصلوة، ص: ۷۹-۸۱، ظفير (الفصل الأول، رقم الحديث: ۸۲۷، انيس)

(۲) آثار السنن، باب في ترك القراءة خلف الإمام في الصلوات كلها: ۸۷/۱، ظفير (رقم الحديث: ۳٦٤، انيس)

(۳) سورة الأعراف، ركوع: ۲٤، رقم الآية: ۲۰٤، ظفير

☆ **فاتحہ خلف الامام:**

سوال: مقتدی کو امام کے پیچھے قرأت کرنے کا کیا حکم ہے؟ بعض صاحب فرماتے ہیں کہ بغیر فاتحہ کے نماز مقتدی کی نہیں ہوتی، اور بعض صاحب فرماتے ہیں کہ امام کی قرأت مقتدی کو کافی ہے۔ صحیح کیا بات ہے؟ اور مقتدی کو قرأت کرنا چاہئے یا نہیں؟

الجواب

جو صاحب یہ فرماتے ہیں کہ امام کی قرأت مقتدی کو کافی ہے ان کا قول صحیح ہے۔ مقتدی کو امام کے پیچھے قرأت کرنا نہ چاہئے۔ امام ابوحنیفہؒ کا یہی مذہب ہے۔ حدیث شریف میں ہے:

"**من كان له إمام فقراءة الإمام له قراءة**". (آثار السنن، باب في ترك القراءة خلف الإمام في الصلوات كلها، رقم الحديث: ۳٦٤، انيس)

دوسری حدیث میں ہے: "**وإذا قرأ فأنصتوا**". (الحديث) (مشكوة، ص: ۷۹-۸۱) (باب القراءة في الصلوة، الفصل الأول، ص: ۷۹-۸۱، رقم الحديث: ۸۲۷، انيس) فقط (فتاویٰ دار العلوم دیوبند: ۲٦۰/۲)

فاتحہ خلف الامام کا حکم ہے یا نہیں:

سوال: امام کے پیچھے "**الحمد**" پڑھنے کا کیا حکم ہے؟

الجواب

امام کے پیچھے "الحمد" اور سورت کچھ نہ پڑھنی چاہئے؛ جیسا کہ حدیث شریف میں ہے: "**وإذا قرأ فأنصتوا**". (مشكوة، باب القراءة في الصلوة، الفصل الأول، ص: ۷۹-۸۱، رقم الحديث: ۸۲۷، انيس)

==

فاتحہ خلف الامام اور ہاتھ ناف کے نیچے باندھنا:

سوال: امام کے پیچھے "الحمد" پڑھنا جائز ہے یا نہیں اور ہاتھ "تحت السرة" یا "فوق السرة" باندھنا چاہئے؟ "تحت السرة" باندھنے پر بعض غیر مقلدین اعتراض وطعن کرتے ہیں؟

الجواب

امام کے پیچھے الحمد وغیرہ جملہ قرأت کی ممانعت قرآن شریف اور احادیث صحیحہ سے ثابت ہے۔

قال الله تعالىٰ: ﴿وَإِذَا قُرِءَ الْقُرْآنُ فَاسْتَمِعُوا لَهُ وَأَنْصِتُوا﴾ (الآية) (۱)

وفی حدیث مسلم "وإذا قرأ فأنصتوا". (الحديث) (۲)

اور حدیث صحیح ہے: "من كان له إمام فقراء ة الإمام له قراء ة". (۳)

اور فوق السرہ وتحت السرہ ہاتھ باندھنے کی دونوں طرح کی حدیثیں موجود ہیں، کسی امام نے کسی پر عمل کیا اور کسی نے کسی پر۔ (۴) اعتراض کسی پر نہیں ہوسکتا، ایضاح الادلہ منگا کر اس میں یہ سب مسائل موجود ہیں اور ان کی احادیث دیکھ لیجئے، بہت کام کی کتاب ہے اور غیر مقلدوں کے جواب میں بے مثل ہے، ہر ایک مسئلہ خلافی میں احادیث نقل کی ہیں اور امام صاحب کی مؤید احادیث مفصل تحریر فرمائی ہیں۔ (فتاویٰ دار العلوم دیوبند: ۲/۲۵۷)

== عن أبی هريرة رضی الله عنه قال قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: إنما جعل الإمام ليؤتم به فإذا كبر فكبروا وإذا قرأ فأنصتوا. (رواه أبو داؤد والنسائی وابن ماجة) (مشكوة، ص: ۸۱) (كتاب الصلاة، باب القراءة فی الصلاة، الفصل الثانی، رقم الحديث: ۸۵۷، انیس)

اور دوسری حدیث میں ہے: "من كان له إمام فقراء ة الإمام له قراء ة". (موطأ الإمام محمد: ۷۸، ظفیر) (ایک جگہ ہے: من صلّى خلف إمام فإن قراء الإمام له قراء ة. رقم الحديث: ۱۱۷) (دوسری جگہ "من كان له إمام فإن قراء ته له قراء ة" ہے۔ رقم الحديث: ۱۲٤، باب القراءة فی الصلاة خلف الإمام، انیس) (فتاویٰ دار العلوم دیوبند: ۲/۲۵۶)

(۱) سورة الأعراف: ركوع: ۲٤، رقم الآية: ۲۰٤.

(۲) الصحيح لمسلم: ۱/۱۷٤ (دیکھئے: آثار السنن، أبواب صفة الصلاة، باب ترك القراءة خلف الإمام فی الجهرية: ۱/۸۵، رقم الحديث: ۳۵۹، ص: ۱۲۹، انیس) ومشكوة، باب القراءة فی الصلاة، ص: ۸۱، انیس)

(۳) موطأ الإمام محمد، ص: ۷۸) (ایک جگہ ہے: "من صلّى خلف إمام فإن قراء الإمام له قراء ة". رقم الحديث: ۱۱۷، (دوسری جگہ "من كان له إمام فإن قراء ته له قراء ة" ہے، رقم الحديث: ۱۲٤، باب القراءة فی الصلاة خلف الإمام، انیس)

(۴) رواه أبو داؤد فی سننه عن علی أنه قال: السنة وضع الكف على الكف تحت السرة. (نصب الراية: ۱/۳۱۳۔ ظفیر) / (سنن أبی داؤد، باب وضع اليمنىٰ على اليسرىٰ فی الصلاة (ح: ۷۵٦) / سنن الدارقطنی، باب أخذ الشمال باليمين فی الصلاة (ح: ۱۱۰۲) / السنن الكبرىٰ للبيهقی، باب وضع اليدين على الصدر فی الصلاة (ح: ۲۳٤۱) / مسند الإمام أحمد، مسند علی بن أبی طالب (ح: ۸۷۵) / أحكام القرآن للطحاوی، تأويل قوله تعالىٰ: فصل لربك وانحر: ۱/۱۸۵، طبع استانبول، انیس)

سورۂ فاتحہ امام کے پیچھے اور آمین کا مسئلہ:

سوال: بعض معلم کہتے ہیں کہ امام کے پیچھے سورۂ فاتحہ کے بعد آمین پکارنا ناجائز ہے اور امام کے پیچھے سورۂ فاتحہ پڑھنی ناجائز ہے۔ جو حکم شرعاً ہو تحریر فرماویں اور ہاتھ کہاں باندھیں؟

الجواب ــــــــــــــــــــ

امام کے پیچھے بے شک سورۂ فاتحہ نہ پڑھنی چاہیے، جیسا کہ حدیث صحیح مسلم میں ہے: ﴿وإذا قرء فأنصتوا﴾(۱) کہ جب امام پڑھے تو چپ رہو اور ہاتھ زیر ناف باندھیں۔ (کما هو ظاهر في الحديث)

اور آمین بالجہر نہ کہیں آہستہ کہیں؛ لأنه دعاء والدعاء بالإخفاء، قال الله تعالیٰ: ﴿اُدْعُوْا رَبَّكُمْ تَضَرُّعاً وَّ خُفْيَةً﴾"(۲) فقط (فتاویٰ دارالعلوم دیوبند: ۲/۲۱۹-۲۲۰) ☆

(۱) الصحيح لمسلم، باب التشهد في الصلوٰة: ۱/۱۷٤، ظفير

(۲) سورة الأعراف، ركوع: ۷، رقم الآية: ٥٥، ظفير

☆ امام کے پیچھے سورۂ فاتحہ پڑھنا کیسا ہے:

سوال: اہل حدیث کا کہنا ہے کہ امام کے پیچھے مقتدی اگر سورۂ فاتحہ نہیں پڑھتا ہے تو اس کی نماز نہیں ہوتی اور بے نمازی کے پیچھے نماز جنازہ نہیں ہوتی ہے، کیا یہ سچ ہے؟ قرآن وحدیث کی روشنی میں وضاحت فرمائیں۔

الجواب ــــــــــــ وبالله التوفيق

حنفیہ کے نزدیک امام کے پیچھے مقتدی کے لئے سورۂ فاتحہ یا کوئی سورہ پڑھنا جائز نہیں ہے، بلکہ اگر نماز جہری ہے اور امام کی قرأت کی آواز آرہی ہے تو غور سے سننا ہے، ورنہ خاموش رہنا ہے۔("(والمؤتم لا يقرأ مطلقًا) ولا الفاتحة في السرية اتفاقًا ... (فإن قرأ كره تحريمًا) ... (بل يستمع) إذا جهر (وينصت) إذا أسر لقول أبي هريرة رضى الله عنه كنا نقرأ خلف الإمام فنزل، وإذا قرئ القرآن فاستمعوا له وأنصتوا". (الدر المختار على هامش رد المحتار، فصل في القراءة: ۲/۲٦٦-۲٦۷) اس مسئلہ پر بہت ہی تفصیلی اور سیر حاصل بحث بار بار ہو چکی ہے، اس پر کتابیں بھی بہت لکھی جا چکی ہیں، ان کتابوں کی طرف رجوع کیا جاسکتا ہے، اب مناظرہ کا وقت نہیں ہے، ضرورت ہے کہ تمام مسلمان مسلکی اور لسانی عصبیت کو ختم کر کے ایک پلیٹ فارم پر جمع ہوں اور محض کلمہ کی بنیاد پر ایک امت اور ایک جماعت بن کر زندگی گذاریں اور باطل طاقتوں کا جم کر مقابلہ کریں۔

اگر بے نمازی جنازہ کی نماز پڑھا دے تب بھی نماز صحیح ہوگی، اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ ہر نیک و بد کے پیچھے نماز پڑھ لو: "صلّوا خلف كل بر وفاجر" (الحديث) (سنن الدارقطني، باب صفة من تجوز الصلاة معه والصلاة عليه: ۱/٥۷) البتہ اگر کوئی پابند شرع متقی شخص نماز پڑھائے تو یہ زیادہ بہتر ہے۔ فقط واللہ تعالیٰ اعلم

محمد جنید عالم ندوی قاسمی۔ (فتاویٰ امارت شرعیہ: ۲/۳۹۹)

==

== سرّی نماز میں فاتحہ خلف الامام:

سوال: قرأت سری میں امام کے پیچھے الحمد کا پڑھنا امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک درست ہے یا نہیں؟ اگر نہیں تو اس کی کیا وجہ ہے؟

الجواب

بحکم ''إذاقرأ فأنصتوا '' (مشکوۃ، باب القراء ۃ فی الصلاۃ: ۷۹۔ ۸۱،ظفیر (الفصل الأول، رقم الحدیث: ۸۲۷)/الصحیح لمسلم،باب التشھد فی الصلاۃ (ح: ٤٠٤)/سنن ابن ماجۃ،باب إذا قرأ الإمام فأنصتوا (ح:٨٤٦)/سنن أبی داؤد،باب التشھد (ح: ٨٧٣)/مسند أبی یعلیٰ الموصلی،حدیث أبی موسیٰ (ح: ٧٣٢٦)/مسند الرویانی،حطان عن أبی موسیٰ (ح: ٥٦٥)/ انیس) مقتدی کو امام کے پیچھے کچھ نہ پڑھنا چاہیے،خواہ نماز جہری ہو، یا سری۔ (والمؤتم لایقرأ مطلقاً)ولاالفاتحۃ فی السریۃ اتفاقاً ومانسب لمحمد (أی من استحباب قراء ۃ الفاتحۃ فی السریۃ احتیاطاً.(ردالمحتار)ضعیف کما بسطہ الکمال.(الدر المختار)حاصلہ أن محمدًا قال فی کتابہ الأثار:لانریٰ القراء ۃ خلف الإمام فی شیء من الصلوات یجھرفیہ أویسرودعوی الاحتیاط ممنوعۃ بل الاحتیاط ترک القراء ۃ لأنہ العمل بأقوی الدلیلین،وقد روی الفساد بالقراء ۃ عن عدۃ من الصحابۃ فأقواھما المنع.(ردالمحتار،فصل فی القراء ۃ :٥٠٨/١،ظفیر)(باب صفۃ الصلاۃ،مطلب:السنۃ تکون سنۃ عین وسنۃ کفایۃ،انیس) فقط (فتاویٰ دارالعلوم دیوبند:۲۲۲/۲)

امام کے پیچھے سورۂ فاتحہ پڑھنے کا حکم:

سوال: کیا امام کے پیچھے سورۂ فاتحہ پڑھنا چاہئے؟ حدیث کا یہ مفہوم کہ سورۂ فاتحہ نہ پڑھے گا تو نماز نہ ہوگی، کیا یہ حدیث صحیح ہے یا منسوخ؟

الجواب وباللہ التوفیق

حنفی مسلک یہ ہے کہ امام کے پیچھے سورۂ فاتحہ نہ پڑھی جائے؛ کیوں کہ اللہ پاک کا قرآن شریف میں صاف صاف حکم یہ ہے: ''جب قرآن پڑھا جائے تو سنو اور چپ رہو''۔(لقولہ تعالٰی: إِذَا قُرِئَ الْقُرْآنُ فَاسْتَمِعُوْا لَهٗ وَأَنْصِتُوْا لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ.(سورۃ أعراف: ٢٠٤)

اور حدیث میں آیا ہے کہ!

''امام کی قرأت ہی مقتدی کی قرأت ہے''۔(عن جابر قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم:''من کان لہ إمام فقراء ۃ الإمام لہ قراء ۃ'') (سنن ابن ماجۃ: ٦١)(باب إذا قرأالإمام فأنصتوا ، رقم الحدیث: ٨٥٠،انیس)

اس حدیث کی رو سے مقتدی کا سکوت عین قرأت ہے اور اس کی نماز بغیر سورۂ فاتحہ کے نہ ہوئی؛ اس لیے بخاری شریف کی حدیث حنفی مسلک کے مخالف نہیں اور وہ حدیث صحیح اور غیر منسوخ ہے۔ فقط واللہ تعالیٰ اعلم

محمد عثمان غنی، ۱۳۵۳/۵/۱۱ھ۔ (فتاویٰ امارت شرعیہ:۱۶۹/۲)

فاتحہ خلف الامام بقصد ثنا پڑھنا کیسا ہے:

سوال: فلو قرأ المقتدی لزم له قرائتان وھو غیر معهود فی الشرع وھٰذا إنما یتم لو قرأ علٰی نیة القراءة أما لو قرأ الفاتحة علٰی نیة الثناء فیخرج عن القرآنیة فلا یلزم قرائتان کما تقول لو قرأ الفاتحة فی صلوٰة الجنازة علٰی نیة الدعاء لابأس به، إلخ. (أرکان أربعه، ص: ۱۰۲)

جواب طلب امر یہ ہے کہ حنفیہ کے نزدیک فاتحہ خلف امام صلوٰۃ خمسہ میں بقصد دعا و ثنا مثل صلوٰۃ جنازہ پڑھنا کس طرح منع ہے، بحر العلوم نے ارکان اربعہ میں جائز لکھا ہے، کیا حنفیہ اس کو مان لیں گے تو وہابیہ سے کس طرح خلاص پائیں؟

الجواب ـــــــــــــــــــــ

قال فی الدر المختار: (والمؤتم لا یقرأ مطلقاً) ولا الفاتحة فی السریة اتفاقاً، ومانسب لمحمد له ضعیف کما بسطه الکمال (فإن قرأ کره تحریماً) وتصح فی الأصح، وفی درر البحار عن مبسوط خواهرزاده أنها تفسد ویکون فاسقاً، وھو مروی عن عدة من الصحابة فالمنع أحوط، إلخ.

وفی الشامی: قوله (مروی عن عدة من الصحابة فالمنع أحوط إلخ) قال فی الخزائن: وفی الکافی: ومنع المؤتم من القراءة مأثور عن ثمانین نفراً من کبار الصحابة منهم المرتضی والعبادلة.

وفیه قبیله: وقد روی الفساد بالقراءة عن عدة من الصحابة فأقواهما المنع. (ردالمحتار)(۱)

پس معلوم ہوا کہ عند الحنفیہ کسی طرح اجازت قرأت فاتحہ کی امام کے پیچھے نہیں ہے کہ اس میں خوف فساد صلوٰۃ ہے، کما روی عن عدة من الصحابة رضی اللّٰه عنهم قاله الکمال. اور جنازہ چونکہ محل دعا ہے تو اس میں بہ نیت ثنا جواز ہو سکتا ہے اور صلوات خمسہ محل قرأت ہیں؛ اس لئے احوط یہ ہے، کسی طرح فاتحہ خلف امام نہ پڑھے۔ فقط

(فتاویٰ دار العلوم دیوبند: ۲/۲۳۰-۲۳۱)

فاتحہ خلف الامام پڑھنے والے کو کافر کہنا غلط ہے:

سوال: ایک مولوی صاحب افغانستان کے یہاں پر آئے ہیں، وہ کہتے ہیں کہ قاری فاتحہ خلف الامام کافر ہے۔

الجواب ـــــــــــــــــــــ

امام ابوحنیفہؒ کے مذہب میں مقتدی کو امام کے پیچھے سورہ فاتحہ وغیرہ نہ پڑھنی چاہئے، ناجائز ہے اور یہی مقتضیٰ آیۃ قرآنیہ: ﴿وَاِذَا قُرِئَ الْقُرْآنُ فَاسْتَمِعُوْا لَهٗ وَاَنْصِتُوْا﴾ (۲) اور احادیث صریحہ صحیحہ: "وإذا قرأ فأنصتوا" (۳)

(۱) ردالمحتار، فصل فی القراءة: ۱/۵۰۸، ظفیر (باب صفة الصلاة، مطلب: السنة تکون سنة عین وسنة کفایة، انیس)

(۲) سورہ الأعراف، رکوع: ۲٤، رقم الآیة: ۲۰٤. ظفیر

(۳) مشکوة، باب القراءة فی الصلوٰة، الفصل الأول، ص: ۷۹-۸۱، رقم الحدیث: ۸۲۷، انیس

وغیرہ کا ہے، بایں ہمہ فاتحہ پڑھنے والے کو کافر و مرتد کہنا سخت جہالت اور گمراہی ہے، کہنے والے کے کفر کا خوف ہے، توبہ کرے، یہ مسئلہ ائمہ دین میں مختلف فیہ ہے۔

امام شافعیؒ وجوب قراءۃ فاتحہ خلف الامام کے قائل ہیں۔(۱) پس تکفیر میں کہنے والے کے کفر کا خوف ہے، اللہ تعالیٰ ایسی جہالت سے محفوظ رکھے۔ فقط (فتاویٰ دار العلوم دیوبند: ۲۵۴/۱)

فاتحہ خلف الامام سے متعلق، حنفی متفق علیہ مسلک کے خلاف حضرت شاہ ولی اللہؒ کا قول معتبر نہیں:

سوال: چونکہ شاہ ولی اللہ صاحب کا قول اسرار شریعت میں ہے کہ امام کے پیچھے سورۂ فاتحہ کا پڑھنا نہ پڑھنے سے بہتر ہے، (۲) اور شاہ صاحب علماء حنفیہ میں سے ہیں، ایسی صورت میں اگر کوئی حنفی امام کے پیچھے سورۂ فاتحہ پڑھے تو کیسا ہے؟

الجواب

حنفی کو امام کے پیچھے سورۂ فاتحہ وغیرہ کچھ نہ پڑھنی چاہئے، (۳) اور شاہ ولی اللہؒ جیسا محقق اگر کسی مسئلہ میں اختلاف کریں تو اوروں کے لئے یہ فعل درست نہیں ہے، ان کو اپنے امام متبوع کی تقلید کرنی چاہئے، خصوصاً جبکہ دلائل سے بھی مذہب امام قوی ہو۔ (۴) فقط (فتاویٰ دار العلوم دیوبند: ۲۲۸/۲)

---

(۱) فقراءة الفاتحة لاتتعين ركناً عندنا، إلخ، خلافاً للشافعي رحمة الله عليه في الفاتحة، إلخ، وللشافعي قوله عليه السلام: لاصلوٰة إلا بفاتحة الكتاب. (الهداية)

(قوله خلافاً للشافعي، إلخ) حتىٰ لو ترك حرفاً منها في ركعة لاتجوز صلاته. (حاشية الهداية، باب صفة الصلاة: ۹۷/۱، ظفير)

(۲) وإن كان مأموماً وجب عليه الإنصات والإستماع فإن جهر الإمام لم يقرأ إلا عند إسكاته وإن خافت فله الخيرة فإن قرأ فليقرأ الفاتحة قراءة لا يشوش على الإمام وهذا أولىٰ الأقوال عندي، وبه يجمع بين أحاديث الباب والسر فيه ما نص عليه من أن القراءة مع الإمام تشوش عليه وتفوت التدبر وتخالف تعظيم القرآن ولم يعزم عليه أن يقرؤا سراً لأن العامة متى أرادوا أن يصححوا الحروف بأجمعهم كانت له لجنة مشوشة فسجل في النهي عن التشويش ولم يعزم عليهم ما يؤدي إلى المنهي وإن أبقى خيره لمن استطع وذلك غاية الرحمة في الأمة. (حجة الله البالغة، أذكار الصلاة وهيتها المندوب إليها: ۱٤/۲، دار الجيل بيروت. انيس)

(۳) ولايقرأ المؤتم خلف الإمام إلخ لنا قوله عليه السلام: "من كان له إمام فقراءة الإمام له قراءة" وعليه إجماع الصحابة وهو ركن مشترك بينهما لكن حظ المقتدي الإنصات والاستماع، قال عليه السلام: "وإذا قرأ فأنصتوا" ويستحسن علىٰ سبيل الاحتياط فيما يروىٰ عند محمد رحمة الله عليه ويكره عندهما لمافيه من الوعيد. (الهداية، فصل في القراءة: ۱۰۹/۱، ظفير)

(۴) لما قالوا: رسم المفتي أن ما اتفق عليه أصحابنا في الروايات الظاهرة يفتى به قطعاً. (الدر المختار علىٰ هامش رد المحتار، مقدمة: ٦٣/۱ ـ ٦٤، ظفير)

قرأت خلف الامام کی احادیث اوران کا درجہ اورعوام کا قرأت پر آیت سے استدلال کا ثبوت:

سوال: قراءۃ خلف الامام کی جو احادیث صحاح میں اکثر وارد ہیں یہ احادیث منسوخ ہیں یا نہیں، یہ بھی مفصل تحریر فرماویں کہ اصول حدیث میں کس مرتبہ کی حدیث صحیح حدیث کی ناسخ بن سکتی ہے اور سند اس امر کی کہ آیت ﴿وَاِذَا قُرِئَ الْقُرْآنُ فَاسْتَمِعُوْا لَهٗ وَاَنْصِتُوْا لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ﴾ (۱) نماز ہی میں نازل ہوئی ہے مع احادیث معتبرہ کے اوراقوال صحابہؓ کرام کے تحریر فرمائیے کہ اطمینان ہوجائے، غیر مقلدین سوائے صحیحین کی احادیث کے دوسری صحاح ومسندات کتب حدیث کو نہیں مانتے ہر جگہ صحیحین کی حدیث طلب کرتے ہیں، پس یہ بھی تشریح فرماویں کہ سوائے صحیحین کے دوسری کتب حدیث میں بھی صحیح حدیثیں موجود ہیں کہ جن کو بخاری ومسلم نے تخریج نہیں کیا اور منسوخیت حدیث آمین بالجہر کی نسبت بھی یہی خیال ہے، کن احادیث سے حدیث آمین بالجہر منسوخ ہے۔

اندکے پیش تو گفتم غمِ دل ترسیدم کہ دل آزردہ شوی ورنہ سخن بسیار است

الجواب

بسم اللّٰہ الرحمن الرحیم! قرأت خلف الامام میں اختلاف ائمہ ہے، امام اعظم رحمہ اللہ اوران کے اتباع وموافقین عدم وجوب وعدم جواز قرأت خلف الامام کے قائل ہیں۔

دلیل امام اعظم رحمہ اللہ کی آیۃ کریمہ: ﴿وَاِذَا قُرِئَ الْقُرْآنُ فَاسْتَمِعُوْا لَهٗ وَاَنْصِتُوْا﴾ (۲)

اورحدیث صحیح مسلم: "وإذا قرأ فأ نصتوا". (۳)

اورحدیث "من كان له إمام". (الحدیث) (۴)

اورشامی میں خزائن سے منقول ہے:

"وفي الكافي: ومنع المؤتم من القراءة مأثورعن ثمانين نفراً من كبار الصحابة منهم المرتضى والعبادلة وقد دون أهل الحديث أساميهم". (۵)

(۱-۲) سورة الأعراف:الركوع:٢٤،رقم الآية:٢٠٤.

(۳) مشكوة ،باب القراءة في الصلوٰة،الفصل الأول:٧٩،رقم الحديث:٨٢٧،وفصل ثانی ،ص:٨١ ، ظفير)

(۴) آثار السنن،باب في ترك القراءة خلف الإمام: ٨٧/١،رقم الحديث: ٣٥٩،وفتح القدير،فصل في القراءة :٢٩٥/١، ظفير)

(۵) رد المحتار،باب صفة الصلوٰة،فصل في القراءة : ٥٠٨/١ ،ظفير(مطلب:السنة تكون سنة عين وسنة كفاية،انيس)

اور در بارۂ نزول آیت قرآنیہ: ﴿وَاِذَا قُرِئَ الْقُرْآنُ﴾ (الآیة)

فتح القدیر میں منقول ہے:

"وأخرج أبو الشيخ من طريق سعيد بن جبير عن ابن عباس رضى الله عنهما هذه الأية نزلت فى صلاة الجمعة وفى العيدين. قال محى السنة: والأولىٰ أنها فى القراءة فى الصلوٰة لأن الأية مكية والجمعة وجبت بالمدينة وهٰذا قول الحسن والزهرى والنخعى وأخرج البيهقى عن الإمام أحمد قال: أجمع الناس علىٰ أن هذه الأية فى الصلوٰة ... وأخرج ابن مردويه في تفسيره، إلخ، عن معاوية بن قرة قال: سألت بعض أشياخنا من أصحاب رسول الله صلى الله عليه وسلم وأحسبه قال عبدالله بن مغفل رضى الله عنه: كل من سمع القرآن وجب عليه الاستماع والإنصات، قال: إنما نزلت هذه... الأية فى القراءة خلف الإمام. (كذا فى فتح القدير)(۱)

اور آمین بالجہر یا سرّ دونوں حدیث سے ثابت ہیں۔

امام ابوحنیفہؒ نے یہ آیۃ: ﴿اُدْعُوا رَبَّكُمْ تَضَرُّعاً وَّخُفْيَةً﴾ (۲) سے حدیث اخفا کو ترجیح دی ہے، جیسا کہ شرح منیہ میں ہے:

ويخفونها أى ويخفى الإمام والمقتدون اٰمين لقول ابن مسعود رضى الله عنه: أربع يخفيهن الإمام التعوذ والتسمية واٰمين و ربنا لك الحمد وهٰذه الأربعة رواها ابن أبى شيبة عن إبراهيم النخعى وقد روىٰ أحمد وأبويعلىٰ والطبرانى والدارقطنى والحاكم فى المستدرك من حديث شعبة عن سلمة بن كهيل عن حجر بن العنبس عن علقمة بن وائل عن أبيه أنه صلى مع رسول الله صلى الله عليه وسلم فلما بلغ "غير المغضوب عليهم ولا الضآلين" قال اٰمين وأخفىٰ بها صوته وقال الشافعى وأحمد رحمهما الله يجهر الإمام والمأموم لما روى ابن ماجة كان عليه الصلوة والسلام وإذا تلا "غير المغضوب عليهم ولا الضآلين" قال اٰمين حتىٰ يسمع من فى الصف الأول فيرتج المسجد، قلنا: تعارض روايتا الجهر والإخفاء فى فعله فيرجح الإخفاء بإشارة قوله فإن الإمام يقولها وبأنه الأصل فى الدعاء واٰمين دعاء فإن معناه استجب، انتهىٰ. (۳)

(فتاویٰ دار العلوم دیوبند: ۲/۲۵۰-۲۵۲) ☆

(۱) فتح القدير، فصل فى القراءة: ۱/۲۹۸، ظفير

(۲) سورة الأعراف، الركوع: ۷، رقم الآية: ۵۵، ظفير

(۳) غنية المتملى المعروف بالكبيرى، ص: ۳۰۲ (بيان صفة الصلاة، انيس)

☆ صحیحین کے علاوہ دوسری کتب احادیث میں بھی صحیح حدیثیں ہیں۔ صحیحین میں ہی محصور سمجھنا غلط ہے، دوسری صحاح یا مستندات کو نہ ماننا کھلی ہوئی جہالت ہے۔ ظفیر

==

مشکوٰۃ و بخاری کی حدیث میں تطبیق کیا ہے:

سوال: سورۂ فاتحہ نہ پڑھنے کے بارہ میں مشکوٰۃ میں خداج آیا ہے اور بخاری میں ”لاصلاۃ لمن لم یقرأ بفاتحۃ الکتاب“ اس کا مطلب واضح فرمائیں؟

الجواب

یہ حکم امام ومنفرد کیلئے ہے، مقتدی کو قرأت کی ممانعت دوسری احادیث صحیحہ میں موجود ہے۔

” وإذا قرأ فأنصتوا“. (الحدیث)(۱)”من کان له إمام فقراءۃ الإمام له قراءۃ“. (الحدیث)(۲) وقال اللّٰه تعالیٰ: ﴿وَاِذَا قُرِئَ الْقُرْآنُ فَاسْتَمِعُوْا لَهٗ وَاَنْصِتُوْا﴾ (الآیة)(۳) فقط

(فتاویٰ دارالعلوم دیوبند: ۲/ ۲۶۷-۲۶۸)

☆ فاتحہ خلف الامام والی حدیث کا جواب:

سوال: عندالاحناف قراءۃ فاتحہ خلف الامام ناجائز ہے، مگر غیر مقلدین دو حدیثیں پیش کرتے ہیں: ایک عبادہ رضی اللہ عنہ کی حدیث اور ایک ابوہریرہؓ کی جس میں یہ مذکور ہے: قسمت الصلاۃ بینی وبین عبدی. ان دونوں حدیثوں کا جواب مفصل تحریر فرمائیں؟

الجواب

حدیث عبادہؓ کا جواب مشکوٰۃ شریف کے باب قراءۃ فی الصلاۃ میں حدیث مذکور کے بعد موجود ہے، وہ حدیث یہ ہے:

”وعن أبی هریرۃ رضی اللّٰه عنه قال قال رسول اللّٰه صلی اللّٰه علیه وسلم: ”إنما جعل الإمام لیؤتم به فإذا کبر فکبروا وإذا قرأ فأنصتوا“. (مشکوٰۃ، باب القراءۃ فی الصلاۃ، الفصل الثانی، ص: ۸۱، رقم الحدیث: ۸۵۷)

اس حدیث میں مطلقاً وعموماً یہ حکم فرمایا کہ جب امام پڑھے تو تم چپ رہو۔ پس معلوم ہوا کہ پہلے آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے صرف سورۂ فاتحہ کی اجازت دی تھی پھر جہریہ نمازوں میں اس کی ممانعت فرمائی؛ جیسا کہ حدیث ابوہریرہ رضی اللہ عنہ میں ”فانتهی الناس عن القراءۃ مع رسول اللّٰه صلی اللّٰه علیه وسلم فیما جهر فیه بالقرائة من الصلوات حین سمعوا ذٰلک من رسول اللّٰه صلی اللّٰه علیه وسلم“. (مشکوۃ، باب القراءۃ فی الصلوٰۃ، الفصل الثانی، ص: ۸۱، رقم الحدیث: ۸۵۵) سے ثابت ہے، پھر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ”وإذا قرأ فأنصتوا“ کا حکم فرما کر سب نمازوں میں مطلقاً قراءۃ سورۂ فاتحہ وغیرہ سے ممانعت فرما دی اور انصات کا حکم فرمادیا جیسا کہ آیت کریمہ: ﴿وَاِذَا قُرِئَ الْقُرْآنُ فَاسْتَمِعُوْا لَهٗ وَاَنْصِتُوْا﴾ (الآیة)(سورۃ الأعراف، الرکوع: ۲۴، رقم الآیة: ۲۰۴، ظفیر) سے بھی ظاہر ہے اور یہی جواب جملہ ”إقرأبها فی نفسک“(مشکوۃ، باب القراءۃ فی الصلوٰۃ، فصل أول، ص: ۷۸، ظفیر)(رقم الحدیث: ۸۲۳، انیس) سے ہے جو کہ حدیث ابوہریرہؓ ” قسمت الصلوٰۃ بینی وبین عبدی“ میں واقع ہے اور ” اقرأبها فی نفسک“ سے مراد نفس میں تصور کرنا بھی ہوسکتا ہے۔ فقط (فتاویٰ دارالعلوم دیوبند: ۲/ ۲۴۶-۲۴۷)

(۱) مشکوٰۃ، باب القراءۃ فی الصلوٰۃ: ۷۹-۸۱، ظفیر (الفصل الأول، رقم الحدیث: ۸۲۷، انیس)
(۲) آثار السنن، باب فی ترک القراءۃ خلف الإمام، ص: ۸۷، رقم الحدیث: ۳۵۹، انیس
(۳) سورۃ الأعراف، الرکوع: ۲۴، رقم الآیة: ۲۰۴، ظفیر

فاتحہ خلف الامام سے متعلق چند مباحث:

(مکتوب) بنام منصب علی

از بندہ رشید احمد عفی عنہ السلام علیکم

آدمیاں گم شدند، ملک خدا [را] خر گرفت۔ علماء مرگئے جہلاء [کی] نفسانیوں نے فتنہ اندازی پر کمر باندھی، اگر صاحب (کذا) اہل دیانت ہو، یہ ہی بہت ہے کہ کروڑوں پدمنوں علماء تمام ہندوستان میں حنفی المذہب ہیں، کیا سب کے سب بے نماز وگمراہ ہیں، اب غدر [۱۸۵۷ء] کے بعد دیندار عالم پیدا ہوئے، افسوس! جس بات کو قدیم صدہا سال سے لوگ کرتے آئے ہیں اور سب علماء حقانی کرکے بتلاتے رہے، وہ تو ایک امر لغو ہوجاوے اور جواَب کے چند نوخیز سمجھ گئے، وہ عین حق اور دین ہووے، پس اب سنو کہ!

آیت: ﴿اِذَا قُرِئَ الْقُرآن فاستَمِعُوا له وَاَنْصِتُوْا﴾ إلخ. (۱)

خطبہ کے وقت کلام کرنے میں اور ذکر کرنے میں اور نماز میں خلف امام قرآن پڑھنے اور کلام کرنے میں نازل ہوئی ہے، (۲) اور مطلقاً خلف امام کچھ پڑھنے کو منع فرمایا ہے، چنانچہ صحیح مسلم میں خود ابوہریرہؓ سے اور دوسرے صحابی سے حدیث ہے کہ ارشاد فخر عالم علیہ السلام ہوا ہے: ''إذا قرأ فأنصتوا''. (۳) (یعنی جس وقت امام پڑھا کرے، تم چپ رہا کرو) پس فاتحہ بھی قرأت ہے، آیت اور حدیث اپنے عموم پر ہے اور مطلقاً قرأت خلف امام کو منع کرتی ہے اور دیگر احادیث بھی ہیں، جن سے منع ہونا قرأت خلف امام کا ظاہر ہے، البتہ امام شافعی صاحبؒ اور دیگر علماء کا یہ مذہب ہے کہ امام کے پیچھے قرأت پڑھنا چاہئے؛ مگر انہوں نے یہ طرز نکالا ہے کہ امام فاتحہ پڑھ کر جہریہ میں چپ ہوجاتا ہے؛ تاکہ

---

(۱) ﴿وَاِذَا قُرِئَ الْقُرْاٰنُ ، فَاسْتَمِعُوْا لَهٗ وَ اَنْصِتُوْا لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ﴾ (سورۃ الأعراف: ۲۰۴)

ترجمہ: اور جب قرآن پڑھا جائے تو اس کی طرف کان لگائے رہو اور چپ رہو؛ تاکہ تم پر رحم ہو۔ (ترجمہ شیخ الہند)

(۲) عن إبراهيم بن أبي الحسن أنه سمع مجاهداً قال في هذه الآية﴿: وَاِذَا قُرِئَ الْقُرْاٰنُ ، فَاسْتَمِعُوْا لَهٗ وَ اَنْصِتُوْا لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ﴾ قال: في الصلاة والخطبة يوم الجمعة. (مصنف ابن أبي شيبة، في قوله تعالیٰ: وَاِذَا قُرِئَ الْقُرْاٰنُ ، فَاسْتَمِعُوْا لَهٗ وَ اَنْصِتُوْا لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ، رقم الحديث: ۲/۲۲۵:۸۳۸۲، مكتبة الرشد الرياض)

عن عطاء قال: بلغني أن المسلمين كانوا يتكلمون في الصلاة كما يتكلم اليهود والنصاریٰ حتى نزلت: وَاِذَا قُرِئَ الْقُرْاٰنُ ، فَاسْتَمِعُوْا لَهٗ وَ اَنْصِتُوْا. (مصنف عبدالرزاق، باب الرجل يدعو ويسمي في دعائه، رقم الحديث: ۴۰۴۴)

عن إبراهيم قال: كان النبي صلى الله عليه وسلم يقرأ ورجل يقرأ فأنزل الله تعالیٰ: وَاِذَا قُرِئَ الْقُرْاٰنُ ، فَاسْتَمِعُوْا لَهٗ وَ اَنْصِتُوْا. (مصنف ابن أبي شيبة، في قوله تعالیٰ: وَاِذَا قُرِئَ الْقُرْاٰنُ ، فَاسْتَمِعُوْا لَهٗ وَ اَنْصِتُوْا لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ، رقم الحديث: ۲/۲۲۵:۸۳۸۱، مكتبة الرشد الرياض). انيس)

(۳) عن أبي هريرة رضي الله عنه، مسند الإمام أحمد: ۲/۳۷۶ ط: دارالفكر، بيروت. ۱۹۷۸ء [مسند ابی ہریرۃ رضی اللہ عنہ، ت: احمد محمد شاکر، رقم الحدیث: ۸۸۷۵، ص: ۳۷، ج: ۹] [دار الحدیث، القاہرہ] (نور)

مقتدی فاتحہ پڑھ لیویں اور مذاہب ائمہ ایسے مسائل میں کہ مختلف صحابہ میں ہوں، سب حق ہوے ہیں، البتہ جو شخص مقلد کسی ایک شخص کا ہے، اس کو اس پر عمل کرنا چاہیے اور مباحثہ اور ترجیح علماء کا کام ہے نہ [کہ] عوام کا، سوان کے شبہات اور دلائل کے جواب ہو سکتے ہیں کہ بندہ کو ان کا لکھنا ضروری نہیں؛ کیوں کہ آپ بطور تحقیق استفسار کرتے ہیں، لہٰذا جو امر محقق بندہ کے نزدیک ہے، جواب دیتا ہوں کہ!

جو حنفی فاتحہ پڑھتا ہے خلف [امام] کسی وجہ تحقیق سے کہ اس کو بسبب اپنے علم یا تقلید کے، اس خاص مسئلہ کی حقیقت اور ترجیح واضح ہوگئی، اس کی نماز ہو جاتی ہے، یہ کہنا کہ اس کی نماز نہیں ہوئی، نامناسب امر ہے اور جو بوجہ تعصب کے اس کام کو کرتا ہے گنہگار ہے اور ایسے شخص کی اقتدا درست ہے، مگر ایسے متعصب کو امام بنانا مکروہ ہے اور جو لوگ فاتحہ خلف امام نہیں پڑھتے، ان کی نماز بے شک درست اور تمام ہے، کچھ اس میں حرج نہیں۔ تم لوگ اس قضیہ کو رفع کرو اور ایسے فتنہ اندازوں سے الگ رہو، آئندہ مختار ہو اور آپ ثبوت کتب معتبرہ سے جو طلب کرتے ہو تو خود حدیث صحیح مسلم کی لکھ چکا ہوں اور اگر یہ مراد ہے کہ تمام تحقیق لکھی جاوے، تو صاحب! رسائل لکھے گئے اور نفسانیت کے مقام میں کسی نے نہیں مانا۔

اب مختصر یہ ہے کہ مولوی محمد [حسین] بٹالوی کہ رأس و رئیس اس قوم کے ہیں، اب حنفیہ کے ثبوت و حقیقت کو لکھ رہے ہیں، اگر دل چاہے تو ان کی اشاعت السنہ جلد نہم (۱) کو دیکھ لو۔ فقط

بعد کتاب اللہ کے صحیح بخاری ہے **عند الأكثر**، پھر صحیح مسلم اور علمائے مغرب نے صحیح مسلم کو بخاری سے اول کہا [ہے]، (۲) اور دیگر کتب صحاح بھی معتبر ہیں اور جب قرائن اور دلائل لاحق ہو جاتے ہیں تو حدیث دیگر کتب کی صحیحین سے بھی راجح ہو جاتی ہے، چناں چہ کتب اصول حدیث میں لکھا ہے... سو یہ بحث اول لوگوں کی لغو ہے اور بخاری میں خلف امام فاتحہ پڑھنا ہرگز کسی روایت میں ثابت نہیں، البتہ یہ حدیث ہے جس کا یہ مطلب ہے کہ کوئی نماز بدون فاتحہ کے نہیں ہوتی، مگر نماز امام اور مقتدی کی ایک نماز ہے، امام کی فاتحہ مقتدی ہی کی فاتحہ ہے۔

(مجموعہ کلاں، ص: ۱۹۸-۲۰۰) (باقیات فتاویٰ رشیدیہ: ۱۶۹-۱۷۰)

---

(۱) اشاعت السنۃ، ماہ نامہ رسالہ تھا، جس کے بانی و مدیر مولانا محمد حسین بٹالوی تھے۔ یہ رسالہ اہل حدیث مسلک کا بڑا مؤید و ترجمان بلکہ غیر مقلدیت کی تشہیر و تلقین کا ایک بڑا ذریعہ تھا۔ ہمارے ذخیرے میں اس کی چار سال کی متفرق فائلیں موجود ہیں۔ (نور)

(۲) أول مصنف في الصحيح المجرد صحيح البخاري، ثم مسلم وهما أصح الكتب بعد القرآن والبخاري أصحهما وأكثرهما فوائد وقيل مسلم أصح والصواب الأول واختص مسلم بجمع طرق الحديث في مكان ولم يستوعبا الصحيح ولا التزماه. (التقريب والتيسير للنووي، النوع الأول الصحيح: ۱/۲٦، دار الكتاب العربي بيروت)

وبعض المغاربة رجحوا صحيح مسلم على صحيح البخاري والجمهور يقولون إن هذا فيما يرجع إلى حسن البيان وجودة الوضع والترتيب ورعاية دقائق الإشارات ومحاسن النكات في الأسانيد. (مقدمة في أصول الحديث لعبد الحق المحدث الدهلوي، ت: سلمان الحسيني الندوي: ۱/۸۵-۸٦، دار البشائر الإسلامية بيروت. انيس)

نیل المرام بالتزام السُّکوتِ عند قراء ۃ الإمام:

سوال: ہمارے قصبہ میں ایک صاحب اہل حدیث ہیں، ان کا دعویٰ ہے کہ امام کے پیچھے جو لوگ سورۂ فاتحہ نہیں پڑھتے ان کی نماز بالکل نہیں ہوتی وہ اس پر قسمیں بھی اٹھاتا ہے اور کہتا ہے کہ دنیا میں کوئی شخص ایسی کوئی حدیث نہیں دکھا سکتا جس میں امام کے ساتھ سورۂ فاتحہ پڑھنے سے منع کیا گیا ہو۔

اس شخص نے شب و روز یہی شور بپا کر رکھا ہے اور ہر وقت سیدھے سادے نمازیوں کو بہکانے کی کوشش میں لگا رہتا ہے، بے نمازیوں کو نمازی بنانے کی اس کو قطعاً کوئی فکر نہیں، بس ہر وقت نمازیوں کو بہکانے اور ان کی نمازوں کو باطل قرار دینے کا مشغلہ ہے، کئی نمازی اس کے فتنے سے متاثر نظر آرہے ہیں، جناب سے گزارش ہے کہ اس مسئلہ کو تفصیل سے تحریر فرما کر ہم لوگوں کی رہنمائی فرمائیں؟ بینوا توجروا۔

الجواب ـــــــــــــــــ باسم ملهم الصّواب

فاتحہ خلف الامام کے مسئلہ میں حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے لے کر ہر زمانہ میں اختلاف چلا آیا ہے، اس قسم کے اور بھی سینکڑوں اجتہادی مسائل ہیں، ایسے مسائل جو قرآن وحدیث سے مستنبط ہونے کی وجہ سے اہل اجتہاد صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم اور ائمہ دین رحمہم اللہ تعالیٰ میں مختلف فیہ ہیں، ان میں خود مجتہدین کا ہمیشہ یہ عمل رہا ہے کہ قوت دلیل کی بنا پر جو جانب راجح دکھائی دی، اس کو اختیار فرمالیا گیا، مگر دوسروں پر کسی قسم کے اعتراض اور طعن وتشنیع سے زبان درازی ہرگز روا نہیں رکھی اور نہ ہی اپنا اجتہاد کسی پر زبردستی مسلط کرنے کی کوئی کوشش فرمائی؛ بلکہ صرف اظہار رائے پر اکتفا فرماتے رہے، کبھی بلا تحریر دلیل اور اور کبھی بہ تفصیل دلائل، اس سے ہمیشہ بے نیاز رہے کہ کوئی ان کی رائے کو قبول بھی کرتا ہے یا نہیں؟ انہوں نے اپنی رائے سے اختلاف کرنے والوں کو نہ کبھی گمراہ قرار دیا اور نہ ہی ان کی عبادات کے بطلان کا فتویٰ دے کر امت میں تخریب اور منافرت کی تخم ریزی کی۔

ان حضرات کا یہ عمل قرآن کریم کی ہدایت اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم پر مبنی ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿وأنزلنا إليک الذکر لتبيّن للنّاس مانزل إليهم ولعلّهم يتفکرون﴾(۱)

اس میں اہل اجتہاد کو مسائل غامضہ میں دعوت فکر دی گئی ہے اس طرح ہر مجتہد کے فکر کی رسائی ہی اس کے لیے حق اور واجب العمل قرار پاتی ہے، مجتہد جس طرح مسائل غیر منصوصہ میں غور وفکر کر کے منصوص پر قیاس کے ذریعہ ان کا حکم معلوم کرتا ہے، اسی طرح وہ مسائل منصوصہ جن کے ادلہ متعارض ہیں، ان میں تطبیق وترجیح اور تساقط کے اصولوں کو زیر

(۱) سورة النحل: ٤٤، انیس

غور لا کر فیصلہ کرتا ہے۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں ایسی کئی مثالیں پائی جاتی ہیں کہ کسی مسئلہ میں حضرات صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم میں اختلاف رائے ہوا اور ہر ایک نے اپنے اجتہاد پر عمل کیا، نہ اس وقت ان میں سے کسی نے دوسرے پر اعتراض کیا اور نہ ہی بعد میں حضور اکرم صلی الہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضری پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی کے فعل پر نکیر فرمائی۔

غرضیکہ اہل اجتہاد صحابہ رضی اللہ عنہم اور ائمہ مجتہدین رحمہم اللہ تعالیٰ میں سے ہر شخص اپنے اجتہاد پر عمل کرتا تھا، مگر دوسرے کے اجتہاد پر کوئی اعتراض نہ کرتا تھا، ان مجتہدین کے متبعین کا بھی یہی معمول رہا کہ وہ آپس میں دست بہ گریبان ہونے کی بجائے اپنے اپنے مقتداؤں کے اجتہاد کے مطابق عمل کرتے رہے، اس میں کوئی کلام نہیں کہ اکابر علماء نے مسائل اجتہادیہ کی تنقیح وتنقید اور ان کے مناشی ومبانی کی تنقیر وتفتیش کے لیے سیر حاصل بحثیں تحریر فرمائیں، اپنے دلائل کی تفصیل اور خصم کے دلائل کے جوابات کے لیے فاضلانہ مضامین لکھے، مگر مخالف کی تفسیق وتضلیل اور تحقیر وتذلیل اور عبادات کو ضائع وباطل ٹھہرانے کی حماقت کسی نے نہیں کی اور نہ ہی ان خالص علمی مباحث کو جو عوام کی کوفہم سے بہت بلند ہیں، ہر کس وناکس کے سامنے لاکر عوام میں انتشار وفتنہ پیدا کرنے کا کوئی جواز نکالا۔

راقم الحروف نے صحیح بخاری کی تدریس میں اپنی عمر کا بہت طویل حصہ صرف کیا ہے، اس زمانے میں قرآن وحدیث کے بلند پایہ مضامین، حقائق ودقائق اور نکات ولطائف کے مطالعہ کا شوق اور طلباء حدیث کی استعداد وضرورت کے مطابق ان کے سامنے بیان کرنے کا معمول رہا، مگر طلبہ کے اصرار کے باوجود مسائل اجتہادیہ پر زیادہ بحث وتمحیص سے ہمیشہ پہلوتہی کرتا رہا۔

اولاً: اس لیے کہ جن مسائل میں حضرات صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم میں اختلاف رائے ہے، ان میں زیادہ بحث ومباحثہ ویسے ہی بے ضرورت اور دینی تقاضوں کے خلاف ہے۔

ثانیاً: ان مسائل پر کافی سے زیادہ لکھا جا چکا ہے۔

ثالثاً: اس دور میں دین میں نظریاتی اور عملی فتنے اس قدر کثرت اور شدت کے ساتھ ابھر رہے ہیں کہ ان کی موجودگی میں مجتہد فیہ مسائل میں جزئی اختلافات میں پڑنے کا کوئی جواز نہیں۔ ایک طرف مرزائیت، نیچریت، اباحیت، انکار حدیث اور دیندار انجمن جیسے اعتقادی وارتدادی فتنوں کی گھٹائیں چھا رہی ہیں اور دوسری جانب بداعمالی، علانیۂ فسق وفجور اور بے حیائی کا سیلاب برق رفتاری سے بڑھ رہا ہے اور عوام سے گزر کر علماء وصلحاء کے گھرانوں میں بھی داخل ہو چکا ہے، جس شخص کے قلب میں ذرہ برابر بھی احساس اور دین کا درد ہو، اسلام اور مسلمانوں کی خیر خواہی کا شمہ بھر بھی خیال ہو، وہ ان حالات میں جزئی اختلافات کو ہوا دے کر الحاد اور بے دینی کو مزید پھیلنے کا موقع دینا ہرگز گوارا نہیں

کر سکتا، مگر اس بارے میں فرقہ اہل حدیث کی اکثریت کا کردار جماعت اہل حدیث کی پیشانی پر کلنک ہے، ان کے اس رسوا کن اور اسلام دشمن کردار کی بدولت ان میں سے اہل فہم حضرات کی گردنیں جھکی ہوئی ہیں؛ مگر وہ اپنی اس بے لگام قوم پر قابو پانے سے عاجز ہیں۔

ان کی عقل پر تعجب ہے کہ ایک طرف تو اتنی وسعت نظر کہ جواز اجتہاد کے لیے کوئی شرط ہی نہیں، ہر شخص مادر زاد مجتہد ہے اور دوسری طرف اتنی تنگ نظری کہ اپنے اجتہاد کے سوا، باقی سب کو گمراہ قرار دیا جاتا ہے۔

غیر مقلدین کی خصوصیات:

(۱)　اہل حدیث حضرات مسائل اجتہادیہ میں اپنے اجتہادیہ کو قطعی صحیح اور دوسروں کے اجتہاد کو قطعی غلط سمجھتے ہیں اور اس میں ان کو اس حد تک غلو ہے کہ گویا اپنی رائے کو معاذ اللہ وحی الٰہی گردانتے ہیں، بخلاف دوسرے مجتہدین کے کہ وہ اپنی رائے کو وحی کی طرح قطعی نہیں سمجھتے؛ بلکہ محض غلبہ ظن کا درجہ دیتے ہیں، جس میں احتمال خطا بھی موجود ہے، چنانچہ وضوح خطا کے بعد وہ اپنی رائے سے رجوع فرمالیتے ہیں، مگر دنیا میں کوئی اہل حدیث ایسا نظر نہیں آتا، جس کو اپنے اجتہاد میں کبھی کوئی ادنیٰ سا شبہ بھی ہوا ہو، غلطی کا اعتراف اور اپنے رائے سے رجوع تو بڑی بات ہے۔

(۲)　مجتہد فیہ مسائل میں حضرات صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم اور تابعین و تبع تابعین ائمہ دین رحمہم اللہ تعالیٰ میں اختلاف رائے پایا جاتا ہے اور یہ اختلاف لازم بھی ہے؛ اس لیے کہ مسائل اجتہادیہ کے استنباط میں اور تعارض ادلہ کے وقت تطبیق و ترجیح کے کلیات کے استعمال میں انسان کی عقل کو دخل ہے، ایک مجتہد کسی جزئیہ کو ایک کلیہ کے تحت لاکر اس کے جواز کا قول کرتا ہے اور دوسرا مجتہد اسی جزئیہ کو کسی دوسرے کلیہ سے زیادہ منطبق سمجھ کر اسے ناجائز قرار دیتا ہے۔ کلیات کے ساتھ جزئیات کے انطباق میں اختلاف رائے سے بچنا محال ہے، چنانچہ اسی بنا پر ہم شب و روز ڈاکٹروں، انجینئروں، وکیلوں اور ججوں میں اختلافات کا مشاہدہ کر رہے ہیں، مگر اہل حدیث حضرات کی رائے میں ہرگز اختلاف نہیں پایا جاتا، اس سے ثابت ہوا کہ ان کا عمل بالحدیث کا ڈھنڈورا اور براہ راست اجتہاد کا دعویٰ غلط ہے۔ درحقیقت یہ ایک مستقل فرقہ ہے، جس کا ہر فرد اپنے اسلاف کی اندھی تقلید میں مبتلا ہے، اس کے ساتھ طرفہ یہ کہ ائمہ اربعہ کی تقلید کو حرام اور شرک بتاتا ہے۔

(۳)　ائمہ مجتہدین کا اس پر اتفاق ہے کہ اختلافی مسائل میں احتیاط کے پہلو پر عمل کرنا چاہیے، چنانچہ جس شخص نے خود اپنا حج نہ کیا ہو، وہ مذہب حنفی میں دوسرے کی طرف سے حج بدل کر سکتا ہے، مگر چونکہ دوسرے بعض مذاہب میں یہ جائز نہیں، اس لیے صرف اس دوسرے مذہب کی رعایت کی خاطر فقہ حنفی میں ایسے شخص کا حج بدل کے لیے جانا مکروہ قرار دیا گیا ہے، اسی طرح اگر طواف کرنے والا بیت اللہ سے اتنا قریب چلے کہ اس کا بایاں ہاتھ شاذ رواں (بیت اللہ

کی بنیاد) پر سے گزر رہا ہو تو مذہب حنفی میں طواف صحیح ہو جائے گا، مگر محض دوسرے مذہب کی مراعات کے پیش نظر اس کو مکروہ فرماتے ہیں، کتب فقہ میں اس کی بے شمار مثالیں ملتی ہیں، مگر اہل حدیث حضرات کا طریق کار نرالا ہے، ان کے ہاں ایسے مسائل میں دوسرے مذاہب کے خلاف کرنا زیادہ اجر کا باعث ہے، چنانچہ ذی الحجہ کی تیرہویں تاریخ میں قربانی کا جواز مختلف فیہ ہے؛ اس لیے عبادت میں احتیاط کا تقاضا تو یہ تھا کہ اس تاریخ میں قربانی نہ کی جائے، جو حضرات اس کے جواز کے قائل ہیں، ان کے ہاں بھی افضل تاریخ دسویں پھر گیارہویں اور پھر بارہویں اور پھر تیرہویں ہے؛ مگر اہل حدیث صرف دوسرے مذاہب کی مخالفت کے لیے تیرہویں تاریخ میں قربانی کرنے کو افضل سمجھتے ہیں اور اسی پر عمل کرتے ہیں، اسی طرح اونٹ کی قربانی میں دس آدمی محض دوسرے مذاہب کی مخالفت کے لیے شریک ہوتے ہیں، ورنہ عبادت کی اہمیت کا مقتضیٰ تو یہ تھا کہ اس میں احتیاط سے کام لیا جائے اور اونٹ میں سات سے زائد افراد شریک نہ ہوں۔

ایک اور اعجوبہ سماعت فرمائیں! آبادی کے اندر بول وبراز کی حالت میں قبلہ کی طرف رخ کرنے کا جواز مختلف فیہ ہے، اس لیے احتیاط بہرحال اس میں ہے کہ اس سے احتراز کیا جائے، مگر اہل حدیث کے ہاں تو دوسرے مذاہب کی مخالفت ہی بہت بڑا جہاد ہے، چنانچہ کراچی میں انہوں نے اپنی مسجد کے استنجا خانے گرا کر از سر نو قبلہ رخ تعمیر کرائے ہیں، وجہ دریافت کرنے پر ارشاد ہوا کہ یہ سنت چودہ سو سال سے مردہ تھی، ہم نے اس کو زندہ کیا ہے۔(الحمد للّٰہ **الذی عافانا ممّا ابتلاکم بہ**)

(۴)　اہل حدیث جزئی مسائل اختلافیہ کی اشاعت وتبلیغ میں؛ بلکہ اپنے نظریہ کو پوری امت پر مسلط کرنے کی کوشش میں اس قدر مخبوط الحواس ہیں کہ نہ ان کو یہ ہوش آتا ہے کہ ان مسائل میں حضرات صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم کی آراء بھی مختلف ہیں اور وہ اختلاف رائے کے باوجود ان کو بحث ومباحثہ کا موضوع نہیں بناتے تھے اور نہ ہی اس کا احساس ہوتا ہے کہ اس پرفتن دور میں جب کہ اصول دین پر یورش ہورہی ہے اور فسق وفجور کا سیل رواں رہے سہے دینی اقدار کو بھی خس وخاشاک کی طرح بہا لیے جارہا ہے، جزئی مسائل کو چھیڑ کر امت مسلمہ کو مزید ابتلاء اور فتنے میں نہ ڈالیں اور آپس میں منافرت کی فضا پیدا کرکے لادینی قوتوں کے مزید بڑھنے کا باعث نہ بنیں؛ بلکہ ان فروعی اختلافات کو طاق نسیاں میں ڈال کر، بے دینی کی بڑھتی ہوئی رو کو روکنے کے لیے سب یک صف ہو کر جہاد کریں۔

انصاف سے بتائیں کہ اہل حدیث نے سبائیت، مرزائیت، نیچریت اور اباحیت جیسے فتنوں سے اسلام کی حفاظت کے لیے کبھی کوئی نمایاں خدمت کی؟ یا فسق وفجور کے سدّ باب کے لیے کبھی کوئی کام کیا؟ ان کی تمام تر مساعی اور جہاد کا مصرف صرف فاتحہ خلف الامام، آمین بالجہر اور رفع یدین ہے یا پھر پوری امت مسلمہ بلکہ ائمہ دین تک کی تفسیق وتضلیل، کوئی شخص ڈاڑھی منڈاتا یا کٹاتا ہو، لباس خلاف شرع پہنتا ہو، سود کھاتا ہو، رشوت لیتا ہو، تصویر رکھتا ہو، رقص وسرود

کا دلدادہ ہو، شراب پیتا ہو، اگر ایسے شخص سے کسی اہل حدیث کی ملاقات ہو جائے تو وہ اس کو سب سے پہلے یہی تبلیغ کرے گا کہ امام کے پیچھے فاتحہ نہ پڑھنے سے نماز نہیں ہوتی، جو لوگ پڑھتے ہیں، وہ سب گمراہ ہیں اور حدیث کی مخالفت کرتے ہیں۔

(۵)　جو شخص فاتحہ خلف الامام، آمین بالجہر اور رفع یدین کی تبلیغ تندہی سے کرتا ہو اور ائمہ دین کے سبّ وشتم میں امتیازی شان رکھتا ہو، وہ خواہ کیسے ہی فسق وفجور میں مبتلا ہو؛ بلکہ کفریہ عقائد ہی کیوں نہ رکھتا ہو، جماعت اہل حدیث میں مقبول ہو جاتا ہے۔

اس بارے میں ﴿و شهد شاهد من أهلها﴾ کے تحت خود اہل حدیث عالم قاضی عبد الواحد صاحب خانپوری کی شہادت ملاحظہ ہو، فرماتے ہیں:

''اس زمانہ کے جھوٹے اہل حدیث مبتدعین مخالفین سلف صالحین، جو حقیقت ماجاء الرّسول سے جاہل ہیں، وہ صفت میں وارث اور خلیفہ ہوئے ہیں شیعہ وروافض کے، یعنی جس طرح شیعہ پہلے زمانوں میں باب اور دہلیز کفر ونفاق کے تھے اور مدخل ملاحدہ وزنادقہ کا تھے اسلام کی طرف، اسی طرح یہ جاہل بدعتی اہل حدیث اس زمانے میں باب اور دہلیز اور مدخل ہیں ملاحدہ اور زنادقہ منافقین کے، بعینہٖ مثل تشیع کے۔ (إلى أن قال) مقصود یہ ہے کہ رافضیوں میں ملاحدہ تشیع ظاہر کر کے حضرت علی اور حسنین رضی اللہ تعالیٰ عنہم کی غلو کے ساتھ تعریف کر کے سلف کو ظالم کہہ کر گالی دے دیں اور پھر جس قدر الحاد وزندقہ پھیلائیں کچھ پرواہ نہیں، اسی طرح ان جہال بدعتی کاذب اہل حدیثوں میں ایک دفعہ رفع یدین کرے اور تقلید کا ردّ کرے اور سلف کو ہتک کرے، مثل امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کی، جن کی امامت فی الفقہ اجماع امت کے ساتھ ثابت ہے اور پھر جس قدر کفر بداعتقادی اور الحاد اور زندیقیت ان میں پھیلاوے، بڑی خوشی سے قبول کرتے ہیں اور ایک ذرہ چیں بہ جبیں بھی نہیں ہوتے، اگرچہ علماء اور فقہاء اہل سنت ہزار دفعہ ان کو متنبہ کریں، ہرگز نہیں سنتے، سبحان الله ما أشبه الليلة بالبارحة اور سر اس کا یہ ہے کہ وہ مذہب وعقائد اہل السنۃ والجماعۃ سے نکل کر اتباع سلف سے مستنکف ومستکبر ہو گئے ہیں۔ فافهم وتدبّر''۔ (التوحيد والسّنة في ردّ أهل الالحاد والبدعة ''الملقب به'' إظهار كفر ثناء الله بجميع أصول آمنت بالله، ص: ۲۶۲)

نفس مسئلہ سے متعلق بحث سے قبل یہ طویل تمہید پیش کرنے سے غرض یہ ہے کہ قارئین کو اس کا اندازہ ہو جائے کہ مذکورہ بالا حالات میں فاتحہ خلف الامام سے متعلق کچھ کہنے سننے کی زحمت یا کسی مدلل تحریر کے لیے خامہ فرسائی اور دماغی محنت کس حد تک مفید ہو سکتی ہے، بحث وتمحیص سے اہل فہم واہل انصاف کی تفہیم مقصود ہوتی ہے، مگر مندرجہ بالا خصوصیات کی حامل جماعت اہل حدیث سے اس کی کیا توقع ہو سکتی ہے؟ کبھی تقریری یا تحریری دلائل بازی سے کسی فتنہ

کو دبانا اور عامۃ المسلمین کے دین کی حفاظت مقصود ہوتی ہے، اگر چہ اہل فتنہ سے قبول حق کی کوئی امید نہ ہو؛ مگر اس میں **الأهم فالأهم** کے اصول کو ملحوظ رکھنا لازم ہے، الحاد وارتداد جیسے تباہ کن فتنوں کی موجودگی میں فروعی مسائل پر بحث مباحثہ اور اس میں وقت اور دماغ صرف کرنے کا کوئی جواز نہیں، چنانچہ بعض مرتبہ مجھ سے ذکر کیا گیا کہ فلاں صاحب نے کسی اہل حدیث کے بہکانے سے فاتحہ خلف الامام شروع کردی ہے، آپ ان کو سمجھائیں، میں نے جواب دیا کہ ان کو فاتحہ خلف الامام پڑھنے دیں، میرے پاس ان کو سمجھانے کے لیے وقت نہیں، حقیقت یہ ہے کہ جس کو خود سمجھنے کی فکر نہ ہو، اس کو سمجھانا بے کار اور تضییع وقت ہے، کئی بار کئی مادر زاد مجتہدین نے ان مسائل پر مجھ سے بات کرنے کی خواہش ظاہر کی، مگر میں نے ہر دفعہ عذر کردیا، وجہ وہی کہ اہم مسائل کے ہوتے ہوئے ان فروعی اختلافات کی طرف رخ کرنا جائز نہیں، بالخصوص جب کہ مخاطب میں نہ صلاحیت ہو اور نہ ہی تحقیق حق مطلوب ہو، ایسی حالت میں بات کرنے سے کیا فائدہ؟ ایک دفعہ ایک مجتہدہ صاحبہ کو فاتحہ خلف الامام پر بحث کرنے کا جوش اٹھا اور حدیث دانی کا بہت بڑا دعویٰ کیا، میں نے ان سے دریافت کیا کہ صحیح بخاری کا نام کیا ہے؟ بس اجتہاد کا نشہ ہرن ہوگیا۔ کسی نے خوب کہا ؎

الف کو کیل جانیں سب بچارے   مگر دعویٰ ہے سب کا اجتہادی

فاتحہ خلف الامام سے متعلق اہل حدیث کے مسلسل غوغاء کے باوجود میں نے اپنی عمر کے ستاون سال مکمل سکوت اور صبر کے ساتھ گزارے ہیں، ہمارے اکابر کی یہی شان رہی ہے، مگر اہل حدیث نے اس سکوت سے فائدہ اٹھا کر یہ غلط پروپیگنڈہ شروع کردیا ہے کہ احناف کے پاس کوئی ایک حدیث بھی ایسی نہیں، جس میں امام کے پیچھے فاتحہ پڑھنے سے روکا گیا ہو، یہ پروپیگنڈہ اس قدر تیز کردیا گیا ہے اور عوام سے ایسی حدیث کا مطالبہ اتنی شدت سے کیا جانے لگا ہے کہ عامۃ المسلمین کا ناک میں دم کردیا ہے، عوام پریشان ہوکر مجھ سے دریافت کررہے ہیں، میں کس کس کو جواب دوں؟ اور خالص علمی تحقیق عوام کے دماغوں میں کس طرح اتاروں؟ بالآخر بادل نخواستہ قلم اٹھانا ہی پڑا اور یہ طے کیا کہ بالاختصار دلائل کے ساتھ مسئلہ کی وضاحت لکھ دوں، آگے ہر شخص اپنے ظرف اور علمی استعداد کے مطابق اس سے متفع ہوسکتا ہے، کم از کم کسی کو یہ کہنے کا موقع تو نہیں ملے گا کہ احناف کے پاس کوئی حدیث نہیں، اللہ تعالیٰ ہم سب کو فہم سلیم اور ہدایت صراط مستقیم عطا فرمائیں اور ہر قسم کے فتنوں سے اپنی حفاظت میں رکھیں۔ (آمین)

عمل بالحدیث کی آڑ میں قرآن سے انحراف:

اہل حدیث عمل بالحدیث کے مدعی ہیں؛ مگر قرآن پر عمل نہیں کرتے، ایک مجتہد صاحب نے مجھ سے دریافت فرمایا کہ کیا ترک فاتحہ خلف الامام کے بارے میں کوئی حدیث ہے؟ میں نے کہا کہ امام کے پیچھے قرأت کرنے سے قرآن میں ممانعت آئی ہے۔ وہ فرمانے لگے کہ حدیث تو کوئی نہیں؟ حقیقت یہ ہے کہ فاتحہ خلف الامام کی ممانعت احادیث سے بھی ثابت ہے، جیسا کہ

ہم آگے بیان کریں گے۔(انشاءاللہ تعالیٰ) میں نے ان صاحب کے جواب میں حدیث کی بجائے قرآن کا حوالہ اس لیے دیا کہ وہ مقدم ہے، مگر اس پر سخت تعجب ہوا کہ وہ قرآنی ارشاد کو تسلیم کرنے کے لیے تیار نہیں اور اس کے مقابلہ میں حدیث ہی کی رٹ لگائے ہوئے ہیں، اس کے برعکس احناف کا اصول یہ ہے کہ وہ پہلے قرآن کو دیکھتے ہیں اس کے بعد احادیث پر نظر فرماتے ہیں جو حدیث قرآن کریم کے مطابق ہو، اس کو لے لیتے ہیں اور جو بظاہر قرآن سے متعارض نظر آئے، اس کا کوئی ایسا مفہوم تلاش کرتے ہیں، جو قرآن کے خلاف نہ ہو، چنانچہ مسئلہ فاتحہ خلف الامام کو دیکھئے؛ قرآن کریم میں ارشاد ہے:

﴿وَإِذَا قُرِئَ الْقُرْاٰنُ فَاسْتَمِعُوْا له وَاَنْصِتُوا لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْن ﴾(۱)

اس میں صاف حکم ہے کہ جب قرآن کریم پڑھا جا رہا ہو تو تم اس کو توجہ سے سنو اور خاموش رہو۔ امام احمد رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ یہ آیت بالاتفاق قرأت فاتحہ خلف الامام کے بارے میں نازل ہوئی ہے۔(۲) اب احادیث کو لیجئے کسی حدیث میں یہ حکم نہیں کہ امام کے ساتھ پڑھا کرو۔ ارشاد ہے:

إنّما جعل الإمام ليؤتم به،فلا تختلفوا عليه،فإذا ركع،فأركعوا،وإذا قال:سمع الله لمن حمده فقولوا:ربّنا ولك الحمد،وإذا سجد فاسجدوا.(۳)

دوسری حدیث میں ہے:

ليؤمكم أحدكم فإذا كبر فكبروا وإذا قال غير المغضوب عليهم ولا الضالين فقولوا:آمين،إلخ.(۴)

اس میں امام کے ساتھ سب افعال ادا کرنے کا حکم دیا گیا ہے، مگر ﴿وإذا قرأ فاقرؤا﴾ نہیں فرمایا؛ بلکہ ﴿وإذا قرئ فانصتوا﴾ فرما کر امام کے ساتھ پڑھنے سے منع فرما دیا، احناف نے اس حدیث کو ترجیح دی؛ اس لیے کہ یہ سند کے لحاظ سے صحیح ہونے کے علاوہ حکم قرآنی کے مطابق ہے، دوسری احادیث کے ایسے معانی بیان فرمائے، جن سے تضاد نہ رہے۔

---

(۱) سورة الأعراف:۲۰٤،انیس

(۲) سمعت أحمد قيل له:إن فلانا قال:قراءة فاتحة الكتاب يعنى خلف الإمام مخصوص من قوله:(وإذا قرىء القرآن فاستمعوا) فقال:عمن يقول هذا؟أجمع الناس أن هذه الآية فى الصلاة.(مسائل الإمام أحمد برواية أبى داؤد السجستاني:۱/٤۸،مكتبة ابن تيمية مصر)

مسألة:قال:والمأموم إذا سمع قراءة الإمام فلايقرأ بالحمد ولا بغيرها...وقال أحمد فى رواية أبى داؤد: أجمع الناس على أن هذه الآية فى الصلاة فيتناول بعمومه الصلاة.(المغنى لابن قدامة،مسألة إذا سمع قرائة الإمام فلا بالحمد ولا بغيرها:۱/٤۰۳-٤۰٤،مكتبة القاهرة.انیس)

(۳) صحيح البخارى،كتاب الأذان،باب اقامة الصف من تمام الصلاة (ح:۷۲۲)ص:۱۵۲،بيت الأفكار،انیس

(۴) قال أبوموسىٰ الأشعرى فى حديث طويل:قال رسول الله صلى الله عليه وسلم:إذا صليتم فأقيموا صفوفكم ثم ليؤمكم أحدكم فإذا كبر فكبروا وإذا قال غير المغضوب عليهم ولا الضالين فقولوا:آمين،يحبكم الله فإذا كبر وركع فكبروا وركعوا فإن الإمام يركع قبلكم ويرفع قبلكم،الخ.(الصحيح لمسلم،كتاب الصلاة،باب التشهد فى الصلاة (ح:٤۰٤)ص:۱۷۳،بيت الأفكار،انیس)

اسی طرح آمین کے مسئلہ میں احناف نے پہلے قرآن کریم کی طرف رجوع فرمایا تو یہ ارشاد ملا: ﴿أُدْعُوْا رَبَّكُم تَضَرُّعًا وَّخُفيةً﴾ (۱) امام بخاری رحمہ اللہ تعالیٰ نے عطا رحمہ اللہ تعالیٰ کا قول نقل فرمایا ہے کہ ''آمین دعا ہے'' (۲) اور قرآن کریم نے دعا کے اخفاء کا حکم دیا ہے۔ پس قرآن سے ثابت ہو گیا کہ آمین آہستہ کہی جائے؛ اس لئے احناف نے اس حدیث کو ترجیح دی، جس میں آمین کا اخفاء مذکور ہے اور دوسری احادیث کو اس سے منطبق کیا۔

رفع یدین سے متعلق بھی قرآن کریم میں غور کیا تو معلوم ہوا کہ نماز میں خشوع اور سکون کا حکم دیا گیا ہے، ارشاد ہے:
﴿وَالَّذِيْنَ هُمْ فِي صَلَاتِهِمْ خَاشِعُوْنَ﴾ (۳)... ﴿قُوْمُوْا لِلّٰهِ قَانِتِيْنَ﴾. (۴)

اب احادیث ملاحظہ فرمائیں! صحیح مسلم میں روایت ہے کہ صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم نماز میں سلام کے وقت ہاتھ سے اشارہ فرمایا کرتے تھے، اس پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

''ما لی أراكم رافعي أيديكم كأنها أذناب خيل شمس اسكنوا فی الصّلاة''. (۵) یعنی یہ کیا حرکت ہے کہ نماز میں اس طرح ہاتھ اٹھاتے ہو، جیسے مست گھوڑے دم مارتے ہیں، نماز میں سکون سے رہو، کیسی زبردست تنبیہ ہے۔ بوقت سلام نماز ختم ہو رہی ہے، جب اس وقت بھی ہاتھ اٹھانا سکون کے خلاف ہے تو نماز کے اندر بوقت رکوع رفع یدین کیوں کر مناسب ہوگا؟ البتہ تکبیر تحریمہ چوں کہ نماز میں داخل نہیں؛ اس لیے اس وقت رفع یدین نماز میں حکم سکون کے خلاف نہیں۔ غرضیکہ اس مسئلہ میں بھی حکم قرآنی کے پیش نظر احناف نے ترک رفع یدین کی روایات کو ترجیح دی، اسی پر دوسرے مسائل کو قیاس کر لیا جائے کہ احناف سب سے پہلے قرآن کریم کی طرف رجوع فرماتے ہیں، پھر احادیث میں سے اس کو ترجیح دیتے ہیں جو نص قرآنی کے مطابق ہو۔

صحت حدیث کا معیار:

اہل حدیث یہ الزام لگاتے ہیں کہ احناف بعض مسائل میں صحیح حدیث کے خلاف عمل کرتے ہیں، قابل غور یہ امر ہے کہ صحیح حدیث کی تعریف کیا ہے؟ اہل حدیث تقلید کو ناجائز اور حرام بتانے کے باوجود اس باب میں ائمہ حدیث بخاری، مسلم، ابوداؤد وغیرہم رحمہم اللہ تعالیٰ کی تقلید کرتے ہیں، جس حدیث کو امام بخاری رحمہ اللہ تعالیٰ صحیح کہہ دیں، وہ

---

(۱) سورة الأعراف: ٥٥، انیس
(۲) الصحیح للبخاری، باب جهر الإمام بالتأمين: ١٥٦/١، دار طوق النجاة. انیس
(۳) سورة المؤمنون: ٢، انیس
(۴) سورة البقرة: ٢٣٨، انیس
(۵) الصحیح لمسلم، کتاب الصلاة، باب الأمر بالسكون فی الصلاة، ص: ١٨٤ (ح: ٤٣٠) بيت الأفكار/ صحیح ابن حبان، ذکر خبر ثان یصرح بصحة ما ذکرناه: ٢٠٠/٥ (ح: ١٨٨١) شاملة، انیس)

صحیح ہے، اگر ائمہ حدیث رحمہم اللہ تعالیٰ کی تقلید جائز؛ بلکہ ضروری ہے کہ بدون اس کے کسی حدیث کی تصحیح نہیں کی جا سکتی تو ائمہ فقہ رحمہم اللہ تعالیٰ کی تقلید کیوں جائز نہیں؟

ائمہ حدیث رحمہم اللہ تعالیٰ نے حدیث کی صحت وسقم پرکھنے کے جو اصول تحریر فرمائے ہیں وہ اپنے اجتہاد سے مقرر فرمائے ہیں، ان پر کوئی وحی نہیں نازل ہوئی، اسی طرح ائمہ فقہ رحمہم اللہ تعالیٰ کے ہاں بھی تصحیح حدیث کے کچھ اصول مقرر ہیں، جو اصول فقہ میں مذکور ہیں، جن میں سے مندرجہ ذیل دو اصول خاص اہمیت رکھتے ہیں۔

(۱) جو حدیث کتاب اللہ یا سنت مشہورہ سے زیادہ قریب ہوگی، وہ راجح ہوگی۔

(۲) حضرات صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم میں سے جو حضرات تفقہ میں معروف ہیں، ان کی روایت غیر فقیہ کی روایت پر راجح ہوگی۔

اس ضروری توضیح کے بعد اب اصل مسئلہ قرأۃ الفاتحۃ خلف الامام کی ممانعت سے متعلق دلائل تحریر کئے جاتے ہیں۔

نصوص قرآنیہ:

(۱) ﴿وَلَا تَعۡجَلۡ بِالۡقُراٰنِ مِنۡ قَبۡلِ اَنۡ یُّقۡضٰۤی اِلَیۡکَ وَحۡیُه،وَقُلۡ رَّبِّ زِدۡنِیۡ عِلۡماً﴾(۱)

اس آیت میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ تعلیم دی گئی ہے کہ نزول وحی کے وقت خود ساتھ نہ پڑھیں، اس سے ثابت ہوا کہ تلاوت قرآن کے وقت اس کو خاموشی سے سننا اور ہمہ تن اس کی طرف متوجہ ہونا اور اس میں تفکر وتدبر شرعاً مامور بہ ہے۔

(۲) ﴿لاَ تُحَرِّکۡ بِهٖ لِسَانَکَ لِتَعۡجَلَ بِهٖ،اِنَّ عَلَیۡنَا جَمۡعَه وقُرۡاٰنه،فَاِذَا قَرَاۡنٰه فَاتَّبِعۡ قُراٰنَه﴾(۲)

اس آیت میں بھی حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو حضرت جبریل علیہ السلام کے ساتھ پڑھنے سے منع فرمایا گیا، حالانکہ یہاں حفظ قرآن کی غرض سے ساتھ پڑھنے کی ضرورت بھی تھی، مع ہذا اللہ تعالیٰ نے حفظ قرآن کا ذمہ خود لے کر خاموشی اور توجہ سے سننے کا حکم فرمایا، اس سے قرآن کریم کے اس ادب کی کتنی سخت تاکید ثابت ہوتی ہے کہ قاری کے ساتھ خود پڑھنے کی بجائے اس کی قراءت کو خاموشی کے ساتھ پوری توجہ سے سنا جائے، پھر "لا تقرأ" کی بجائے ﴿لا تحرِّک بِهٖ لسانَک﴾ فرما کر مکمل سکوت کی مزید تاکید فرما دی کہ زبان تک نہ ہلنے پائے، اس کے بعد تاکید در تاکید کے لیے مکرر فرماتے ہیں: ﴿فإذا قرانه فاتّبع قرانه﴾، اس کی تفسیر میں حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما فرماتے ہیں: "فاستمع له وانصت". (صحیح البخاري: ۱/۳/الصحیح لمسلم: ۱/۱۸٤/طیالسي: ۳٤۳)(۳)

(۱) سورة طٰهٰ: ۱۱٤،انیس

(۲) سورة القیامة: ۱٦-۱۸،انیس

(۳) الصحیح للبخاري، کتاب التوحید، باب: قول الله تعالیٰ: ﴿لا تحرک به لسانک﴾ (ح: ۷۵۲٤)/الصحیح لمسلم، باب الإستماع للقراءة (ح: ٤٤۸)/مسند أبي داؤد الطیالسي، کتاب الصلاة، باب: الاستماع للقراءة (ح: ۵۵۸)انیس

اتباع کے دو معنی ہیں، ایک یہ کہ جیسے متبوع کرے، اسی طرح تابع کرے، دوسرے خاموشی سے سننا، آیت مذکورہ سے ثابت ہوا کہ قراءت میں اتباع کے معنی ساتھ پڑھنے کے نہیں؛ بلکہ خاموشی سے سننا ہے؛ کیوں کہ ساتھ پڑھنے سے تو منع کیا جا رہا ہے، اسی لیے حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما نے اس کی تفسیر "**فاستمع له وانصت**" سے فرمائی ہے۔

ہم آگے ایک حدیث پیش کریں گے۔"**إنّما جعل الإمام ليؤتم به**،**إلخ**.

ائتمام" کے معنی ہیں: اتباع۔ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ تعالیٰ اس کی تشریح میں فرماتے ہیں: **قال البيضاوى وغيره الائتمام الاقتداء والاتباع أى جعل الإمام إماما ليقتدى به ويتبع**.(فتح البارى:۱۴۹/۲)(۱)

اس سے ثابت ہوا کہ اگر اس حدیث میں "**وإذا قرأ فانصتوا**" کی زیادتی نہ بھی ہوتی تو بھی اس سے فاتحہ خلف الامام سے ممانعت ثابت ہوتی ہے، اس لیے کہ رکوع اور سجدہ وغیرہ میں اتباع امام کے معنی یہ ہیں کہ مقتدی بھی امام کے ساتھ یہ ارکان ادا کرے اور قرأت میں اتباع کے معنی یہ ہیں کہ خاموشی سے سنے، **كما مرّ**.

(۳)　﴿**وَإِذَا قُرِئَ الْقُرْاٰنُ فَاسْتَمِعُوا له وَاَنْصِتُوْا لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْن**﴾.(۲)

یہ آیت نماز میں سورۂ فاتحہ سے متعلق نازل ہوئی ہے، جس میں واضح ہدایت ہے کہ جب امام قرأت کر رہا ہو، اس وقت مقتدیوں پر فرض ہے کہ امام کی قرأت کو سنیں اور خاموش رہیں۔

امام احمد رحمہ اللہ تعالیٰ نے اس پر اجماع نقل فرمایا ہے کہ یہ آیت قرأت خلف الامام سے متعلق ہے۔ امام احمد رحمہ اللہ تعالیٰ کے اس قول کے چند حوالجات ملاحظہ ہوں۔

(۱)　علامہ جمال الدین زیلعی رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

وقال أحمد: أجمع الناس علٰى أن هٰذه الأية فى الصلٰوة.(زيلعى:۲۳۲/۱)(۳)

(۲)　**قال العلامة موفق الدين بن قدامة فى المغنى:قال أحمد رحمه اللّٰه تعالٰى أجمع الناس علٰى أن هٰذا فى الصّلاة (إلٰى قوله) وقال أحمد فى رواية أبى داؤد:أجمع الناس علٰى أن هٰذه الأية فى الصلاة**.(المغنى:۶۰۵/۱)(۴)

(۳)　**قال العلامة شمس الدين بن قدامة قال أحمد رحمه اللّٰه تعالٰى فى رواية أبى داؤد: أجمع الناس علٰى أن هٰذه الأية فى الصلاة**.(شرح المقنع الكبير:۱۳/۲)(۵)

(۱)　كتاب الأذان،باب:إنما جعل الإمام ليؤتم به،رقم الحديث:۶۸۹،انيس)

(۲)　سورة الأعراف:۲۰۴۔

(۳)　تبيين الحقائق،فصل الشروع فى الصلاة وبيان إحرامها:۱۳۱/۱،المطبعةالأميرية بولاق.انيس

(۴)　تقدم تخريجه وأيضاًمسائل الإمام أحمد برواية أبى داؤدالسجستانى،:۴۸/۱،مكتبة ابن تيمية مصر.انيس

(۵)　باب صفة الصلاة،انيس

(۴) قال الإمام ابن الهمام رحمه اللّٰه تعالٰی وأخرج البيهقی عن الإمام أحمد رحمه اللّٰه تعالٰی قال أجمع الناس علٰی أن هٰذه الأية فی الصلاة. (فتح القدير: ۲۴۱/۱)(۱)

(۵) قال العلامة العلی القاری رحمه اللّٰه تعالٰی روی البيهقی عن أحمد بن حنبل رحمه اللّٰه تعالٰی أنه قال أجمع الناس علٰی أن هٰذه الأية فی الصلاة. (شرح النقاية: ۸۳/۱)(۲)

(۶) غیر مقلدین کے امام شیخ الاسلام ابن تیمیہ فرماتے ہیں:

"وذكر أحمد بن حنبل رحمه اللّٰه تعالٰی الإجماع علی أنها نزلت فی ذلك (الصلاة) وذكر الإجماع علٰی أنها لا تجب القرأة علی المأموم حال الجهر". (فتاویٰ ابن تيمية: ۱۴۳/۲)(۳)

وقال أيضاً وقول الجمهور هو الصحيح فإن اللّٰه سبحانه وتعالٰی قال: ﴿وإذا قرئ القراٰن فاستمعوا له وانصتوا لعلّكم ترحمون﴾، قال أحمد رحمه اللّٰه تعالٰی: أجمع الناس علٰی أنها نزلت فی الصلاة. (فتاوی ابن تيمية: ۴۱۲/۲)(۴)

(۷) غیر مقلد عالم مولانا عبدالصمد پشاوری اپنی کتاب "إعلام الإعلام فی القرأة خلف الإمام" میں لکھتے ہیں:

"والأصحّ كونها فی الصلاة لماروی البيهقی عن الإمام أحمد، قال: أجمعوا علٰی أنها فی الصلاة". (إعلام الإعلام، ص: ۱۹۰)(۵)

مذکورہ عبارت میں امام احمد رحمہ اللہ تعالیٰ سے بیہقی کی روایت اجماع کو غیر مقلد عالم نے بھی تسلیم کرلیا ہے، لہٰذا مبارکپوری صاحب کا یہ کہنا صحیح نہیں کہ! "مجھے امام بیہقی کی "معرفة السنن والاٰثار" اور "كتاب القرأة" میں یہ قول نہیں ملا"۔ بیہقی کی روایت کو دیکھنے والی ایک جماعت ہے جن میں غیر مقلد اور غیر مقلدین کے امام بھی ہیں، ان سب کے مقابلہ میں اگر مبارکپوری صاحب کو یہ روایت نظر نہیں آئی تو ان سے یہی عرض کیا جائے گا کہ ؎

وإذا لم تر الهلال فسلم　　لأناس رأوه بالأبصار (۶)

عدم وجدان عدم وجود کی دلیل نہیں، پھر یہ منطق بھی کیا اعجوبہ ہے کہ بیہقی کی صرف دو کتابیں دیکھ کر فیصلہ سنادیا کہ بیہقی نے یہ روایت نہیں کی، یہ استدلال کی کونسی قسم ہے کہ جو چیز دو کتابوں میں نہیں، وہ بیہقی کی کسی کتاب میں بھی

(۱) فتح القدير، فصل فی القراءة: ۳۴۲/۱، دارالفكر بيروت. انيس
(۲) كتاب الصلاة، فصل فيما يجهر به الإمام، انيس
(۳-۴) كتاب الصلاة، مسألة: فی القراءة خلف الإمام، انيس
(۵) إعلام الإعلام فی القراءة خلف الإمام،
(۶) رحلة الشتاء والصيف لمولوی كبريت المتوفٰی: ۱۰۷۰ھ: ۲۴۷/۱، المكتب الإسلامی بيروت. انيس

نہیں، علاوہ ازیں امام احمد رحمہ اللہ تعالیٰ سے نقل میں بیہقی منفرد نہیں؛ بلکہ موفق الدین بن قدامہ، شمس الدین بن قدامہ اور شیخ الاسلام ابن تیمیہ بھی ناقل ہیں، کما مرّ.

امام احمد رحمہ اللہ تعالیٰ کے علاوہ حافظ ابن عبدالبر رحمہ اللہ تعالیٰ سے بھی قول اجماع منقول ہے:

" لایختلفون أن هذا الخطاب نزل فی هٰذاالمعنی دون غیره". (أوجز المسالک: ۲٤۸/۱)(۱)

ثبوت اجماع کے بعد اس آیت کے شان نزول سے متعلق مزید کسی روایت کی ضرورت نہیں، مع ہذا صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم اور تابعین ومن بعدہم رحمہم اللہ تعالیٰ کے ارشادات ملاحظہ ہوں۔

(۱) صلّی ابن مسعود رضی اللّٰه تعالیٰ فسمع ناسًا یقرؤن مع الإمام، فلما انصرف، قال: أما آن لکم أن تفهموا؟ أما آن لکم أن تعقلوا: ﴿وإذا قرئ القراٰن فاستمعوا له وانصتوا﴾ کما أمرکم اللّٰه تعالیٰ. (تفسیر ابن جریر: ۱۰۳/۹)(۲)

(۲) قال عبد اللّٰه رضی اللّٰه تعالیٰ عنه فی القرأة خلف الإمام: انصت للقراٰن کما أمرت فإن فی القرأة لشغلا وسیکفیک ذلک الإمام. (کتاب القرأة للبیهقی، ص: ۷۳)

(۳) عن ابن عباس رضی اللّٰه تعالیٰ عنهما فی قوله تعالیٰ: ﴿وإذا قرئ القراٰن فاستمعوا له وانصتوا لعلّکم ترحمون﴾ یعنی فی الصلوٰة المفروضة. (کتاب القرأة للبیهقی، ص: ۷۳)

(۴) قال ابن عباس رضی اللّٰه تعالیٰ عنهما المؤمن فی سعة من الاستماع إلیه إلا فی صلوٰة مفروضة أو مکتوبة أو یوم جمعة أو یوم فطر أو یوم أضحی یعنی ﴿وإذا قرئ القرآن﴾ الآیة. (کتاب القراءة، ص: ۷۳)

حضرت عبداللہ بن مسعود اور عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہم سے اس مضمون کی اور بھی کئی روایات ہیں، یہاں ہر ایک سے صرف دو دو روایتیں نقل کرنے پر اکتفاء کیا جاتا ہے۔

پہلی روایت میں ایک راوی محاربی ہیں، ان کے بارے میں ایک غیر مقلد نے لکھا ہے کہ ان کا نام عبدالرحمٰن بن محمد بن زیاد ہے، جو انتہائی درجہ کے ضعیف ہیں۔

مگر ان صاحب کے یہ دونوں دعوے غلط ہیں، اس سند میں عبدالرحمٰن بن محمد بن زیاد المحاربی نہیں؛ بلکہ یحییٰ بن یعلی المحاربی ہیں، جو بالاتفاق ثقہ ہیں، ان پر کسی نے بھی جرح نہیں کی، امام ابوحاتم اور حافظ ابن حبان نے ان کی توثیق کی ہے۔ (تہذیب التہذیب: ۳۰۳/۱۱)(۳)

(۱) القراءة خلف الإمام: ۱۸٦/۲، دار القلم دمشق/ الکاستذکار، باب ترک القراءة خلف الإمام فیما جهر فیه: ٤٦٥/۱، دار الکتب العمیة بیروت. انیس

(۲) من تفسیر سورة الأعراف: ۳٤٦/۱۳، مؤسسة الرسالة. انیس

(۳) من اسمه یحيٰ، مطبعة دائرة المعارف النظامیة الهند. انیس

عبدالرحمٰن بن محمد بن زیاد المحاربی کو انتہائی ضعیف قرار دینا بھی غلط اور سراسر ظلم ہے، ان کے بارے میں اگر چہ **مضطرب، کثیر الغلط، یهم** وغیرہ الفاظ بعض نے کہے ہیں؛ مگر یہ اس لیے صحیح نہیں کہ یہ صحاح ستہ کے راوی ہیں، امام ابن معین، نسائی، ابو حاتم، ابن حبان، ابن سعد، ابن شاہین، بزار اور دار قطنی نے ان کی توثیق کی ہے، عثمان بن ابی شیبہ اور ساجی نے صدوق کہا ہے۔ امام وکیع فرماتے ہیں کہ طویل احادیث کے بڑے حافظ تھے۔ عجلی نے "**لا بأس به**" فرمایا ہے۔ (تهذيب التهذيب: ٢٦٥/٦)(۱)

تفسیر ابن جریر اور ابن کثیر کے بعض نسخوں میں کتابت کی غلطی سے عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کے شاگرد کا نام بشیر بن جابر لکھا گیا ہے، جو قطعاً غلط ہے، مسند احمد بن حنبل: ۳۸۴/۱، مسند طیالسی، ص: ۵۱، صحیح مسلم: ۳۹۲/۲ میں ایک دوسری روایت کی سند میں یُسیر بن جابر ہے اور یہی صحیح ہے۔ (النووی: ۳۹۲/۲، تجريد اسماء الصحابة للذهبي: ١٥٣/٢، الإستيعاب: ١٠٠/١-١٥٨٣/٤)(۲)

یسیر بن جابر کی حافظ ابن حبان، ابن سعد اور امام عجلی نے توثیق کی ہے اور عوام بن حوشب ان کو صحابی قرار دیتے ہیں۔ (تهذيب التهذيب: ٣٧٩/١١) حافظ ابن عبدالبر نے بھی ان کو صحابی کہا ہے۔ (الإستيعاب: ١٠٠/١-١٥٨٣/٤)

دوسری حدیث کے ایک راوی عبدالوہاب ثقفی کے حافظہ میں آخر عمر میں کچھ فتور آ گیا تھا؛ لیکن اس زمانہ میں انہوں نے کوئی روایت بیان نہیں کی۔ (ميزان الإعتدال: ١٦١/٢)(۳)

تیسری حدیث کے ایک راوی عبداللہ بن صالح کو ابن عدی نے مستقیم الحدیث قرار دینے کے باوجود لکھا ہے کہ یہ عمداً جھوٹ نہیں بولتے؛ مگر سند اور متن میں غلطی کر جاتے ہیں۔ (تهذيب التهذيب: ٢٥٦/٥)

ابن عدی کی یہ جرح جمہور ائمہ حدیث کی تعدیل کے مقابلہ میں کوئی وزن نہیں رکھتی، امام ابن معین، ابو حاتم، ابن حبان، عبدالملک بن شعیب، ابوزرعہ، یعقوب بن سفیان اور مسلمۃ ابن قاسم ان کی توثیق فرما رہے ہیں، ابو ہارون الخربی فرماتے ہیں کہ میں نے ابو صالح سے زیادہ اثبت کوئی نہیں دیکھا، حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ یہ صحیح بخاری کے راوی ہیں، امام بخاری رحمہ اللہ تعالیٰ نے الادب المفرد اور جزء القرأۃ وغیرہ میں بھی ان سے تخریج کی ہے، امام حاکم اور ذہبی اور حافظ ابن کثیر نے ان کی سند کو صحیح، قوی اور جید قرار دیا ہے۔

ابن القطان فرماتے ہیں کہ یہ صدوق ہیں، ان پر کوئی ایسا الزام نہیں ثابت ہو سکا، جس کی بنا پر ان کی روایت کو غیر معتبر کہا جا سکے، البتہ یہ مختلف فیہ ہیں، ان کی حدیث حسن ہے۔

(۱)　من اسمه عبدالرحمن، مطبعة دائرة المعارف النظامية الهند. انيس

(۲)　النووي شرح مسلم: ٤٠/١، دار إحياء التراث العربي بيروت/الإستيعاب، أسيربن عمروبن جابر المحاربي، دار الجيل بيروت. انيس

(۳)　ميزان الإعتدال، عبدالوهاب بن عبدالمجيد بن الصلت الثقفي: ٦٨١/٢، دار المعرفة بيروت. انيس

ان کے مختلف فیہ ہونے کی وجہ یہ ہے کہ **خالد بن نجیح** ایک شریر شخص تھا جو آپ کا پڑوسی تھا، اس نے بلا وجہ آپ کو بدنام کرنے کی کوشش کی۔ (تهذيب التهذيب: ۲۵۹/۵۔ ۲۶۰/ تذكرة: ۳۵۶/۱/ المستدرک: ۱۹۹/۲/ تفسير ابن كثير: ۴۲۸/۳)(۱)

اس حدیث کے دوسرے راوی علی بن ابی طلحہ پر دو اعتراض کئے گئے ہیں:

ایک یہ کہ ان کے بارے میں امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

له اشياء منكرات. (ميزان: ۲۲۸/۲)(۲)

دوسرا اعتراض یہ ہے کہ علی بن ابی طلحہ کو ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے سماع حاصل نہیں؛ اس لیے یہ روایت منقطع ہے۔ (۳)

اعتراض اول کا جواب یہ ہے کہ "**له اشياء منكرات**" کا مطلب نہیں کہ ان کی روایت میں کوئی امر قادح ہے؛ بلکہ مطلب یہ ہے کہ ان میں یہ خرابی تھی کہ یہ خلیفہ کے مقابلہ میں خروج جائز سمجھتے تھے "**ولكن له رأى سوء يرى السيف**" میں اس کی تصریح ہے۔

وقال الحافظ رحمه الله تعالىٰ: ونقل البخارى رحمه الله من تفسيره رواية معاوية بن صالح عنه عن ابن عباس رضى الله تعالىٰ عنهما شيئًا كثيراً فى التراجم وغيرها ولكنه لا يسميه يقول قال ابن عباس أويذكر عن ابن عباس وقد وقفت على السبب الذى قال فيه أبو داؤد: يرى السيف. (تهذيب التهذيب: ۳۴۰/۷)(۴) امام ابوداود، ابن حبان اور محدث عجلی نے ان کی توثیق فرمائی ہے، (ميزان: ۲۲۸/۲، تهذيب التهذيب: ۳۳۹/۷) امام مسلم رحمہ اللہ تعالیٰ نے ان سے روایت کی ہے۔ (الصحيح لمسلم: ۴۶۵/۱)(۵)

دوسرے اعتراض کا جواب یہ ہے کہ علی بن ابی طلحہ اور ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما کے درمیان مجاہد بن جبیر اور سعید بن جبیر کا واسطہ ہے اور یہ دونوں ثقہ ہیں؛ اس لئے یہ سند بلا شبہ صحیح ہے۔ (ميزان الاعتدال: ۲۲۸/۲/ تهذيب التهذيب: ۳۳۹/۷/ فتح البارى: ۳۳۲/۸/ تفسير اتقان: ۱۸۸/۱)(۶)

---

(۱) تذكرة الحفاظ للذهبى، الطبقة السابعة من الكتاب: ۲۸۵/۱، دار الكتب العلمية بيروت/ المستدرک للحاكم، فضل فى توقير العالم: ۲۱۵/۱، دار الكتب العلمية بيروت. انيس

(۲-۳) على بن عباس (ت) الأزرق الأسرى: ۱۳۴/۳، دار المعرفة بيروت/ العلل ومعرفة الرجال لأحمد رواية المروذى: ۱۶۴/۱، مكتبة المعارف الرياض/ الضعفاء للعقيلى: ۲۳۴/۳، دار الكتب العلمية بيروت. انيس

(۴) باب: من إسمه على/ الثقات لابن حبان، باب العين: ۲۱۱/۷، دائرة المعارف العثمانية حيدر آباد/، انيس

(۵) رقم الحديث: ۱۴۳۸. انيس

(۶) ميزان الإعتدال، على بن عباس: ۱۳۴/۳، دار المعرفة/ الإتقان فى علوم القرآن، النوع الثمانون فى طبقات المفسرين: ۲۳۷/۴، الهيئة المصرية. انيس

امام جعفر نحاس نے اپنی کتاب "الناسخ والمنسوخ" میں علی بن ابی طلحہ کے اسی تفسیری صحیفہ سے نقل کیا ہے۔(اتقان: ۱۸۸/۱) امام بخاری رحمہ اللہ تعالیٰ صحیح بخاری میں اور امام ابن جریر، ابن ابی حاتم اور ابن المنذر وغیرہ بھی تفاسیر میں اسی صحیفہ سے نقل فرماتے ہیں۔(فتح الباری: ۳۳۸/۸)

غیر مقلدین کے امام نواب صدیق حسن خان صاحب تحریر فرماتے ہیں: اما روایت از ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما بطریق مختلفہ آمدہ اجود آنہا طریق معاویہ بن صالح از علی بن ابی طلحہ از ابن عباس رضی اللہ عنہما است، بخاری در صحیح خود اعتماد برہمیں طریق کردہ پس بس۔(أكسير في أصول التفسير، ص: ۱۱۰)(۱)

چوتھی حدیث کے راوی مسکین بن بکیر الحرانی پر اعتراض کیا گیا ہے کہ امام احمد اور ابواحمد نے ان کو وہمی اور کثیر الخطا کہا ہے، اس کا جواب یہ ہے کہ ان کا وہم وخطا صرف سعید بن عبدالعزیز سے روایت کے ساتھ خاص ہے، خود ابو احمد نے تصریح فرمائی ہے، "ومن أين كان مسكين يضبط عن سعيد". (تهذيب التهذيب: ۱۲۱/۱۰)(۲) غیر سعید سے ان کی روایت میں کوئی وہم نہیں؛ چنانچہ امام احمد، ابن معین، ابن حبان، ابن عمار اور ابو حاتم نے ان کی توثیق فرمائی ہے۔(۳)

حضرت عبداللہ بن مسعود اور عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہم سے اس مضمون کی اور بھی کئی روایات ہیں، علاوہ ازیں اسی قسم کی روایات حضرت ابو ہریرہ وعبداللہ بن مغفل رضی اللہ عنہما سے بھی ہیں۔

تفسیر صحابہ رضی اللہ عنہم کا مقام:

حاکم رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ امام بخاری اور امام مسلم رحمہما اللہ تعالیٰ کے ہاں صحابی کی تفسیر حدیث مرفوع کے حکم میں ہے، (مستدرک: ۱۲۳/۱)(۴) امام حاکم کی اپنی تحقیق بھی یہی ہے، (معرفۃ علوم الحدیث، ص: ۲۰)(۵) اکثر علماء تفسیر

(۱) أكسير في أصول التفسير،

(۲) الباب: من اسمه مسكين، انيس

(۳) قلت لأحمد: مسكين أعني ابن بكير؟ قال: قد رأيته ما كان به بأس. (سؤالات أبي داؤد لأحمد، باب أهل حران: ۲۷۳/۱، مكتبة العلوم والحكم المدينة المنورة)/ الثقات لابن حبان، باب الميم: ۱۹۴/۹، دائرة المعارف

مسكين بن بكير الحذاء حدثنا الخضر بن داؤد قال: حدثنا أحمد بن محمد قال: سمعت أبا عبدالله وذكر أبا جعفر النفيلي فأثنى عليه خيراً، وقال: كان يحي معي إلى مسكين بن بكير وكأنه حسّن أمره قلت لأبي عبدالله: نظرت في حديث مسكين عن شعبة فإذا فيها خطأ فقال: من أين كان يضبط هو عن شعبة؟. (الضعفاء الكبير للعقيلي، مسكين بن بكير الحذاء: ۲۲۱/۴، دار الكتب العلمية بيروت. انيس)

(۴) المستدرک للحاكم، وأما حديث رافع بن خديج: ۷۲۶/۱، دار الكتب العلمية. انيس

(۴) معرفة علوم الحديث للحاكم، ذكر النوع الخامس من هذه العلوم النوع: ۱۹/۱، دار الكتب العلمية. انيس

تفسیر صحابی کو بحکم مرفوع قرار دیتے ہیں، (البدایة والنہایة:۲۳۳/۶)(۱) علامہ سیوطی رحمہ اللہ تعالیٰ کے ہاں بھی تفسیر صحابی مرفوع ہے، (تدریب الراوی ص:۶۵)(۲) علامہ جزائری رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ جس صحابی نے نزول وحی کا زمانہ پایا ہو اس کا کسی آیت کا شان نزول بتانا بحکم مرفوع ہے۔ (توجیہ النظر، ص:۱۶۵)(۳)

نواب صدیق حسن خان صاحب تحریر فرماتے ہیں:

”وکذا حکم أقوالهم فی التفسیر فإنها أصوب من أقوال من بعدهم وقد ذهب بعض أهل العلم إلٰی أن تفسیرهم فی حکم المرفوع. (الجنة فی الأسوة الحسنة بالسنة، ص:۹۶)

وقال الحافظ ابن القیم: وتفسیر الصحابی حجة. (زاد المعاد)(۴)

حضرات صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم میں سے بالخصوص حضرت عبداللہ بن مسعود اور عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہم کا تفسیر میں بہت بلند مقام ہے، عبداللہ بن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے معلمین قرآن میں سے اول درجہ عطا فرمایا ہے۔ (صحیح بخاری:۵۳۱/۱۔ مسلم:۲۹۳/۲)(۵) اور فرمایا کہ ابن مسعود کی تحقیق اور عہد کو مضبوطی سے قائم رکھو۔ (استیعاب:۳۵۹/۱) حضرت ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما فرماتے ہیں کہ ابن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ علم کا انبار تھے۔ (استیعاب:۳۵۹/۱)(۶) حضرت عمر رضی اللہ عنہ فرمایا کہ ابن مسعود رضی اللہ عنہ علم کا انبار ہیں اور آپ کو تعلیم قرآن کے لیے اہل کوفہ کی طرف بھیجا۔ (بغدادی:۱۴۷/۱)(۷)

حضرت عقبہ بن عامر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد میں نے اللہ تعالیٰ کے نازل کردہ احکام کا ابن مسعود سے کوئی بڑا عالم نہیں دیکھا، حضرت ابوموسیٰ رضی اللہ تعالیٰ عنہ اس کی یہ وجہ بیان فرماتے ہیں کہ ابن مسعود ہر وقت حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر باش رہتے تھے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم آپ سے کسی وقت حجاب نہیں فرماتے تھے، (صحیح مسلم:۲۹۳/۲)(۸) اسی لیے حضرت ابن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ علانیہ فرمایا کرتے تھے کہ اس خدا کی

---

(۱) ذکر الأخبار عن وقعة الحرة التی کانت فی زمن یزید أیضا:۲۳۳/٦، دار الفکر بیروت. انیس

(۲) الثالث إذا قیل فی الحدیث عند ذکر الصحابی:۲۱۳/۱، دار طیبة. انیس

(۳) ذکر النوع الخامس من هذه العلوم:۳۹۷/۱، مکتبة المطبوعات الإسلامیة حلب. انیس

(۴) فصل فی حکمه صلی اللّٰه علیه وسلم فی من طلق ثلاثاً بکلمة واحدة:۲۲۲/۵، مؤسسة الرسالة. انیس

(۵) الصحیح للبخاری، باب مناقب عبداللّٰه بن مسعود (ح:۳۸۰۸-۴۹۹۹)/ الصحیح لمسلم، باب من فضائل عبداللّٰه بن مسعود (ح:۲٤٦٤) انیس

(۶) عبداللّٰه بن مسعود بن غافل:۹۸۹/۳، دار الجیل بیروت. انیس

(۷) الإستیعاب فی معرفة الأصحاب، عبداللّٰه بن مسعود بن غافل:۹۹۲/۳، دار الجیل بیروت. انیس

(۸) الصحیح لمسلم، باب من فضائل عبدالله بن مسعود (ح:۲٤٦۰-۲٤٦۱) انیس

قسم جس کے سوا اور کوئی معبود نہیں؛ قرآن کریم کی کوئی سورت اور کوئی آیت ایسی نہیں، جس کے شان نزول کا مجھے علم نہ ہو کہ کس موقع اور کس حالت میں نازل ہوئی اور میں کتاب اللہ کا اپنے سے بڑا عالم کسی کو نہیں پاتا، نیز فرمایا کہ سب صحابہ کو اچھی طرح معلوم ہے کہ میں کتاب اللہ کا ان سب سے بڑا عالم ہوں۔ (بخاری:۷۴۸/۲۔ مسلم:۲۹۳/۲)(۱) امام نووی رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ ابن مسعود رضی اللہ عنہ خلفاء راشدین سے بھی کتاب اللہ کے بڑے عالم ہیں۔ (مسلم:۲۹۳/۲)(۲)

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ پر یہ الزام لگایا جاتا ہے کہ آپ معوذتین کو قرآن نہیں سمجھتے تھے، مگر یہ سراسر بہتان اور افترا ہے، علامہ ابن حزم فرماتے ہیں:

"کل ماروی عن ابن مسعود رضی اللّٰہ تعالیٰ عنہ من أن المعوذتین وأم القرآن لم تکن فی مصحفہ فکذب موضوع لا یصح. (المحلی: ۱۳/۱)(۳)

علامہ سیوطیؒ فرماتے ہیں:

"ومانقل عن ابن مسعود رضی اللّٰہ تعالیٰ عنہ باطل لیس بصحیح. (الإتقان: ۷۹/۱)(۴)

امام نووی رحمہ اللہ نے بھی شرح المہذب میں یہی فرمایا ہے، امام سبکی فرماتے ہیں کہ یہ امر دلیل قطعی سے ثابت ہے کہ یہ ابن مسعود پر افترا ہے اور وہ اس سے بالکل بری ہیں۔ (طبقات:۲۰۷/۲)(۵)

فن تفسیر میں حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے بعد دوسرا درجہ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کا ہے، حضرت عمر رضی اللہ عنہ جیسے صاحب بصیرت بھی تفسیر قرآن میں آپ کی طرف رجوع فرماتے تھے۔ (صحیح بخاری:۷۴۳/۲)(۶) حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے آپ کے لیے دعا فرمائی تھی کہ اے اللہ! ان کو دین کا فہم اور قرآن کریم کی تفسیر میں مہارت عطا فرما۔ (مسند احمد:۳۲۸/۱)(۷) **قال الھیثمی رجالہ رجال الصحیح، (مجمع الزوائد:۲۷۶/۹)(۸) وصححہ ابن کثیر. (البدایۃ والنھایۃ:۲۹۷/۸)(۹)**

---

(۱) الصحیح للبخاری، باب القراء ۃ من أصحاب رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم (ح: ۵۰۰۰)/ الصحیح لمسلم، باب من فضائل عبداللّٰہ بن مسعود (ح: ۲٤٦۲) انیس

(۲) النووی شرح مسلم، باب من فضائل عبداللّٰہ بن مسعود: ۱۷/۱۵، دار إحیاء التراث العربی بیروت. انیس

(۳) مسألۃ: القرآن کلام اللّٰہ ووحیہ أنزلہ علیٰ قلب نبیہ محمد: ۳۲/۱، دار الفکر بیروت، انیس

(۴) النوع الثانی والثالث والرابع والخامس: ۲۷۱/۱، الھیئۃ المصریۃ العامۃ. انیس

(۵) المجموع شرح المھذب، مسائل مھمۃ تتعلق بقراء ۃ الفاتحۃ وغیرھا، الخ: ۳۹٦/۳، دار الفکر بیروت

(٦) کذا فی الإستیعاب فی معرفۃ الأصحاب، عبداللّٰہ بن عباس بن عبدالمطلب: ۹۳۵/۳، انیس

(۷) صحیح البخاری، باب ذکر ابن عباس رضی اللّٰہ عنھما (ح: ۳۷۸٦)/ مسند الإمام أحمد، من مسند عبداللّٰہ بن عباس رضی اللّٰہ عنھما (ح: ۳۰۳۲) انیس

(۸) باب فیمن شھد أن لا إلٰہ إلا اللّٰہ، انیس

(۹) ذکر وفاۃ عبداللّٰہ بن عباس ترجمان القرآن، دار الفکر. انیس

وعن ابن عمر رضی اللّٰہ تعالٰی عنھما أنہ قال ابن عباس أعلم الناس بماأنزل اللّٰہ تعالٰی محمّد صلّی اللّٰہ علیہ وسلم.(البدایۃ والنھایۃ:۳۰۰/۸)(۱)

علامہ ذہبی فرماتے ہیں کہ آپ دین کے امام،علم کا سمندر اور بہت بڑے عالم تھے۔(تذکرہ:۳۷/۱)(۲)

اس کے بعد ہم آیت:﴿**وإذا قرئ القرآن فاستمعوا لہ وانصتوا**﴾ کے شان نزول سے متعلق بعض تابعین رحمہم اللہ تعالیٰ کی روایات نقل کرتے ہیں۔تفسیر قرآن میں صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم کے بعد تابعین رحمہم اللہ تعالیٰ کا درجہ ہے،جمہور ائمہ کے ہاں تابعین کی تفسیر حجت ہے۔(تفسیر ابن کثیر:۵۱۴/۱)(۳)

نواب صدیق حسن خان صاحب فرماتے ہیں:

"**وھٰکذا تفسیر التابعی حجۃ**".(الجنۃ فی الأسوۃ الحسنۃ بالسنۃ،ص:۹۶)

مجاہد بن جبر رحمہ اللہ تعالیٰ:

تفسیر میں تابعین رحمہم اللہ تعالیٰ میں سے بالخصوص حضرت مجاہد بن جبر رحمہ اللہ تعالیٰ کا مقام بہت بلند ہے،امام ذہبی رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ آپ کی امامت اور جلالت شان متفق علیہ ہے۔خصیف رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ آپ تفسیر کے سب سے بڑے امام تھے۔(تہذیب الاسماء:۸۳/۱)(۴)

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ آپ ائمہ مفسرین میں سے تھے اور حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما کے خاص تلامذہ میں سے تھے اور اپنے زمانہ میں تفسیر کے سب سے بڑے عالم تھے۔(البدایہ والنہایۃ:۲۲۴/۹)(۵)

نیز فرماتے ہیں کہ مجاہد بن جبر رحمہ اللہ تعالیٰ فن تفسیر کے مسلم امام ہیں،سفیان ثوری فرمایا کرتے تھے کہ جب تمہارے پاس مجاہد کی تفسیر پہنچ جائے تو پھر کسی اور کی حاجت باقی نہیں رہتی،مجاہد کے بعد سعید بن جبیر،عکرمہ،عطاء بن ابی رباح،حسن بصری،مسروق،سعید بن المسیب،ابوالعالیہ،ربیع بن انس،قتادہ اور ضحاک ابن مزاحم وغیرہم رحمہم اللہ تعالیٰ کا درجہ ہے۔(تفسیر ابن کثیر:۵۱۴/۱)

نواب صدیق حسن خاں فرماتے ہیں کہ!ابن تیمیہ گفتہ **أعلم الناس بالتفسیر أھل مکۃ کمجاھد**،آگے ابن تیمیہ سے نقل کرتے ہیں کہ اسی وجہ سے امام شافعی اور امام بخاری رحمہما اللہ تعالیٰ نے آپ کی تفسیر پر کلی اعتماد کیا ہے.(الأکسیر فی أصول التفسیر،ص:۱۱۰)

---

(۱) الباب ذکر وفاۃ عبداللّٰہ بن عباس ترجمان القرآن،انیس

(۲) الطبقۃ الأولٰی من الکتاب:۳۳/۱،دارالکتب العلمیۃ بیروت.انیس

(۳) مقدمۃ المؤلف:۱۱/۱،دارالکتب العلمیۃ بیروت.انیس

(۴) تھذیب الأسماء والصفات،حرف المیم،دارالکتب العلمیۃ بیروت.انیس

(۵) البدایۃ والنھایۃ،وممن توفی فیھا من الأعیان،دارالفکر بیروت.انیس

اب مجاہد رحمہ اللہ تعالیٰ کی روایات ملاحظہ ہوں:

(۵)　ابن ابی نجیح حضرت مجاہد بن جبر رحمہ اللہ تعالیٰ سے روایت کرتے ہیں:

''**كان رسول اللّٰه صلّى اللّٰه عليه وسلّم يقرأفي الصلٰوة فسمع قرأة فتى من الأنصارفنزل: ﴿وإذا قرئ القراٰن﴾ الآية.** (كتاب القرأة للبيهقى ص: ٧٢)

(۶)　ابو ہاشم اسماعیل بن کثیر المکی مجاہد بن جبر رحمہ اللہ تعالیٰ سے روایت کرتے ہیں:

﴿وإذا قرئ القراٰن فاستمعوا له﴾قال فى الصلٰوة. (كتاب القرأة، ص: ٧٣)

(۷)　حمید اعرج حضرت مجاہد رحمہ اللہ تعالیٰ سے روایت کرتے ہیں:

﴿وإذا قرئ القراٰن فاستمعوا له﴾قال فى الصلٰوة. (كتاب القرأة، ص: ٧٤)

ہم مجاہد رحمہ اللہ تعالیٰ سے انہی چند روایات پر اکتفا کرتے ہیں، ورنہ آپ سے اسانید صحیحہ کے ساتھ اور بھی متعدد روایات اس مضمون کی ہیں۔

امام بیہقی کتاب القرأۃ ص:۲۷ میں فرماتے ہیں کہ مجاہد کی یہ روایت منقطع ہے، اھ، مگر ابوزرعہ، ابوحاتم اور دارقطنی جیسے مشہور ائمہ حدیث منقطع اور مرسل میں کوئی فرق نہیں کرتے۔

''**قال العلامة الجزائرى رحمه اللّٰه تعالىٰ وقدأطلق المرسل على المنقطع من أئمة الحديث أبوزرعة وأبوحاتم والدارقطنى.** (توجيه النظر، ص: ٢٤٣)(۱)

سعید بن المسیب رحمہ اللہ تعالیٰ:

امام شافعیؒ کو دوسرے تابعین کی مراسیل کی حجیت میں کلام ہے، مگر صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم کے مراسیل کی طرح سعید بن المسیب کے مرسل کو وہ بھی حجت تسلیم کرتے ہیں۔ (تدریب الراوی: ۱۲۰) امام ابن معین فرماتے ہیں کہ آپ کے مراسیل صحیح ترین ہیں۔ (تدریب الراوی: ۱۲۳)(۲)

امام احمد رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ آپ کے تمام مراسیل صحیح ہیں۔ (تذکرہ: ۱/۵۱)(۳)

قال أحمد بن حنبل رحمه اللّٰه تعالىٰ: مرسلات سعيد بن المسيب أصح المرسلات. (تدريب الراوى: ١٢٣)(۴)

---

(۱)　باب القسيم الحديث الضعيف إلىٰ أقسامه المشهورة، انيس

(۲)　تدريب الراوى، حكم المرسل: ١/ ٢٢٤، دارطيبة. انيس

(۳)　تذكرة الحفاظ للذهبى، الطبقة الثانية من الكتاب: ١/ ٤٤، دارالكتب العلمية بيروت. انيس

(۴)　حكم المرسل، انيس

حاکم فرماتے ہیں کہ تمام مراسیل میں صحیح ترین مراسیل آپ کے ہیں۔(معرفة علوم الحديث: ۲۵/۱)

امام بیہقی آپ کے مراسیل کو اصح المراسیل قرار دیتے ہیں۔(السنن الكبرىٰ: ۴۲۱/۱)(۱)

علامہ جزائری فرماتے ہیں کہ مراسیل میں سے صحیح ترین مرسل سعید بن المسیب کا ہے۔(توجیہ النظر:۱۶۶)(۲)

امام نووی فرماتے ہیں کہ آپ کی امامت وجلالت پر سب کا اتفاق ہے، علمی فضیلت اور وہ تمام اعمال خیر میں اپنے سب معاصرین سے ممتاز تھے اور آپ کے تفوق اور برتری پر تمام علماء کا اتفاق ہے، حافظ ابن حبان رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ آپ اپنے زمانہ میں اہل مدینہ کے سردار تھے۔(تہذیب الاسماء:۲۲۰/۱)(۳)

حافظ ذہبی آپ کو اجلہ تابعین میں شمار کرتے ہیں۔(تذکرہ:۴۸/۱)

ابن حماد رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ آپ میں حدیث، فقہ، زہد، ورع، عبادات اور جملہ علمی و عملی کمالات جمع تھے۔(شذرات الذہب:۱۰۳/۱)

حافظ ابن کثیر فرماتے ہیں کہ آپ علی الاطلاق سید التابعین تھے، حضرت ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما آپ کو احد المتقنین فرماتے تھے۔(البدایۃ والنہایۃ:۹۹/۹)

امام یحییٰ بن سعید فرمایا کرتے تھے کہ آپ سے جب کسی آیت کی تفسیر دریافت کی جاتی تھی تو آپ فرمایا کرتے تھے کہ ہم تفسیر قرآن میں رائے کو دخل نہیں دیتے؛ بلکہ صرف وہی کہہ سکتے ہیں، جس کا ہمیں علم ہے۔(تفسیر ابن کثیر:۶/۱)

آپ کی روایت درج ذیل ہے:

(۸) حضرت قتادہ رحمہ اللہ تعالیٰ حضرت سعید بن المسیب رحمہ اللہ تعالیٰ سے روایت کرتے ہیں:

"وإذا قرئ القراٰن فاستمعوا له وانصتوا قال فی الصلوٰة".(کتاب القرءۃ،ص:۷۵)

اس روایت کی سند میں حماد بن سلمہ ہیں، ان کو علامہ ذہبی الامام، الحافظ، المحدث اور شیخ الاسلام جیسے القاب دے رہے ہیں۔(تذکرہ:۱۸۹/۱)

امام احمد رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ جو شخص حماد بن سلمہ کے حق میں کچھ کہتا ہو، **فاتهمه على الإسلام**، یعنی اس کو منافق سمجھو۔(تذکرہ:۱۹۰/۱)

امام ابن معین سے بھی یہی الفاظ منقول ہیں۔(تہذیب التہذیب:۲۷۰/۷)(۴)

---

(۱) باب ماروی فی تثنية الأذان والإقامة: ۶۱۸/۱،دار الكتب العلمية.انيس

(۲) توجيه النظر إلى أصول الأثر،ذكر النوع الثامن من علوم الحديث: ۴۰۰/۱،المطبوعات الإسلامية حلب.انيس

(۳) الثقات، باب السين: ۲۷۴/۴،دائرة المعارف.انيس

(۴) تهذيب التهذيب،من اسمه حماد:۱۵/۳،دئرة المعارف النظامية.انيس

نواب صدیق حسن خاں صاحب فرماتے ہیں: گویم حماد بن سلمہ امام ست تفردش مادام کہ درمردیش مانع از اصول نبود مضر نیست۔ (بدور الاہلہ،ص:۳۳۷)

آخر میں ان کے حافظہ میں معمولی تغیر آ گیا تھا۔ (تقریب،ص:۱۰۱)

مگر اصول حدیث کا مسلمہ قاعدہ ہے کہ ثقہ رواۃ کی روایات کو معمولی نسیان کی وجہ سے رد کرنا صحیح نہیں، تفصیل کے لیے فتح المغیث ص:۱۳۰، ملاحظہ ہو، لسان المیز ان ص:۱۷، ج:۱، میزان الاعتدال ص:۲۳۱، ج:۲،ص:۲۵۵، ج:۲، اور بغدادی ص:۱۴۰، ج:۱۴ میں بھی وہم قلیل اور تغیر یسیر کی وجہ سے ثقات پر اعتراض کرنے والوں پر سخت تردید اور شدید نکیر کی گئی ہے۔

اس روایت پر یہ اعتراض کیا گیا ہے کہ اس میں قتادہ مدلس ہیں، اس لیے ان کا عنعنہ قبول نہیں، اس کا جواب یہ ہے کہ حضرت قتادہ رحمہ اللہ تعالیٰ کی تدلیس کو ائمہ حدیث نے غیر مضر قرار دیا ہے۔ علامہ جزائری رحمہ اللہ تعالیٰ ابن حزمؒ سے ایسے مدلسین کی فہرست نقل فرماتے ہیں، جن کی تدلیس صحت روایت پر اثر انداز نہیں ہوتی:

”وهٰذا النوع منه كان جلة أصحاب الحديث وأئمة المسلمين كالحسن البصري وأبي إسحٰق السبيعي وقتادة بن دعامة وعمرو ابن دينار وسليمان الأعمش وأبي الزبير وسفيان الثوري وسفيان بن عيينة. (توجيه النظر: ۱/۲۵۱)(۱)

امام حاکم رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ جن مدلسین کی تدلیس مضر نہیں ان میں سے ابوسفیان طلحہ بن نافع اور قتادہ بن دعامہ بالخصوص قابل ذکر ہیں۔ (معرفۃ علوم الحدیث:۱/۱۰۳)

صحیحین میں قتادہ کی روایات عنعنہ کے ساتھ بہت کثرت سے ہیں، ان کو صحیحین کی خصوصیت نہیں کہا جاسکتا، اس لیے امام حاکم اور ابن حزم کا مذکورہ فیصلہ عام ہے۔ معرفۃ علوم الحدیث ص:۱۰۷، میں سلیمان شاذ کونی کا قول منقول ہے کہ اعمش اور قتادہ کی صرف وہی روایات معتبر ہیں، جن میں سماع کی تصریح ہو، مگر ذرا لسان المیز ان :۳/۸۴(۲) میں خود سلیمان شاذ کونی کا تانا بانا بھی دیکھ لیں، ائمہ حدیث نے اس کو یہ القاب دیئے ہوئے کذاب، واضع احادیث، شرابی، بے ہودہ، نامراد، عدو اللہ، خبیث، لونڈے بازی سے متہم۔

حافظ ابن حجر رحمہ اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب طبقات المدلسین میں قتادہ کو مدلسین کے تیسرے طبقہ میں شمار کیا ہے، جن کا عنعنہ قبول نہیں؛ مگر خود حافظ رحمہ اللہ تعالیٰ فتح الباری میں قتادہ کی معنعن روایات کو صحیح قرار دے رہے ہیں، مثال کے طور پر (۲/۲۰۲) ملاحظہ ہو اور خود حافظ کا فیصلہ ہے کہ ان کی نظر میں فتح الباری کی تحقیق زیادہ راجح اور قابل اعتماد ہے،

(۱) باب:تقسيم الحديث الضعيف إلى أقسام المشهورة،انيس

(۲) من اسمه سليمان: ۱/۸۷،دائرة المعارف النظامية.انيس

طبقات المدلسین آپ کے ابتدائی دور کی تصنیف ہے اور اس زمانہ کی تصانیف پر آپ خود مطمئن نہیں، چنانچہ قاضی شوکانی فرماتے ہیں:

”ونقل عنه أنه قال لست راضیًاعن شی من تصانیفی لأنی عملتها فی ابتداء الأمر ثم لم یتهیأ لی من یحررها معی سوی شرح البخاری ومقدمته والمشتبه والتهذیب ولسان المیزان وروی عنه فی موضع اٰخر أنه إثنی علٰی شرح البخاری والتعلیق والنخبة. (البدر الطالع: ۸۹، طبع: ۱۳۴۸ھ)

اس سے ثابت ہوا کہ حافظ رحمہ اللہ تعالیٰ نے طبقات المدلسین میں قتادہ کے عنعنہ کے بارے میں جو لکھا ہے بعد میں اس سے رجوع فرمالیا ہے۔

حضرت حسن بصری رحمہ اللہ تعالیٰ:

(۹)　منصور حضرت حسن بصری رحمہ اللہ تعالیٰ سے روایت کرتے ہیں کہ آپ نے فرمایا:

”وإذا قرئ القراٰن فاستمعوا له وانصتوا فی الصلاة“. (کتاب القراءۃ، ص: ۷۵)

امام المحدثین علی بن المدینی فرماتے ہیں کہ کہ حسن بصری رحمہ اللہ تعالیٰ کے مراسیل جن کو ثقہ راوی نقل کریں، بالکل صحیح ہوتے ہیں۔ (تدریب الراوی: ۱۲۳)

ابن سعد فرماتے ہیں کہ حسن بصری رحمہ اللہ تعالیٰ جامع کمالات، عالم، بلند مرتبہ، رفیع المنزلہ، فقیہ، مامون، عابد، زاہد، وسیع العلم، فصیح، بلیغ اور حسین وجمیل تھے۔ (طبقات ابن سعد: ۱۱۵/۷)

علامہ ذہبی فرماتے ہیں کہ آپ علم کا سمندر، فقیہ النفس، کبیر الشان، عدیم النظیر اور بلیغ التذکیر تھے۔ (تذکرہ: ۶۲/۱)

امام نووی فرماتے ہیں کہ آپ کی جلالت شان پر سب کا اتفاق ہے۔ (تہذیب الاسماء: ۱۶۱/۱)

ابوبکر الہندلی فرماتے ہیں کہ حسن بصری رحمہ اللہ تعالیٰ جب تک ایک سورت کی تفسیر اور اسکے شان نزول وغیرہ کا پورا علم حاصل نہ کرلیتے تھے اس وقت تک وہ آگے نہ بڑھتے تھے۔ (شذرات: ۱۳۷/۱)

آپ فقہ کے بہت بڑے امام اور بصرہ کے مفتی اعظم تھے، قتادہ فرماتے ہیں کہ آپ حلال وحرام کے سب سے عالم تھے۔ (طبقات سعد: ۱۱۸/۱، قسم أول)

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ تعالیٰ آپ کو **”الإمام الفقیه المشهور أحد التابعین الکبار الأجلاء“** لکھتے ہیں اور فرماتے ہیں کہ آپ علم وعمل اور اخلاص میں یکتا تھے۔ (البدایہ والنہایۃ: ۲۶۹/۹)

نواب صدیق حسن خانصاحب فرماتے ہیں کہ حسن بصری ومحمد بن القرظی وابوالعالیۃ الریاحی وغیرہ رحمہم اللہ تعالیٰ قدماء مفسرین اند وغالب اقوال ایشاں متلقی از صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم بودہ است۔ (اکسیر: ۱۱۰)

امام زہری رحمہ اللہ تعالیٰ:

(۱۰) یونس امام زہری رحمہ اللہ سے روایت کرتے ہیں:

"قال لایقرأ من وراء الإمام فیما یجهر به الإمام یکفیهم قرأة الإمام وإن لم یسمعهم صوته ولکن یقرؤن فیما لایجهر به سرًا فی أنفسهم ولایصلح لأحد خلفه أن یقرأ معه فیما جهر به سراً ولا علانیة قال اللّٰه: ﴿وإذا قرئ القرآن فاستمعوا له وانصتوا لعلکم ترحمون﴾ (کتاب القراءة: ۷۵)

سری نمازوں میں قرأت خلف الامام کا حکم آگے آئے گا انشاءاللہ تعالیٰ، یہاں صرف یہ مقصود ہے کہ امام زہری رحمہ اللہ تعالیٰ بھی ﴿وإذا قری القرآن﴾ (الآیة) کا شان نزول نماز میں قرأت بیان فرماتے ہیں۔

امام شافعیؒ فرماتے ہیں کہ زہری حدیث، تفسیر اور رجال کی توثیق میں امام ہیں۔ (الرسالۃ للامام الشافعی: ۶۴) (۱)

حافظ ابن کثیر آپ کے بارے میں فرماتے ہیں:

"أحد الإعلام من أئمة الإسلام، تابعی جلیل، ... حتی صار من اعلم الناس وأعلمهم فی زمانه وقد احتاج أهل عصره إلیه. (البدایة والنهایة: ۹/ ۳٤۰۔ ۳٤۱) (۲)

امام بیہقی فرماتے ہیں کہ آپ سے بڑا حافظ حدیث، عالم اور احادیث کا جامع و مرتب اور کوئی نہ تھا۔ (کتاب القراءة: ۷۵)

امام ابن المدینیؒ فرماتے ہیں کہ حجاز میں ثقات کا سارا علم زہری اور عمرو بن دینار کے درمیان تقسیم تھا۔ (تذکرہ: ۱/ ۹۹)

عمر بن عبدالعزیزؒ فرمایا کرتے تھے کہ اب زہری سے زیادہ سنت ماضیہ کا جاننے والا کوئی نہیں رہا۔ (تذکرہ: ۱/ ۹۹)

عمرو بن دینارؒ فرماتے تھے کہ میں نے حدیث میں کسی کو آپ سے زیادہ انص نہیں دیکھا۔ (تہذیب التہذیب: ۹/ ۴۴۸)

ابن خلکان لکھتے ہیں کہ مدینہ کے ساتوں مشہور فقہاء کا علم آپ کے سینہ میں محفوظ تھا۔ (وفیات الأعیان: ۱/ ٤۵۱) (۳)

حافظ ابن تیمیہ فرماتے ہیں آپ اپنے وقت میں سنت اور حدیث کے بہت بڑے امام تھے۔ (فتاوی ابن تیمیہ: ۲/ ۱۴۵)

ابوالعالیہ الریاحی رحمہ اللہ تعالیٰ:

مہاجر ابوالعالیہ ریاحی رحمہ اللہ تعالیٰ سے روایت کرتے ہیں:

"کان النبی صلّی اللّٰه علیه وسلّم إذا صلّی قرأ فقرأ أصحابه فنزلت ﴿فاستمعوا له﴾ (الآیة) فسکت القوم وقرأ النبی صلّی اللّٰه علیه وسلّم. (کتاب القراءة: ۷۲)

---

(۱) الحجة فی تثبیت خبر الواحد: ۱/ ٤٦۹، مکتبة الحلبی مصر. انیس

(۲) الزهری، دار الفکر بیروت. انیس

(۳) الزهری: ٤/ ۱۷۷، دار صادر بیروت. انیس

امام نووی رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ ابوالعالیہ ریاحی کبار تابعین میں سے تھے، ابوالقاسم طبری فرماتے ہیں کہ آپ کی توثیق پر سب متفق ہیں۔(تہذیب الاسماء:۲۵۱/۱)(۱) ابوبکر بن داؤد فرماتے ہیں کہ صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم کے بعد ابوالعالیہ سے بڑھ کر کوئی عالم قرآن نہ تھا،(تذکرہ:۵۸/۱) ابن سعد آپ کو کثیر الحدیث فرماتے ہیں۔(طبقات ابن سعد:۸۵/۷) خود امام بیہقی قہقہہ فی الصلوٰۃ والی حدیث کے سوا آپ کی باقی تمام احادیث کو صحیح تسلیم کرتے ہیں،(السنن الکبریٰ:۱۴۷/۱) امام عجلی فرماتے ہیں کہ آپ ثقہ اور کبار تابعین میں سے ہیں، امام ابن عدی فرماتے ہیں کہ حدیث ضحک فی الصلوٰۃ کے سوا آپ کی تمام احادیث درست ہے۔(تہذیب التہذیب:۲۸۵/۳) مولیٰ طاش کبری زادہ فرماتے ہیں کہ آپ کبار تابعین میں سے تھے، حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات سے صرف دو سال بعد اسلام لائے اور حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی خدمت میں حاضر ہوئے، حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے پیچھے نماز پڑھی ہے اور آپ نے حضرت ابی بن کعب، زید بن ثابت اور ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہم سے قرآن کریم پڑھا ہے اور صحیح روایت سے ثابت ہے کہ آپ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو تین بار قرآن کریم سنایا تھا۔(مفتاح السعادۃ:۳۶۴/۱۔تہذیب التہذیب:۲۸۴/۳)

قال الذهبي:فأماإذا أسند أبو العالية فحجة.(ميزان الإعتدال: ۳٤٠/۱)(۳)

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ابوالعالیہ کا مرسل حجت ہے، مگر جمہور محدثین نے ذہبی کے اس قول کو قبول نہیں کیا؛ اسی لیے حافظ ابن حجر رحمہ اللہ تعالیٰ نے تہذیب التہذیب میں اس کو نقل نہیں فرمایا۔

عبد بن عمیر وعطاء بن ابی رباح رحمہما اللہ تعالیٰ:

(۱۲) طلحۃ بن عبید بن کریز: عبید بن عمیر اور عطاء بن ابی رباح رحمہما اللہ تعالیٰ سے روایت کرتے ہیں:

"إنما ذٰلک في الصلوٰة(يعني)﴿وإذا قرئ القراٰن فاستمعوا له وأنصتوا﴾(الآية)(تفسير ابن جرير: ۱۱۰/۹۔تفسير ابن كثير: ٦٢٣/۳)(۴)

علامہ ذہبی فرماتے ہیں کہ عبد بن عمیر عالم، واعظ اور کبیر القدر تھے۔(تذکرہ:۴۸/۱) ابن معین، ابوزرعہ اور ابن حبان آپ کو ثقہ لکھتے ہیں۔ عجلی فرماتے ہیں کہ آپ ثقہ اور کبار تابعین میں سے ہیں، حضرت ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما آپ کی مجلس وعظ میں حاضر ہوتے اور آپ کی تعریف فرمایا کرتے تھے۔(تہذیب التہذیب:۷۱/۶)

عطاء بن ابی رباح رحمہ اللہ تعالیٰ کو ذہبی مفتی اہل مکہ، محدث، القدوہ اور العلم لکھتے ہیں۔(تذکرہ:۹۲/۱) ابن حبان

---

(۱) تهذيب الأسماء واللغات،حرف العين،أبو العالية: ۲۵۱/۲،ار الكتب العلمية بيروت.انيس

(۲) تهذيب التهذيب،من اسمه رفيع،دائرةالمعارف النظامية الهند.انيس

(۳) رفيع أبو العالية الرياحي: ٥٤/۲،دار المعرفة بيروت.انيس

() سورة الأعراف: ۲٠٤،انيس

فرماتے ہیں کہ آپ فقہ، ورع اور فضل میں تابعین کے سردار ہیں۔ حافظ ابن حجر آپ کو ثبت، حجہ، امام اور کبیر الشان لکھتے ہیں۔ (تہذیب التہذیب: ۲۰۷/۷) حافظ ابن کثیر فرماتے ہیں کہ آپ کبار، ثقات اور بلند پایہ تابعین میں سے تھے، دوسو صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم سے آپ کی ملاقات ہوئی ہے۔ ابن سعد فرماتے ہیں کہ آپ ثقہ، فقیہ، عالم اور کثیر الحدیث تھے۔ (البدایۃ والنہایۃ: ۳۰۶/۹)

محمد بن کعب القرظی رحمہ اللہ تعالیٰ:

(۱۳) ابومعشر محمد بن کعب رحمہ اللہ تعالیٰ سے روایت کرتے ہیں کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم جب نماز میں قرأت فرماتے تو آپ کے پیچھے صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم اجمعین بھی آپ کے ساتھ قرأت کرتے تھے، اس پر سورہ اعراف کی آیت: ﴿وإذا قرئ القرآن فاستمعوا له وأنصتوا﴾ (الآیۃ) نازل ہوئی۔ (کتاب القراءۃ: ۴۷)

ابن حبان فرماتے ہیں کہ محمد بن کعب القرضی رحمہ اللہ تعالیٰ علم وفقہ میں مدینہ منورہ کے فاضل ترین علما میں سے تھے۔ (تہذیب التہذیب: ۴۲۱/۹) امام نووی رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ آپ ائمہ تابعین میں سے تھے۔ (تہذیب الاسماء: ۹۰/۱، قسم اول) حافظ عجلی آپ کو ثقہ، صالح اور عالم قرآن فرماتے ہیں، ابن سعد آپ کو ثقہ، عالم اور کثیر الحدیث فرماتے ہیں۔ عون بن عبداللہ فرماتے ہیں کہ میں نے تفسیر قرآن میں ان سے بڑا عالم کوئی نہیں دیکھا۔ (البدایۃ والنہایۃ: ۲۴۰/۶۔ تہذیب التہذیب: ۴۲۱/۹) علامہ ذہبی فرماتے ہیں کہ آپ مفسر قرآن تھے۔ (دول الاسلام: ۵۶/۱) حافظ ابن کثیر فرماتے ہیں کہ آپ تفسیر قرآن کے عالم، صالح اور عابد تھے۔ (البدایۃ والنہایۃ: ۲۵۷/۹) حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے پیشگوئی فرمائی تھی کہ بنوقریظہ میں ایک شخص پیدا ہوگا، فن تفسیر میں اس کی نظیر نہ ہوگی۔ ائمہ رحمہم اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ پیشگوئی محمد بن کعب القرظی کے بارے میں۔ (البدایۃ والنہایۃ: ۲۴۰/۶) مولانا مبارکپوری فرماتے ہیں کہ مدینہ طیبہ میں محمد بن کعب کے بعد زید بن اسلم جیسا مفسر قرآن اور کوئی نہ تھا۔ (تحفۃ الاحوذی: ۴۱۷/۱)(۱)

مبارکپوری صاحب نے روایت مذکورہ کے ایک راوی ابومعشر کی بعض محدثین سے تضعیف نقل کی ہے، مگر امام احمد، ابن معین اور ابوزرعہ جیسے جلیل القدر ائمہ نے آپ کی توثیق فرمائی ہے، ابن عدی فرماتے ہیں کہ آپ سے بڑے بڑے ثقات نے روایت کی ہے۔ (میزان الاعتدال: ۲۲۹/۳۔ تہذیب التہذیب: ۴۲۰/۱۰) امام نعیم آپ کو کیس اور حافظ فرماتے ہیں۔ (تہذیب التہذیب: ۴۲۰/۱۰) علامہ ذہبی فرماتے ہیں کہ آپ علم کا ظرف تھے اور امام نسائی نے آپ سے احتجاج کیا ہے۔ (تذکرہ: ۲۱۶/۱) حافظ ابن حجر رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ آپ نسائی، ابوداؤد، ترمذی اور ابن ماجہ کے راوی ہیں۔ (تہذیب التہذیب: ۴۱۹/۱۰)

(۱) باب ما ذکر فی فضل الصلاۃ: ۱۹۴/۳، دار الکتب العلمیۃ بیروت. انیس

علاوہ ازیں جن محدثین نے آپ کو ضعیف کہا ہے، وہ بھی صرف روایت حدیث میں تضعیف کرتے ہیں، فن تفسیر میں آپ بالاتفاق مسلم امام تھے، چنانچہ امام احمد بن حنبل، محمد بن عثمان بن ابی شیبہ، علی بن المدینی اور عمرو بن علی الفلاس وغیرہم ائمہ حدیث رحمہم اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ ابو معشر کی تفسیر سے متعلق روایات بالخصوص وہ روایات جو محمد بن قیس اور محمد بن کعب سے نقل فرماتے ہیں، بلا چون و چرا صحیح اور معتبر ہیں۔ (تہذیب التہذیب: ۴۲۰/۱۰) آپ کی روایت مذکورہ تفسیر کے بارے میں ہے اور محمد بن کعب سے ہے؛ اس لیے بالاتفاق صحیح اور معتبر ہے۔ اسی طرح آپ سے تاریخ کی روایت بھی بالاتفاق حجت ہے، امام خلیلی فرماتے ہیں: **وتاريخه احتج به الائمة وضعفوه فى الحديث**. (تهذيب التهذيب: ۴۲۲/۱۰) جیسے محمد ابن اسحٰق کہ صرف احکام سے متعلق احادیث میں ضعیف ہیں، مگر مغازی کے امام ہیں۔

حجیۃ المرسل:

آیت کریمہ کے شان نزول سے متعلق حضرات صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم اور تابعین رحمہم اللہ تعالیٰ سے جو روایات اوپر نقل کی گئی ہیں، یہ ان کا اپنا خیال نہیں؛ بلکہ مرفوع حدیث کے حکم میں ہے، یعنی ان کی روایت سے ثابت ہوتا ہے کہ خود حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ شان نزول بیان فرمایا ہے، تفسیر صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم سے متعلق اوپر متعدد حوالوں سے ثابت کیا جا چکا ہے کہ بحکم مرفوع ہے، اسی طرح جمہور امت کے نزدیک تابعین رحمہم اللہ تعالیٰ کی تفسیر بھی بحکم مرفوع ہے، اس لیے کہ جمہور محدثین وائمہ دین مرسل کو حجت تسلیم کرتے ہیں، تمام تابعین اور ان کے بعد دوسری صدی کے آخر تک تمام ائمہ حدیث بالاجماع حجیت مرسل کے قائل تھے۔

”وقال ابن جرير: أجمع التابعون بأسرهم علىٰ قبول المرسل ولم يأت عنهم إنكاره ولا عن أحد من الأئمة بعدهم إلىٰ رأس المأتين قال ابن عبد البر كأنه يعني أن الشافعي أوّل من ردّه“. (توجيه النظر للجزائري: ۲۴۵(۱)/تدريب الراوى للسيوطى: ۱۲۰/منية الالمعى للعلامة قاسم بن قطلوبغا: ۲۷)

وقال العلامة الكوثري رحمه الله تعالى والاحتجاج بالمرسل كان سنة متوارثة جرت عليه الأمة فى القرون الفاضلة حتى قال ابن جرير: رد المرسل مطلقاً بدعة حدثت فى رأس المأتين، اهـ، كما ذكره الباجي فى أصوله وابن عبد البر فى التمهيد وابن رجب فى شرح علل الترمذي. (تانيب الخطيب: ۱۵۲)

وأما المراسيل فقد كان يحتج بها العلماء فيما مضى مثل سفيان الثوري ومالك والأوزاعي حتىٰ جاء الشافعي فتكلم فيها. (توجيه النظر: ۲۴۵)(۲)

وكذا ذكر النواب صديق حسن خان ”فى الحطة فى ذكر الصحاح الستة: ۱۰۶.

(۱-۲)　باب: تقسيم الحديث الضعيف إلىٰ أقسام المشهورة، انيس

نیز نواب صاحب فرماتے ہیں: احلال بارسال موجب ترک اونیست زیرا کہ قبول مراسیل مذہب جمع از فحول علماء اصول ست۔ (دلیل الطالب: ۳۲۵)

حجیت مرسل کا سب سے پہلے امام شافعی رحمہ اللہ تعالیٰ نے انکار فرمایا ہے، آپ سے قبل قبول مرسل پر اجماع تھا، امام احمد رحمہ اللہ تعالیٰ بھی مرسل کو حجت قرار دیتے ہیں، امام شافعی رحمہ اللہ تعالیٰ بھی حجیت مرسل کا قطعاً انکار نہیں فرماتے ہیں؛ بلکہ بعض شرائط کے ساتھ وہ بھی مرسل کو قبول فرماتے ہیں۔ **قال الحافظ رحمه اللّٰه تعالٰی وقال الشافعي رحمه اللّٰه تعالى: يقبل إذا اعتضد بمجيئه من وجه اٰخريباين الطرق الأولٰى مسنداً كان أومرسلاً.** (شرح نخبة الفكر: ۵۲)(۱) بلکہ شیخ الاسلام زکریا انصاری فرماتے ہیں کہ مرسل کا مؤید خواہ ضعیف ہی ہو تو بھی قبول کیا جائے گا۔ (حاشیہ شرح نخبہ)

وقال الإمام النووی رحمه اللّٰه تعالٰی ومذهب مالک وأبی حنيفة وأحمد وأكثر الفقهاء رحمهم اللّٰه تعالٰی أنه يحتج به ومذهب الشافعی رحمه اللّٰه تعالٰی أنه إذاانضم إلٰی المرسل ما يعضده أحتج به وذٰلک بأن يروی أيضًامسنداً أومرسلاً من جهة أخرٰی أويعمل به بعض الصحابة رضی اللّٰه تعالٰی عنهم أوأكثر العلماء. (مقدمة النووی لشرحه لصحيح مسلم: ۱٦)(۲)

امام ابن تیمیہؒ فرماتے ہیں:

"إذاجاء المرسل من وجهين: كلّ من الراويين أخذ العلم عن شيوخ الأخر،فهٰذامما يدلّ علٰی صدقه،فإنّ مثل ذٰلک لايتصورفی العادة تماثل الخطأ فيه وتعمد الكذب". (منهاج السنة: ۱۱۷/٤)(۳)

ایسے مرسل کی حجیت پر امام بیہقی نے کتاب القراءۃ ص: ۱۴۳ میں حافظ ابن قیم نے زاد المعاد: ۱/۱۰۵، میں اور مبارک پوری نے ابکار المنن، ص: ۱۳۸ میں اتفاق نقل کیا ہے، نیز مبارکپوری صاحب فرماتے ہیں: مرسل معتضد کے حجت ہونے میں کوئی شبہ نہیں۔ (تحقیق الکلام: ۱/۹۱) ہم اوپر بحوالہ تدریب الراوی، ص: ۱۲۰ تحریر کر چکے ہیں کہ سعید بن المسیب رحمہ اللہ تعالیٰ کے مراسیل کو امام شافعی رحمہ اللہ تعالیٰ بھی بہر حال حجت تسلیم کرتے ہیں، اگر چہ کوئی دوسرا مرسل یا مسند اس کا مؤید نہ ہو۔

غرضیکہ آیہ کریمہ: ﴿**وإذا قرئ القراٰن فاستمعوا له وأنصتوا**﴾ کے شان نزول سے متعلق مذکورہ بالا مراسیل امام شافعی اور امام ابن تیمیہ کے شرائط کے مطابق ہیں اور بالاجماع حجت ہیں۔

---

(۱) الباب المعضل،انیس

(۲) فصل،إذا قال الصحابی كنانقول أونفعل،انیس

(۳) فصل ليس كل أحد من أهل التطردو الاستدلال،انیس

ائمہ غیر مقلدین:

ائمہ غیر مقلدین بھی اس واضح حقیقت کے اعتراف پر مجبور ہیں، چنانچہ امام بیہقی جن کی کتاب القراءۃ پر غیر مقلدین کے مسلک کا مدار ہے، فرماتے ہیں:

”إنا لا ننكر نزول هٰذه الأية فى الصلٰوة أو فى الصلٰوة والخطبة كما ذهب إليه من ذكرنا قوله من سلف هٰذه الأمّة. (جزء القرأة: ۷۷)

وقال الشوكانى: لأن عمومات القراٰن والسنّة قد دلّت علٰى وجوب الإنصات والاستماع و التوجه حال قراءة الإمام للقراٰن. (نيل الأوطار: ۲/۲۲۶)(۱)

وقال ابن تيمية: الذين ينهون عن القرأة خلف الإمام جمهور السلف والخلف ومعهم الكتاب والسنة الصحيحة والذين أوجبوها فحديثهم ضعفه الأئمة. (تنوع العبادات: ۸۶)

وقال أيضاً: وقول الجمهور هو الصحيح فإن اللّٰه سبحانه وتعالٰى قال: ﴿وإذا قرئ القراٰن فاستمعوا له وأنصتوا لعلّكم ترحمون﴾ قال أحمد: أجمع الناس علٰى أنها نزلت فى الصلٰوة. (فتاوى ابن تيمية: ۲/۱۴۳)(۲)

نواب صاحب فرماتے ہیں: ایں آیت دلالت نمی کند مگر بر منع قرأت در حال جہر امام بقرأت 'لقوله فاستمعوا'' واستماع نمی باشد مگر از برائے قرأت مجہور بہانہ برائے قرأت مخافتت۔ (دلیل الطالب: ۲۸۰)

اب ہم نص قرآنی میں فریق مخالف کی تاویلات رکیکہ بیان کرتے ہیں:

مبارک پوری کا تعنت:

(۱)　مبارکپوری صاحب تحقیق الکلام اور تحفۃ الاحوذی میں فرماتے ہیں کہ اس آیت کا خطاب مؤمنین کو نہیں؛ بلکہ کافروں کو ہے، جو تبلیغ کے وقت شور وغل مچایا کرتے تھے اور یہ کہتے تھے کہ قرآن نہ سنو، جیسا کہ امام رازی نے اپنی تفسیر الکبیر: ۴/۵۰۲ میں لکھا ہے اور دلیل یہ پیش کی ہے کہ اگر واقعی خطاب مومنون کو ہوتا تو ''لعلّکم'' کے لفظ کی کیا ضرورت تھی؟ کیوں یہ لفظ ترجی کے لیے آتا ہے اور مومن بہر حال رحمت خداوندی کا مورد اور مستحق ہے۔

مبارکپوری صاحب کی یہ تحقیق محض تعنت ہے؛ اس لیے کہ ہم اوپر اجماع امت سے ثابت کر چکے ہیں کہ یہ آیت کریمہ نماز میں قرأت کے بارے میں نازل ہوئی ہے۔

(۱)　باب ماجاء فى قراءة المأموم وإنصاته، انيس

(۲)　كتاب الصلاة، مسألة: فى القراءة خلف الإمام، انيس

امام رازی:

اجماع امت کے خلاف امام رازی رحمہ اللہ تعالیٰ کا خیال معتبر نہیں، بالخصوص جب کہ آپ نے اس خیال کی تائید میں کوئی روایت پیش نہیں فرمائی، اگر آپ کوئی روایت نقل فرماتے تو بھی وہ قابل اعتماد نہ ہوتی؛ اس لیے کہ ائمہ حدیث نے آپ کو عقلیات کا امام تسلیم کرنے کے باوجود تفسیر وحدیث میں آپ کو ضعیف قرار دیا ہے۔

چنانچہ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

امام رازی عقلیات کے مسلم امام ہیں؛ لیکن احادیث وآثار میں ان کا پایہ کمزور ہے، اسی وجہ سے ان کی تفسیر میں رطب ویابس سبھی کچھ ہے۔(لسان المیزان: ٤/٤٢٦)(۱)

قال الإمام السيوطی رحمه اللّٰه تعالیٰ: قال أبو حيان فی البحر: جمع الإمام الرازی فی تفسيره أشياء كثيرة طويلة لاحاجة لها فی علم التفسير، ولذٰلک قال بعض العلماء: فيه كل شئ إلا التفسير. (الإتقان: ٢/١٩٠)(۲)

وقال المولی طاش كبری زاده رحمه اللّٰه تعالیٰ: قال ابن السبكی فی طبقاته الكبری: إعلم أن شيخنا الذهبی ذكر الإمام فی كتاب الميزان فی الضعفاء وهذا أمر لامعنی له من وجوه أعلاها أنه ثقة حبر من أحبار الأمة وأدناها أنه لارواية له وذكره فی الرواة مجرد فضول وتعصب وتحامل تقشعر منه الجلود (إلیٰ قوله) عمد إلیٰ إمام من أئمة المسلمين وأدخله فی جماعة ليس هو منهم أعنی رواة الحديث فإن الإمام لارواية له. (مفتاح السعادة: ١/٤٤٨)

نواب صاحب فرماتے ہیں: مؤلف وے از علم حدیث بے خبر ست ودر علوم کلام وفنون رسمیہ امام اہل زبان بعضے از اہل معرفت بعلوم کتاب وسنت گفتہ اند: **فيه كل شئ إلا التفسير.** (اکسیر:۱۰۴)

نیز فرماتے ہیں رازی از علم حدیث خبر ندارد۔ (اکسیر:۱۱۳)

پھر لفظ "**لعل**" سے استدلال بھی عجیب ہے، جب کہ شاہی محاورہ میں یقینی وعدہ کے لیے اس کا استعمال معروف ہے۔

قال العلاّمة عبد اللّٰه بن أحمد النسفی: ولعل للترجی والإطماع ولكنّه إطماع من كريم فيجری مجری وعده المحتوم وفاؤه وبه قال سيبويه. (مدارک التنزيل: ١/٧٥)(۳)

اگر لفظ "**لعل**"، مومنین کے لیے استعمال کرنا صحیح نہیں تو مندرجہ ذیل آیات کا کیا جواب ہوگا؟

---

(۱) من اسمه الفتح والفخر، دائرةالمعارف النظامية. انيس
(۲) النوع الثمانون فی طبقات المفسرين، انيس
(۳) مدارک التنزيل وحقائق التأويل، من تفسير سورة البقرة: ١/٦٢، دارالكلم الطيب بيروت. انيس

﴿یٰـأیُّھا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا کُتِبَ عَلَیْکُمُ الصِّیَامُ کَمَا کُتِبَ عَلَی الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِکُمْ لَعَلَّکُمْ تتّقون﴾(۱)

﴿یٰـأیُّھا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لاَ تَدْخُلوا بُیُوتاً غیر بُیُوْتِکُمْ حَتّٰی تَسْتأنِسُوْا وَتُسَلِّمُوا عَلٰی اَھْلِھَا. ذٰلِکُمْ خَیرٌ لَّکُم لَعَلَّکم تَذَکَّرُوْن﴾(۲)

﴿وَتُوْبُوْا اِلَی اللّٰہِ جَمِیْعاً اَیُّہَ الْمُؤْمِنُوْن لَعَلَّکُمْ تُفْلِحُوْن﴾(۳)

﴿فَإِذَا قُضِیَتِ الصَّلٰوۃُ فَانْتَشِرُوْا فِی الأَرْضِ وابْتَغُوْا مِنْ فَضْلِ اللّٰہِ وَاذْکُرُوا اللّٰہَ کَثِیْراً لَعَلَّکُمْ تُفْلِحُوْنَ﴾(۴)

امام رازی رحمہ اللہ تعالیٰ کے مقابلہ میں اگر ہم ان مفسرین کے اقوال تحریر کریں جو اس آیت کا شان نزول نماز قرار دیتے ہیں تو دفتروں کے دفتر سیاہ ہو جائیں، مگر ہم نے شان نزول سے متعلق صرف روایات پیش کرنے پر اکتفا کیا ہے بدوں روایت اقوال مفسرین ذکر کرنے کی نہ حاجت اور نہ ہی اتنی طویل فہرست کے نقل کرنے کی فرصت۔

(۲)　مبارکپوری صاحب فرماتے ہیں: اس آیت کا شان نزول خطبہ ہے، جیسا کہ امام بیہقی نے کتاب القرأۃ ص: ۵۷ میں لکھا ہے، لہٰذا اس آیت سے قرأت خلف الامام کے عدم جواز پر استدلال صحیح نہیں ہے۔ (ابکار المنن: ۱۴۵)

یہ بھی امام بیہقی کا اپنا خیال ہے کسی ایک بھی صحیح روایت سے اس کی تائید نہیں ہوتی، اجماع امت اور صحیح روایات کے مقابلہ میں امام بیہقی کا قول کوئی وزن نہیں رکھتا، خود مبارکپوری صاحب ایک مقام پر فرماتے ہیں کہ امام بیہقی اگرچہ ایک مشہور محدث ہیں، مگر کوئی قول بلا دلیل معتبر نہیں ہو سکتا۔ (تحقیق: ۳۲/۲)

امام بیہقی کا خیال خلاف اجماع اور بلا دلیل ہونے کے علاوہ؛ اس لیے بھی صحیح نہیں ہو سکتا کہ یہ آیت مکی ہے اور جمعہ کی فرضیت مدینہ میں ہوئی ہے۔ امام ابن جریر رحمہ اللہ تعالیٰ کی تحقیق کے مطابق جمعہ ۱ھ میں فرض ہوا ہے، بالفرض قول البعض کے مطابق مکہ مکرمہ ہی میں جمعہ کی فرضیت تسلیم بھی کر لی جائے تو اقامت جمعہ بالاتفاق مدینہ منورہ میں ہوئی ہے، مکہ میں کوئی جمعہ نہیں پڑھایا گیا۔

"وقال الإمام البغوی رحمہ اللّٰہ تعالٰی: الأیة مکیة والجمعة وجبت بالمدینة. (معالم التنزیل علٰی ھامش تفسیر ابن کثیر: ۶۲۳/۳)

غیر مقلد عالم مولانا عبد الصمد صاحب لکھتے ہیں: جو لوگ اس آیت کا شان نزول خطبہ بتلاتے ہیں، وہ سخت غلطی پر ہیں؛ کیوں کہ یہ آیت مکی ہے اور خطبہ کا حکم مدینہ میں ہوا ہے۔ (اعلام الاعلام: ۱۸۹)

---

(۱)　سورة البقرة: ۱۸۳. انیس

(۲)　سورة النور: ۲۷. انیس

(۳)　سورة النور: ۳۱. انیس

(۴)　سورة الجمعة: ۱۰. انیس

(۵)　معالم التنزیل: ۳٤۱/۲، دار السلام الریاض. انیس

اس سے عید کا خطبہ بھی مراد نہیں لیا جا سکتا؛ کیوں کہ نماز عید کا حکم بھی مدینہ منورہ میں ہوا ہے۔ (طبری:۱۲۸۱)

اگر بالفرض تسلیم بھی کر لیا جائے کہ خطبہ جمعہ یا عید اس آیت کا شان نزول ہے تو بھی اس سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ نماز اس کا شان نزول نہیں؛ کیوں کہ اسباب نزول میں تعدد جائز ہے، **كما قال الشيخ عبدالرحمن بن الحسن.** (فتح المجيد شرح كتاب التوحيد: ۱۵۷)(۱) مثلاً آیہ کریمہ ﴿**ولا تجهر بصلاتك ولا تخافت بها وابتغ بين ذلك سبيلاً**﴾ کا شان نزول صحیح بخاری:۶۸۶/۲۔ صحیح مسلم:۱۸۳/۱۔ سنن نسائی:۱۱۶/۱۔ مسند احمد:۲۱۵/۱ اور مسند ابی عوانہ:۱۲۳/۲، میں نماز بتایا گیا ہے اور صحیح بخاری، صحیح مسلم اور مسند ابی عوانہ کے انہی مقامات میں اس کا شان نزول دعا بیان کیا گیا ہے۔

فائدہ جلیلہ:

قرآن وحدیث کے مطالعہ سے واضح ہوتا ہے کہ بسا اوقات ایسے واقعات کو جو کسی حکم قرآنی کے تحت داخل ہوتے ہیں، اس آیت کا شان نزول بتا دیا جاتا ہے؛ حالانکہ اصل شان نزول کچھ اور ہوتا ہے، مگر اس واقعہ کو محض شمول فی الحکم کی وجہ سے شان نزول کہہ دیا جاتا ہے، مثلاً آج کوئی چوری کرے تو یوں کہا جا سکتا ہے کہ آیت ﴿**والسارق والسارقة فاقطعوا أيديهما**﴾ اس کے بارے میں نازل ہوئی ہے۔

"**قال الحافظ السيوطى رحمه الله تعالىٰ وقال ابن تيمية قولهم: نزلت هٰذه الأية فى كذا يراد به تارة سبب النزول ويراد به تارة أن ذٰلك داخل فى الأية وإن لم يكن السبب كما تقول عُنى بهٰذه الأية كذا (إلىٰ قوله) وقال الزركشى فى البرهان: قد عرف من عادة الصحابة والتابعين أن أحدهم إذا قال: نزلت هٰذه الأية فى كذا فإنه يريد بذٰلك أنها تتضمن هٰذا الحكم لأن هٰذا كان السبب فى نزولها فهو من جنسن الاستدلال على الحكم بالأية لامن جنس النقل لماوقع.** (الاتقان: ۳۱/۱)(۲)

وقال الشاه ولى الله رحمه الله تعالىٰ فى الباب الرابع من الفوز الكبير:

وقسمے آں ست کہ معنی آیت بعموم خود تام ست بغیر احتیاج دانستن حادثہ کہ سبب نزول شدہ است وحکم عموم لفظ راست نہ خصوص سبب را، قدماء مفسرین بقصد احاطۂ آثار مناسبہ بآں آیت یا بقصد بیان ما صدق آں عموم آں قصہ را ذکر کردہ اند، ایں قسم را ذکر کردن ضرور نیست پیش ایں فقیر محقق شدہ است کہ صحابہ وتابعین بسیار بود کہ **نزلت الأية فى**

(۱)　"**لأن أسباب النزول قد تتعدد**". (فتح المجيد باب قوله تعالىٰ: إنك لا تهدى من، الخ: ۲۱۶/۱، مطبعة السنة المحمدية القاهرة. انيس)

(۲)　النوع التاسع معرفة سبب النزول، انيس

کذا می گفتند وغرض ایشاں تصویر ماصدق آں آیت بود وذکر بعض حوادث کہ آیت آں رابعموم خود شامل شدہ است خواہ ایں قصہ متقدم باشد یا متاخر، اسرائیلی باشد یا جاہلی یا اسلامی، تمام قیود آیت را درگرفتہ شد یا بعض آں را۔ واللہ اعلم، ازیں تحقیق دانستہ شد کہ اجتہاد را دریں قسم دخلی ہست وقصص متعددہ را آنجا گنجائش ہست، پس ایں نکتہ متحضر دار وحل مختلفات سبب نزول بادنی عنایت می تواں نمود۔ (الفوز الکبیر:۳۵)

یہی تحقیق نواب صدیق حسن خانصاحب نے بھی نقل فرمائی ہے۔ (اکسیر:۱۹)

پس جن حضرات نے آیہ کریمہ: ﴿و اذا قری القران فاستمعوا له و أنصتوا﴾ کا شان نزول خطبہ جمعہ یا خطبہ عید بتایا ہے، ان کا یہی مقصد ہے کہ استماع وانصات کا حکم خطبہ کو بھی شامل ہے، ان کے قول کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہوسکتا کہ اس آیت کا اصل شان نزول ہی خطبہ ہے۔ **لما قدمنا أن الأية مكية و الجمعة فرضت في المدينة.**

غرضیکہ یہ آیت بالاجماع نماز کے بارے میں نازل ہوئی ہے اور اس کا مدلول اول نماز ہی ہے، مگر بحکم علت خطبہ جمعہ وعید کو بھی شامل ہے۔

(۳) امام بیہقی رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم نماز میں بحالت اقتداء بلند آواز سے کلام کیا کرتے تھے، اس سے ممانعت کے بارے میں یہ آیت نازل ہوئی ہے، امام بیہقی نے اپنے اس دعویٰ کے اثبات کے لئے چار روایات نقل کی ہیں۔ (کتاب القراءۃ:۷۷)

امام بیہقی کا یہ دعویٰ اس لیے صحیح نہیں کہ ہم اسانید صحیحہ سے ثابت کرچکے ہیں کہ یہ آیت قرأت خلف الامام کے بارے میں نازل ہوئی ہے، نہ کہ عام کلام کے بارے میں۔

امام بیہقی نے جن روایات سے استدلال کیا ہے، وہ سب ضعیف اور معلول ہیں، تفصیل ملاحظہ ہو!

پہلی روایت:

اس میں دو راوی محمد بن دینار اور ابراہیم ہجری ضعیف ہیں، محمد بن دینار کی امام ابن معین، دارقطنی، نسائی اور عقیلی نے تضعیف کی ہے، امام ابوداؤد فرماتے ہیں کہ آخر میں ان کا حافظہ متغیر ہوگیا تھا، (تہذیب التہذیب:۹/۱۵۵) اور ابراہیم ہجری کو امام بخاری، نسائی، ترمذی، احمد، ابن معین، ابوزرعہ، سعدی، حربی، ابوحاتم، ابن عدی اور علی بن الحسین بن الجنید سب نے ضعیف قرار دیا ہے۔ (تهذيب التهذيب: ١/١٦٥۔ ميزان الإعتدال: ١/٣١)

امام بخاری رحمہ اللہ تعالیٰ نے ابراہیم ہجری کو منکر الحدیث فرمایا ہے اور ائمہ حدیث کا فیصلہ ہے کہ امام بخاری جس کو منکر الحدیث قرار دیں، اس کی روایت قبول کرنا جائز نہیں۔ (میزان: ۱/۵ (۱)۔ طبقات سبکی: ۲/۹۔ تدریب الراوی: ۲۳۵)

---

(۱) إبراهيم بن مسلم الهجرى: ١/٦٥، دار المعرفة بيروت. انيس

دوسری روایت:

اس میں مؤمل بن اسمٰعیل ہیں، ان کو بھی امام بخاری رحمہ اللہ نے منکر الحدیث قرار دیا ہے، علاوہ ازیں ابوحاتم، ابن حبان، یعقوب بن سفیان، ساجی، دارقطنی، ابن سعد، ابن قانع، محمد بن نصر مروزی اور امام ابوزرعہ ان کو کثیر الخطاء، سیئ الحفظ، منکر الحدیث، کثیر الغلط قرار دیتے ہیں اور ان کی روایات قبول کرنے سے منع فرماتے ہیں۔ (تہذیب التہذیب: ۳۸۰/۱۰۔ میزان: ۲۲۱/۳)

تیسری روایت:

اس کے راوی عبداللہ بن عامر کی امام بخاری، امام احمد، نسائی، ابوداؤد، ابوزرعہ، ابوعاصم، دارقطنی، سعدی، امام ابن معین، ابواحمد الحاکم اور ابوحاتم نے تضعیف کی ہے اور امام ابن المدینی نے تو ''ضعیف ضعیف'' دوبار فرما کر دوہری تضعیف کی ہے۔ (تہذیب التہذیب: ۲۷۵/۵۔ میزان: ۵۱/۲۔ لسان: ۳۰۳/۳)

چوتھی روایت:

اس میں عاصم بن عمر ہیں، امام بخاری رحمہ اللہ تعالیٰ نے ان کو منکر الحدیث قرار دیا ہے، امام ترمذی، امام احمد، ابن معین اور جوزقانی نے ان کی تضعیف کی ہے۔ (تہذیب التہذیب: ۵۱/۵۔ میزان: ۴/۲)

جن راویوں پر ایک درجن ائمہ حدیث نے جرح کی ہو، ان کی روایت سے استدلال اور کہلائیں پھر بھی اہل حدیث؟ این چه بوالعجبی است۔

اس آیت کا شان نزول کلام فی الصلوٰۃ نہیں، اس پر مندرجہ ذیل دلائل ہیں:

(۱)　اجماع اور احادیث صحیحہ سے ثابت ہے کہ یہ آیت نماز میں قرأت قرآن کے بارے میں نازل ہوئی ہے۔

(۲)　امام بیہقی نے جو حدیثیں نقل فرمائی ہیں، وہ سب انتہائی درجہ کی ضعیف ہیں۔

(۳)　صحیح حدیث سے ثابت ہے، نماز میں کلام کی ممانعت آیہ کریمہ ﴿وقوموا للّٰه قانتين﴾ سے ہوئی ہے، **کما روی الشيخان رحمهما اللّٰه تعالیٰ عن زيد بن أرقم رضی اللّٰه تعالیٰ عنه.** (البخاری: ۱۶۰/۱. مسلم: ۲۰٤/۱)(۱)

(۴)　مبارکپوری صاحب تحقیق الکلام: ۳۶/۲، میں فرماتے ہیں:

﴿وإذا قرئ القراٰن الآية﴾ دوسری آیت ﴿فاقرؤا ما تيسّر من القراٰن﴾ سے منسوخ ہے؛ کیوں کہ یہ بعد میں نازل ہوئی ہے، جس پر یہ دلائل ہیں۔

---

(۱)　الصحيح للبخاری، باب ما ينهى عنه من الكلام فی الصلاة (ح: ۱۲۰۰)/ الصحيح لمسلم، باب فی تحريم الكلام فی الصلاة (ح: ۵۳۹) انيس

(۱) امام سیوطی رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ پوری سورۂ مزمل مکہ مکرمہ میں نازل ہوئی، مگر آیت ﴿**فاقرؤا ماتیسر من القرآن**﴾ مدینہ میں نازل ہوئی ہے۔ (الاتقان: ۱/۱۷)

(۲) اسی آیت میں حکم زکوۃ بھی مذکور ہے اور حافظ ابن حجر رحمہ اللہ تعالیٰ نے زکوۃ کی فرضیت مدینہ منورہ میں ہونے پر اس طرح استدلال کیا ہے کہ حضرت قیس بن سعد رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ زکوۃ فرض ہونے سے قبل ہمیں صدقہ فطر ادا کرنے کا حکم تھا، زکوۃ فرض ہوئی تو صدقہ فطر ادا کرنے کا نہ تاکیدی حکم دیا گیا اور نہ اس سے منع کیا گیا، اس سے ثابت ہوا کہ زکوۃ صدقہ فطر کے بعد فرض ہوئی ہے اور صدقۃ الفطر تتمہ صوم ہے اور صوم بالاتفاق مدینہ طیبہ میں فرض ہوا ہے۔ (فتح الباری: ۶/۱۱)

(۳) امام ابونصر مروزی رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: آیت: ﴿**فاقرؤا ما تیسّر من القراٰن**﴾ مدینہ میں نازل ہوئی ہے؛ کیوں کہ اس میں قتال کا ذکر ہے اور وہ مدینہ میں فرض ہوا ہے۔ (قیام اللیل: ۲)(۱)

مبارکپوری صاحب کا یہ دعویٰ غلط ہے، انہوں نے ﴿**فاقرؤا ما تیسّر من القراٰن**﴾ کے متأخر فی النزول ہونے پر جو دلائل بیان کئے ہیں، ان کے جواب بالترتیب ملاحظہ ہوں۔

دلیل اول کا جواب:

امام سیوطی رحمہ اللہ تعالیٰ نے اگرچہ یہ قول نقل کیا ہے، مگر اس پر سخت تردید بھی فرمائی ہے۔

”المزمل: استثنی منها: (واصبر علٰی مایقولون) الاٰیتین حکاه الأصبهانی وقوله: (إنّ ربک) إلٰی اٰخر السورة حکاه ابن الفرس ویرده ماأخرجه الحاکم عن عائشة رضی اللّٰه عنها أنه نزل بعد نزول صدر السّورة بسنة وذٰلک حین فرض قیام اللیل فی أوّل الإسلام قبل فرض الصلوات الخمس. (الإتقان: ۱/۱۷)(۲)

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی یہ راویت مسلم: ۱/۲۵۶، نسائی: ۱/۱۸۲، مستدرک: ۱/۵۰۴ میں بسند صحیح مروی ہے، حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے بھی اسی مضمون کی روایت مستدرک: ۲/۵۰۵ اور سنن کبریٰ: ۲/۵۰۰ میں ہے، یہ صحیح السند روایات ابن فرس کی اس روایت سے بدرجہا زیادہ قوی ہیں، جس میں یونس بن حبیب جیسا بالکل مجہول راوی ہے۔ ان روایات سے ثابت ہوا کہ سورۂ مزمل کا آخر اس کے حصہ اول سے ایک سال کے بعد نازل ہوا ہے اور سورۂ مزمل کا ابتدائی حصہ بالاتفاق نبوت کے بالکل ابتدائی دور کا ہے، خود مبارک پوری صاحب فرماتے ہیں: سب سے پہلے سورۂ قلم نازل ہوئی اور اس کے بعد سورۂ مزمل۔ (تحقیق الکلام: ۲/۲۸)

(۱) مختصر قیام اللیل وقیام رمضان وکتاب الوتر، باب حکم قیام اللیل: ۱/۲۶، حدیث أکادمی فیصل آباد. انیس

(۲) النوع الأول: فی معرفة المکی والمدنی. انیس

دلیل دوم کا جواب:

یہ دعویٰ بھی صحیح نہیں کہ زکوٰۃ مدینہ طیبہ میں فرض ہوئی ہے۔حقیقت یہ ہے کہ حکم زکوٰۃ مکہ مکرمہ میں نازل ہو چکا تھا، سورۂ مؤمنون،سورۂ حٰم سجدہ اور سورۂ لقمان میں زکوٰۃ کا حکم مذکور ہے، حالانکہ یہ سورتیں مکی ہیں۔﴿یؤتون الزکوٰۃ﴾ کی تاویل بتزکیہ نفس تو جیہ رکیک اور بعید از قیاس ہے،علاوہ ازیں حضرت جعفر طیار رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے نجاشی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے دربار میں جو تقریر کی تھی،اس میں بھی زکوٰۃ کا ذکر ہے۔(مسند احمد:۲۹۱/۵۔مستدرک:۳۱۰/۲،وقال الحاکم والذهبی علی شرطهما) (۱) حالانکہ ان حضرات کی حبشہ کی طرف ہجرت ابتداء نبوت سے پانچویں سال میں ہوئی تھی۔(طبری:۱۱۱۸،زاد المعاد:۶۱/۲)

امام ابن خزیمہ رحمہ اللہ تعالیٰ کا دعویٰ ہے کہ زکوٰۃ ہجرت سے قبل فرض ہو چکی تھی۔(فتح الباری:۲۱۱/۳) امام رازی رحمہ اللہ بھی یہی فرماتے ہیں۔(تفسیر کبیر:۲۳۵/۴) علامہ آلوسی رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ اکثر علما کی تحقیق کے مطابق زکوٰۃ مکہ مکرمہ میں فرض ہوئی ہے۔(روح المعانی:۱۴۱/۱۹)(۲)

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: سورۂ مزمل کی آخری آیت ان حضرات کی تائید کرتی ہے، جو اس کے قائل ہیں کہ نفس زکوٰۃ تو مکہ مکرمہ میں فرض ہو چکی تھی،مگر اس کے نصاب ومقدار کی تعیین مدینہ منورہ میں ہوئی۔(تفسیر ابن کثیر:۴۳۹/۴) اس تحقیق سے ثابت ہوا کہ قیس بن سعد رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی روایت میں فرضیت زکوٰۃ سے مراد زکوٰۃ کے نصاب ومقدار کی تعیین ہے۔

ونظیره ماقاله الحافظ رحمه اللّٰه تعالیٰ فی شرح قول ابن عمر رضی اللّٰه تعالیٰ عنهما(إنما کان هٰذا قبل أن تنزل الزکاة) هٰذا مشعر بأن الوعید علی الاکتناز وهو حبس فاضل عن الحاجة عن المواساة به کان فی أوّل الإسلام ثم نسخ ذٰلک بفرض الزکاة لما فتح اللّٰه الفتوح وقدرت نصب الزکاة فعلیٰ هٰذا المراد بنزول الزکاة بیان نصبها ومقادیرها لا إنزال أصلها واللّٰه أعلم. (فتح الباری:۲۱۶/۳)(۳)

دلیل سوم کا جواب:

حافظ ابن حجر رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: امام ابونصر کا اس آیت کو مدنی قرار دینا غلط ہے،ان کو اس میں ذکر قتال سے

(۱) فی حدیث طویل:"وأمرنا بالصلاة والزکاة والصیام"،الخ.(مسند الإمام أحمد،مسند جعفر بن أبی طالب الطیار (ح:۱۷٤۰)انیس)

(۲) روح المعانی،من تفسیر سورة المزمل:۱۲٦/۱٥،دار الکتب العلمیة.انیس

(۳) باب ما أدیٰ زکاته فلیس بکنز لقول النبی صلی اللّٰه علیه وسلم لیس فیمادون خمس أواق صدقة، رقم الحدیث:۱٤۰٤،انیس

مغالطہ ہوا ہے؛ حالانکہ اس میں حرف ''س'' بتا رہا ہے کہ آئندہ حکم قتال وارد ہوگا، اس لیے آئندہ آنے والی مشقت کے پیش نظر اللہ تعالیٰ نے نماز تہجد کی تاکید ساقط فرمادی۔

''ونصه وذكر الشافعي عن بعض أهل العلم: أن صلاة الليل كانت مفروضة ثم نسخت بقوله تعالىٰ ﴿فاقرؤا ما تيسّر منه﴾ فصار الفرض قيام بعض الليل ثم نسخ ذلك بالصلوات الخمس واستنكر محمد بن نصر المروزي ذٰلك وقال: الاٰية تدل على أن قوله تعالىٰ ﴿فاقرؤا ما تيسر منه﴾ إنّما نزل بالمدينة لقوله تعالىٰ فيها واٰخرون يقاتلون في سبيل الله والقتال إنّما وقع بالمدينة لا بمكة و الإسراء كان بمكة قبل ذٰلك، اهـ، وما استدله غير واضح؛ لأن قوله تعالىٰ ﴿عَلِمَ أن سيكون﴾ ظاهر في الاستقبال فكأنّه سبحانه وتعالىٰ أمتن عليهم بتعجيل التخفيف قبل وجود المشقة التي علم أنها ستقع لهم والله أعلم. (فتح الباری: ۱/۳۹۳)(۱)

پھر مبارکپوری صاحب کی یہ منطق بھی عجیب ہے کہ ﴿وإذا قرئ القراٰن﴾ (الآیۃ) سے ﴿فاقرؤا ما تيسّر﴾ (الآیۃ) کا تأخر نسخ کو مستلزم ہے، نسخ تو تب ہوتا کہ ان دونوں آیتوں کے مفہوم میں باہم مخالفت ہوتی، حالانکہ یہاں کوئی مخالفت نہیں؛ اس لیے کہ پہلی آیت قرأت خلف الامام سے متعلق ہے اور دوسری نماز تہجد کے بارے میں ہے، چنانچہ خود غیر مقلد عالم مولانا میر صاحب سیالکوٹی فرماتے ہیں کہ سورۂ مزمل کا یہ رکوع نماز تہجد میں تخفیف کے لیے اترا ہے۔ (تفسیر واضح البیان: ۳/۴۴۳) مبارکپوری صاحب نے بھی روح المعانی سے اس کو نقل کیا ہے۔ (تحفۃ الاحوذی: ۱/۲۰۷)

امام بیہقی فرماتے ہیں:

''وهٰذا معروف مشهور فيما بين أهل العلم. (كتاب القراءة: ۱۵۳)

وقال الشوكاني: نزلت في قيام الليل فليست مما نحن فيه. (نيل الأوطار: ۲/۲۱۸)(۲)

اسی طرح ابوداؤد: ۱/۱۹۲، عون المعبود: ۱/۵۰۳، اعلام الموقعین لابن القیم: ۲/۳۷۸، السراج المنير للعلامة الشربيني: ٤/٢٤٨، تفسير العلامة أبي السعود علىٰ هامش التفسير الكبير: ٨/٤٨٥، میں بھی اس کی تصریح ہے، غرضیکہ مبارکپوری صاحب کا دعوائے نسخ غلط ہے۔ نواب صدیق حسن خاں صاحب سورۂ اعراف سے متعلق تحریر فرماتے ہیں: دروے یک آیت یا دو آیت منسوخ ست باقی ہمہ محکم اول خذ العفو وأمر بالعرف، دوم واعرض عن الجاهلين. (إفادة الشيوخ: ٦٥) اور اگر بفرض محال نسخ تسلیم بھی کرلیا جائے تو خود مبارکپوری صاحب فرماتے ہیں کہ آیت فاقرؤا ما تيسّر سے قرأت کی فرضیت ثابت نہیں ہوسکتی۔ (تحفۃ الاحوذی: ۱/۲۰۷)

---

(۱) باب كيف فرضت الصلاة، رقم الحديث: ٣٥٠، انيس

(۲) نيل الأوطار، باب وجوب قراءة الفاتحة: ٢/٢٤٤، دار الحديث مصر. انيس

(۵) مبارکپوری صاحب تحقیق الکلام: ۲۸/۱، میں فرماتے ہیں کہ آیت ﴿وإذا قرئ القراٰن﴾ مکی ہے اور امام کے پیچھے قرأت کرنے کے بارے میں احادیث حضرت ابوہریرہؓ اور حضرت عبادۃ بن الصامت رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے مروی ہیں۔ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سنہ ۷ ہجری میں اسلام لائے اور حضرت عبادہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ انصاری ہیں، اس سے معلوم ہوا کہ قرأت خلف الامام کا حکم مدینہ منورہ میں ہوا ہے، لہٰذا یہ احادیث آیت کے لیے ناسخ ہیں، مولانا میر صاحب نے بھی تفسیر واضح البیان: ۴۵۳ میں یہی لکھا ہے۔

ان حضرات کا ستم ملاحظہ ہو کہ خبر واحد سے نص قرآنی کو منسوخ قرار دے رہے ہیں، پھر قرأت خلف الامام سے متعلق کوئی ایک روایت بھی ایسی نہیں جو صحیح بھی ہو اور صریح بھی، اس کی تفصیل آگے آئے گی۔ (ان شاء اللہ تعالیٰ) ایسی ضعیف، معلول اور مجمل روایات سے نص قرآنی کے نسخ کا دعویٰ برگ گل سے قطع الماس ہے۔

نواب صاحب تحریر فرماتے ہیں: ناسخ مثل منسوخ باشد در قوت بلکہ اقوی ازاں چہ در صورت ضعف مزیل قوی نہ تواند شد وایں حکم عقل ست واجماع برآں دلالت کردہ، چہ صحابہ نص قرآن را بخبر واحد منسوخ نہ کردہ اند۔ (أفادة الشيوخ بمقدار الناسخ والمنسوخ: ۵)

علاوہ ازیں حضرت عبادۃ بن الصامت رضی اللہ عنہ کے مدنی ہونے کی وجہ سے ان کی حدیث کو بھی مدنی قرار دینا غلط ہے، اس لیے کہ آپ بیعت عقبہ اولیٰ وعقبہ ثانیہ دونوں میں موجود تھے، ممکن ہے کہ آپ کی روایت اس وقت کی ہو، پھر مدنی صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم؛ بلکہ خود حضرت ابوہریرہؓ سے بھی منع قرأت کی روایات بھی تو ہیں۔ كما سيأتي

مبارکپوری صاحب نے تحقیق الکلام: ۲۸/۲، میں ایک اور نکتہ بیان فرمایا ہے، جس کا حاصل یہ ہے کہ سورۂ اعراف عقبہ اولیٰ سے بھی قبل نازل ہو چکی تھی؛ کیوں کہ سنہ ۱۰ رنبوی میں پہلے سورہ جن نازل ہوئی، پھر سورۂ اعراف (مجمع البحار: ۵۳۰/۲) اور بیعت عقبہ اولیٰ سنہ ۱۲ رنبوی میں اور بیعت عقبہ ثانیہ سنہ ۱۳ رنبوی میں ہوئی ہے، نیز عقبہ اولیٰ سے قبل نماز باجماعت مشروع نہ تھی؛ اس لیے حضرت عبادہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی یہ حدیث بہرکیف آیت سے متاخر ہے۔

مبارکپوری صاحب کی اس نکتہ رسی پر جتنا بھی تعجب کیا جائے کم ہے، اولاً اس لیے کہ حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ بیعت عقبہ اولیٰ رجب ۱۰ رنبوی میں ہوئی ہے اور عقبہ ثانیہ ۱۲ رنبوی میں۔ (البدایۃ والنہایۃ: ۱۵۹/۳) (۱) ثانیاً امام نووی اور حافظ ابن حجر رحمہما اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ نماز باجماعت ابتداء اسلام ہی سے مشروع ہے۔ (نووی علی مسلم: ۱۸۳/۱۔ فتح الباری: ۶۰/۳)

حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ قبول اسلام کے بعد جب اپنی قوم کی طرف واپس تشریف لے گئے تو نصف قبیلہ نے اسلام قبول کرلیا اور حضرت ایماء بن رحضہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ ان کی امامت کیا کرتے تھے۔ (صحیح مسلم: ۲۹۶/۱،

مستدرک:۵۹۲/۳)؛ حالانکہ حضرت ابوذر رضی اللہ تعالیٰ عنہ بہت قدیم الاسلام ہیں، آپ سے قبل مردوں میں سے صرف حضرت ابوبکر اور حضرت بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہما اور خواتین میں سے صرف حضرت خدیجہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا ایمان لائی ہیں۔ (مستدرک:۳۴۱/۳۔تذکرہ:۱۷/۱۔اکمال:۵۹۴)

علاوہ ازیں اگر بیعت عقبہ اولیٰ سے قبل نماز باجماعت مشروع نہیں تھی تو لازماً یہ بھی تسلیم کرنا پڑے گا کہ ﴿وإذا قرئ القراٰن فاستمعوا له وانصتوا﴾ (۱) بیعت عقبہ اولیٰ کے بعد نازل ہوئی ہے اس لیے کہ اوپر ثابت کیا جاچکا ہے کہ اس آیت کا شان نزول بالاتفاق قرأت خلف الامام ہے، پس حدیث عبادہ رضی اللہ عنہ کا اس آیت سے تاخر ثابت نہ ہوا۔ یہ بحث محض اشباع کلام کے طور پر لکھ دی ہے، ورنہ حقیقت وہی ہے کہ یہ روایات ضعیفہ، غیر صریحہ نص قرآن کے لیے ناسخ نہیں ہوسکتیں۔

(۶) مبارکپوری صاحب فرماتے ہیں کہ اگر یہ بات تسلیم بھی کرلی جائے کہ ﴿فاقرؤا ما تیسّر منه﴾ (الآیة) سے ﴿وإذا قرئ القراٰن﴾ (الآیة) منسوخ نہیں؛ لیکن اس میں نسخ کا احتمال تو موجود ہے، جب اس میں یہ احتمال موجود ہے تو اس سے استدلال کیسے؟ (تحقیق الکلام:۳۶/۲)

مبارکپوری صاحب کا یہ خیال بھی درست نہیں، اس لیے کہ استدلال سے وہ احتمال مانع ہے، جو ناشی عن دلیل ہو، اگر یہاں احتمال نسخ کسی دلیل پر مبنی ہوتا تو امام احمد، حافظ ابن تیمیہ اور حافظ ابن عبدالبر رحمہم اللہ تعالیٰ ودیگر جمہور امت اس آیت سے استدلال نہ فرماتے، حالانکہ اس سے متعلق ہم اوپر امام احمد رحمہ اللہ سے قول اجماع نقل کرچکے ہیں۔

(۷) مبارکپوری صاحب ابکار المنن ص:۱۴۸، تحفۃ الاحوذی:۲۵۸/۱ اور تحقیق الکلام:۳۸/۲ میں اور مولانا میر صاحب تفسیر واضح البیان:۴۳۸ میں ملاجیون اور علامہ تفتازانی کا قول نقل کرکے لکھتے ہیں کہ احناف کے نزدیک ان دونوں آیتوں میں تعارض ہے، اس لیے ﴿وإذا قرئ القراٰن فاستمعوا له وانصتوا﴾ سے استدلال صحیح نہیں۔

ملاجیون رحمہ اللہ تعالیٰ کا حنفی ہونا مسلم ہے، مگر کسی شخصیت پر تحقیق کا مدار نہیں اور علامہ سعدالدین تفتازانی رحمہ اللہ تعالیٰ کو حنفی قرار دینا غلط ہے، آپ شافعی تھے، صاحب کشف الظنون علامہ کاتب چلپی، علامہ حسن چلپی، علامہ سیوطی اور علامہ محمود الکفوی رحمہم اللہ تعالیٰ نے اس کی تصریح فرمائی ہے، بہرکیف کسی شخصیت کے قول سے حقیقت نہیں بدل سکتی۔

ہم اوپر ثابت کرچکے ہیں کہ ﴿فاقرؤ ما تیسّر من القراٰن﴾ متقدم ہے اور ﴿وإذا قرئ القراٰن فاستمعوا له وأنصتوا﴾ (۱) متاخر ہے۔ نیز پہلی آیت نماز تہجد کے بارے میں ہے اور دوسری قرأت خلف الامام کے بارے میں، جب دلائل میں تقدم وتاخر معلوم ہوا اور پھر دونوں کا محل بھی جداگانہ ہو تو قول تعارض کیسے صحیح ہوسکتا ہے؟

(۱-۲) سورة الأعراف:۲۰٤۔

اگر بالفرض ان دونوں آیتوں میں تعارض تسلیم بھی کرلیا جائے تو رفع تعارض کے لیے سب سے پہلے صورتِ تطبیق تلاش کی جاتی ہے، وہ نہ ہوسکے تو ترجیح، پھر تیسرے درجہ میں تساقط کا حکم ہے، ان آیتوں میں صورت تطبیق بھی پائی جاتی ہے اور وجہ ترجیح بھی۔

صورت تطبیق:

ایک صورت تو اوپر بیان ہوچکی ہے کہ ایک آیت میں فرض نماز میں قرأت کا بیان ہے اور دوسری آیت میں نماز تہجد میں قرأت کا حکم ہے، علاوہ ازیں اگر دونوں آیتوں کو نماز فرض ہی سے متعلق فرض کرلیا جائے تو صورت تطبیق یہ ہے:

سورۂ مزمل کی آیت میں امام اور منفرد کو قرأت کا حکم فرمایا گیا ہے اور سورۂ اعراف میں مقتدی کو قرأت سے منع فرمایا گیا ہے، چنانچہ امام بیہقی رحمہ اللہ تعالیٰ نے حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے بسند صحیح روایت کی ہے کہ ﴿**فاقروٗا ما تیسّر**﴾ سے سورہ فاتحہ سے زائد قرأت مراد ہے۔ (کتاب القراءۃ ص:۶،ص:۱۵۳،ص:۱۵۴) امام دارقطنی رحمہ اللہ نے بھی حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے اسی مضمون کی روایت بسند حسن نقل کی ہے۔ (دارقطنی: ۱۲۹/۱)(۱)

مولانا میر صاحب لکھتے ہیں: الغرض آیت ﴿**فاقرؤا ما تیسّر**﴾ میں اگر قرأت سے "**قراءة القراٰن فی الصلاة**" مراد لی جائے تو اس سے مراد فاتحہ کے بعد کی قرأت ہے۔ (تفسیر واضح البیان: ۴۴۵)

چونکہ اہل حدیث بھی مقتدی کے لیے سورہ فاتحہ سے زائد قرأت کی ممانعت کے قائل ہیں؛ اس لیے لازماً اس سے امام یا منفرد مراد ہوگا۔

صورت ترجیح:

اگر بالفرض تطبیق کی کوئی صورت نہ ہوتی تو بلاشبہ سورۂ اعراف کی آیت راجح قرار پاتی؛ اس لیے کہ اوپر روایات صحیحہ اور جمہور امت کی تصریحات سے یہ ثابت کیا جاچکا ہے کہ اس آیت میں مقتدی کو قرأت خلف الامام سے منع فرمایا گیا ہے۔

(۸)　امام بیہقی کتاب القرأۃ ص:۵۷ میں اور مبارکپوری صاحب تحقیق الکلام: ۵۱/۲ میں فرماتے ہیں کہ!

حدیث میں سکوت بمعنی اخفا بھی استعمال ہوا ہے، چنانچہ صحیح بخاری کی روایت ہے کہ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ

(۱)　عن قيس بن أبي حازم قال: صليت خلف ابن عباس بالبصرة فقرأ في أول ركعة بالحمد وأول آية من البقرة ثم قام في الثانية فقرأ الحمد والآية الثانية من البقرة ثم ركع فلما انصرف أقبل علينا فقال: إن اللّٰه تعالىٰ يقول: ﴿فاقرؤا ما تيسر منه﴾. هذا إسناد حسن وفيه حجة لمن يقول: إن معنى قوله ﴿فاقرؤا ما تيسر منه﴾ إنما هو بعد قراء ة فاتحة الكتاب واللّٰه أعلم. (سنن الدارقطني، باب قدر القراء ة في الظهر والعصر والصبح (ح: ۱۲۷۹): ۱۳۶/۲، مؤسسة الرسالة بيروت. انيس)

عنہ نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا ''إسکاتک ما بین التکبیر و القراء ۃ ماتقول؟'' آپ نے فرمایا کہ میں ''اللّٰھمّ باعد بیني و بین خطایای'' إلخ پڑھتا ہوں۔ (صحیح بخاری:۱/۱۰۳)(۱) حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے اس مقام پر آہستہ پڑھنے کو سکوت سے تعبیر فرمایا ہے۔

اسی طرح مستدرک وغیرہ میں روایت ہے: ویسکت بعد القراء ۃ ھنیۃ یسأل اللّٰہ من فضلہ،(۲) اس میں سکوت اور سوال کا اجتماع ہے، لہٰذا امام کے پیچھے آہستہ پڑھنا آیت میں حکم انصات کے خلاف نہیں۔

ان حضرات کی یہ تاویل؛ اس لیے باطل ہے کہ سکوت کے حقیقی معنی مکمل خاموشی ہی کے ہیں۔

قال الإمام الراغب الأصفھاني: السکوت مختص بترک الکلام. (مفردات: ۲۲۵)(۳)

وقال الإمام ابن خالویہ: نزف الرجل إذا انقطعت حجتہ عند المناظرۃ وسکت وأسکت مثلہ. (إعراب ثلاثین سورۃ من القرآن: ۷۶)(۴)

وقال مجد الدین الفیروز آبادی: أسکت انقطع کلامہ فلم یتکلم. (قاموس: ۱/۹۲/ وکذا فی المنجد: ۳۵۲)

وقال الإمام الرازی رحمہ اللّٰہ تعالیٰ: أن السکوت عدمی معناہ أنہ لو یقول شیئًا ولم ینقل أمراً ولم یتصرف فی قول ولا فعل ولا شک أن ھٰذا المعنی عدمی محض. (مناظرات الإمام الرازی: ۳۵)

ائمہ لغت کی ان تصریحات سے ثابت ہوا کہ سکوت کے معنی ترک کلام اور مکمل خاموشی کے ہیں، مگر کبھی مجازاً جہر کے مقابلہ میں بمعنی اخفاء بھی استعمال ہوتا ہے؛ اس لیے کہ حالت جہر میں دوسرے لوگ بھی اس کے کلام کو سن رہے تھے، اس کے بعد اخفاء کی حالت میں سامعین کے نزدیک کلام معدوم ہے؛ کیوں کہ وہ نہیں سن رہے، اس مناسبت سے بوقت قرائن صارفہ عن الحقیقت سکوت بمعنی اخفاء مجازاً آتا ہے۔

قال الإمام أبو بکر الجصاص الرازی رحمہ اللّٰہ تعالیٰ: إنّما سمیناہ ساکتًا مجازاً لأن من لا یسمعہ یظنّہ ساکتاً. (أحکام القرآن: ۳/ ۴۰)(۵)

پس جہاں مجازی معنی مراد لینے کا کوئی قرینہ نہیں ہوگا، وہاں سکوت سے اس کے حقیقی معنی؛ یعنی مکمل خاموشی ہی مراد

(۱) کتاب الأذان، باب: مایقول بعد التکبیر، رقم الحدیث: ۷۴۴، انیس

(۲) عن سعدی بن سمعان قال: أتانا أبو ھریرۃ فی مسجد بنی زریق فقال ثلاثاً: کان رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم یفعلھن ترکھن الناس ''یرفع یدیہ حتی جاوزتا أذنیہ ویسکت بعد القراء ۃ ھنیۃ یسأل اللّٰہ من فضلہ. (المستدرک للحاکم، ومن کتاب الإمامۃ وصلاۃ الجماعۃ (ح: ۷۸۱) انیس)

(۳) المفردات فی غریب القرآن، مادۃ: سکت: ۴۱۶، دار القلم دمشق. انیس

(۴) إعراب ثلاثین سورۃ من القرآن، سورۃ الفجر، دار الکتب المصریۃ. انیس

(۵) باب القراء ۃ خلف الإمام، انیس

ہوگی۔ حقیقی معنی مراد لینے کے لیے کسی قرینہ اور دلیل کی حاجت نہیں ہوتی، مع ہٰذا اقراء ۃ القرآن کے وقت حکم انصات حقیقی معنی ہی میں مستعمل ہے، اس پر یہ دلیل بھی ہے کہ ابتداء نزول وحی میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم حضرت جبرئیل علیہ السلام کے ساتھ خود بھی پڑھا کرتے تھے۔ صحیح بخاری کی روایت میں ہے:

"**وکان ممّا یحرک شفتیه**" اس پر حکم ہوتا ہے: ﴿**لاتحرّک به لسانک لتعجل به**﴾ (الآیة) "**وکان ممّا یحرک شفتیه**" سے ثابت ہوا کہ آپ آہستہ پڑھتے تھے، پھر نص قرآن ﴿**لا تحرّک به لسانک**﴾ میں تصریح ہے کہ زبان تک ہلانے کی بھی اجازت نہیں۔ ثالثاً: آیت مذکورہ میں ﴿**فإذا قرأناه فاتّبع قرانه**﴾ کی تفسیر حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے یوں مروی ہے: "**فاستمع له وأنصت**". (صحیح البخاری: ۳/۱)(۱)

اس سے معلوم ہوا کہ انصات بوقت قرأت کے معنی مکمل خاموشی کے ہیں کہ زبان کو بھی حرکت نہ ہو۔

حضرت مولانا انور شاہ صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ فصل الخطاب: ۸۷ میں حدیث ابی ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے متعلق فرماتے ہیں کہ اس میں سکوت سے مطلقاً سکوت مراد نہیں؛ بلکہ تکبیر تحریمہ سے سکوت مراد ہے، جیسا کہ حضرت زید بن ارقم رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی روایت "**أمرنا بالسکوت**" کی شرح میں حافظ رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ اس حدیث میں حکم سابق یعنی نماز میں کلام وسلام سے سکوت مراد ہے، مطلقاً سکوت مراد نہیں کہ ثناء، آمین، تسمیع، تحمید، تشہد اور درود شریف بھی نہ پڑھو۔ (فتح الباری: ۳/۶۰)(۲)

اسی طرح حدیث مستدرک "**ویسکت بعد القراءۃ هنیة یسأل الله من فضله**" (۳) میں قرأت سے سکوت اور مجمع الزوائد کی روایت "**من صام یوماً من رمضان فی إنصات**" إلخ (۴) میں جھوٹ غیبت وغیرہ لغویات سے سکوت مراد ہے، اذان کا جواب دینا سکوت کے منافی نہیں؛ اس لیے کہ اذان کے ہر کلمہ کے بعد جواب کے لیے وقفہ ہے، بخلاف نماز میں سکتات کے کہ ان کا کسی حدیث سے ثبوت نہیں **کما سیأتی**.

ہم امام بیہقی اور مبارکپوری سے دریافت کرتے ہیں کہ حالت خطبہ میں آپ تسبیح وغیرہ آہستہ پڑھنے کی اجازت کیوں نہیں دیتے اور یہاں حکم سکوت سے سراً پڑھنا کیوں نہیں مراد لیتے؟ قرآن کریم ہی کے الفاظ میں یہ چال کیوں

(۱) کتاب التوحید، باب: قول الله تعالیٰ: ﴿لاتحرک به لسانک﴾ رقم الحدیث: ۷۵۲۴، انیس

(۲) فتح الباری لابن حجر، باب ما ینهی من الکلام فی الصلاۃ: ۳/۷۴، دار المعرفة. انیس

(۳) المستدرک للحاکم، ومن کتاب الإمامة وصلاۃ الجماعة (ح: ۷۸۱)/ وکذا فی السنن الکبریٰ للبیهقی، باب کیفیة رفع الیدین فی افتتاح الصلاۃ: ۲/۴۲ (ح: ۲۳۱۶) انیس

(۴) مجمع الزوائد ومنبع الفوائد، باب احترام شهر رمضان ومعرفة حقه عن ابن عمر أن رسول الله صلی الله علیه وسلم قال: "من صام یوماً من رمضان فی إنصات وسکون بنی له الجنة من یاقوتة حمراء أو زبرجدة خضراء": ۳/۱۴۳، مکتبة القدسی القاهرة. انیس

سوجھی؟ بالخصوص جب کہ آپ اس آیت کا شان نزول خطبہ بتاتے ہیں، کیا یہ کھلا عناد اور صریح بے انصافی نہیں کہ جس آیت سے حالت خطبہ میں ترک کلام ثابت کررہے ہیں، اسی سے حالت نماز میں قرأت سراً کا حکم دے رہے ہیں۔

حالت خطبہ میں تحیۃ المسجد پڑھنا:

امام بخاری رحمہ اللہ تعالیٰ جزء القراءۃ ص:۳۵ میں، امام بیہقی رحمہ اللہ تعالیٰ کتاب القراءۃ ص:۸۴ میں اور مبارکپوری صاحب تحقیق الکلام جلد:۲ میں فرماتے ہیں کہ حالت خطبہ میں سکوت کا حکم اس قدر مؤکد ہے کہ اس وقت امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی بھی اجازت نہیں،'' **لقوله صلّى الله عليه وسلّم إذا قلت لصاحبك يوم الجمعة أنصت والإمام يخطب فقد لغوت.** (البخاري: ۱۲۸/۱۔مسلم: ۲۸۱/۱)(۱) لیکن اس کے باوجود حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ جب کوئی شخص ایسے وقت میں پہنچے کہ امام خطبہ پڑھ رہا ہو تو وہ مختصر طور پر دو رکعتیں پڑھ لے،''**إذا جاء أحدكم يوم الجمعة، والإمام يخطب، فليركع ركعتين وليتجوز فيهما.** (البخاري: ۱۲۱/۱۔مسلم: ۲۸۷/۱)(۲) ان دو رکعتوں میں لازماً قرأت قرآن ہوگی، جس طرح یہ حکم انصات کے منافی نہیں، اسی طرح مقتدی کی قرأت بھی آیت استماع وانصات کے منافی نہیں۔

اس کا جواب یہ ہے کہ جمہور اہل اسلام کے نزدیک حالت خطبہ میں نماز پڑھنا جائز نہیں؛ اس لیے بوقت خطبہ حکم انصات عام ہے، جس طرح خطبہ کی حالت میں کلام کرنا اور ذکر وتسبیح وغیرہ انصات کے خلاف ہونے کی وجہ سے ناجائز ہے، اسی طرح نماز پڑھنا بھی انصات کے منافی ہے؛ اس لیے یہ بھی جائز نہیں، بوقت خطبہ انصات کے حکم عام کے علاوہ بالخصوص نماز سے ممانعت بھی حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہے، چنانچہ ارشاد ہے:

يصلّي ما كتب له، ثم ينصت إذا تكلّم الإمام. (صحيح البخاري: ۱۲۱/۱. مسلم: ۲۸۳/۱. طيالسي: ٦٥)(۳)

وعن نبيشة الهذلي رضي الله تعالىٰ عنه مرفوعاً فإن لم يجد الإمام خرج صلّى ما بدا له، وإن وجد الإمام قد خرج جلس فاستمع وأنصت. رواه أحمد ورجاله رجال الصحيح خلا شيخ أحمد وهو ثقة. (مجمع الزوائد: ۱۷۱/۲)(۴)

---

(۱) الصحيح للبخاري، كتاب الجمعة، باب: الإنصات يوم الجمعة والإمام يخطب (ح: ٩٣٤) بيت الأفكار/ الصحيح لمسلم، كتاب الجمعة، باب: في الإنصات يوم الجمعة في الخطبة (ح: ٨٥١) بيت الأفكار، انيس

(۲) الصحيح للبخاري، باب ماجاء في التطوع مثنىٰ مثنىٰ: ٥٧/٢، بيت الأفكار/الصحيح لمسلم، كتاب الجمعة، باب: التحية والإمام يخطب (ح: ٨٧٥) واللفظ لمسلم، انيس

(۳) الصحيح للبخاري، كتاب الجمعة، باب: الدهن للجمعة (ح: ٨٨٣)/مسند الإمام أحمد، حديث سلمان الفارسي (ح: ٢٣٧٢٥)/مصنف ابن أبي شيبة، في التعجيل إلى الجمعة (ح: ٥٥٢٠)/مسند أبي داؤد الطيالسي، سلمان الفارسي (ح: ٦٩٤)/الصحيح لمسلم، باب فضل من استمع وأنصت في الخطبة (ح: ٨٥٧) انيس

(۴) كتاب الصلاة، باب حقوق الجمعة من الغسل والطيب ونحو ذلك (ح: ٣٠٣٨) دار الفكر، انيس

حدیث بالا میں امام احمد رحمہ اللہ تعالیٰ کے شیخ کا نام علی بن اسحٰق ہے۔ (فتح الملہم: ۴۱۵/۲) امام نسائی، امام ابن معین، حافظ ابن حبان، ابن سعد اور محمد بن حمدویہ رحمہم اللہ تعالیٰ سب ان کی توثیق فرماتے ہیں۔ (تہذیب التہذیب: ۲۸۲/۷) حافظ ابن حجر رحمہ اللہ تعالیٰ نے بھی ان کو ثقہ قرار دیا ہے۔ (تقریب: ۲۶۹) حافظ رحمہ اللہ تعالیٰ مقدمہ فتح الباری میں فرماتے ہیں کہ میں اس کتاب میں صرف صحیح اور حسن روایات ذکر کروں گا، **بشرط الصحة و الحسن فيما أورده من ذٰلک**. (مقدمة الفتح: ٤)

اور حدیث مذکور حافظ رحمہ اللہ نے فتح الباری: ۲۹۷/۲ میں ذکر فرمائی ہے اور اس کی سند پر کوئی کلام نہیں فرمایا، اس سے ثابت ہوا کہ یہ روایت صحیح یا حسن ہے۔

خیر الکلام، ص: ۵۶۳ میں اس کی سند پر یہ اعتراض کیا گیا ہے کہ اس میں عطاء خراسانی ہے، جن کے بارے میں حافظ ابن حجر رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ یہ ارسال، تدلیس اور کثرت وہم کا شکار تھے اور امام بخاری رحمہ اللہ تعالیٰ نے ان کی کوئی حدیث نہیں لی۔ (تقریب: ۱۷۹) نیز فرماتے ہیں کہ یہ بخاری کی شرط پر نہیں۔ (مقدمہ فتح الباری: ۴۳۶) اس لیے علامہ ہیثمی کا قول "**رجاله رجال الصحيح**" وہم ہے۔

درحقیقت یہ علامہ ہیثمی رحمہ اللہ تعالیٰ کا وہم نہیں؛ بلکہ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ تعالیٰ کا وہم ہے، اس لیے کہ صحیح بخاری: ۷۳۲/۲۔۷۹۶ میں عطاء سے روایت موجود ہے اور محدث ابو مسعود دمشقی اور علامہ قسطلانی وغیرہ نے تصریح فرمائی ہے کہ یہ عطاء خراسانی ہیں؛ بلکہ خود حافظ ابن حجر رحمہ اللہ تعالیٰ کی تحریر کے مطابق یہ نسائی، ابوداؤد، ترمذی اور ابن ماجہ کے علاوہ صحیح مسلم کے بھی راوی ہیں۔ (تہذیب التہذیب: ۲۱۲/۷)(۱)

ان نصوص کی بنا پر جمہور صحابہ رضی اللہ عنہم، تابعین اور ائمہ دین رحمہم اللہ تعالیٰ کا مسلک یہ ہے کہ بوقت خطبہ تحیۃ المسجد پڑھنا جائز نہیں، امام نووی رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں حضرت عمر، حضرت عثمان اور حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہم وتابعین رحمہم اللہ تعالیٰ کا یہی مسلک ہے۔ (نووی علی صحیح مسلم: ۲۸۷/۱) امام ترمذی رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ فقہاء ومحدثین کا یہی مسلک تھا۔ (ترمذی: ۶۷/۱) علامہ عراقی رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ حضرت ابن عمر، حضرت ابن عباس، عروۃ بن زبیر رضی اللہ تعالیٰ عنہم اور مجاہد، عطاء بن ابی رباح، سعید بن المسیب، محمد بن سیرین، امام زہری، قتادہ، ابراہیم نخعی اور قاضی شریح رحمہم اللہ تعالیٰ کا بھی یہی مسلک تھا۔ (فتح الملہم: ۴۱۵/۲) فریق ثانی بھی یہ تسلیم کرنے پر مجبور ہے کہ

(۱) عطاء خراسانی کی روایت، مسلم، باب استئذان النبی صلی اللہ علیہ وسلم، حدیث نمبر: ۹۷۷/۷، ابن ماجة، باب التباعد للبراز فی الفضاء، حدیث نمبر: ۳۳۲، سنن ابوداؤد، باب الامام یتطوع فی مکانه، حدیث نمبر: ۶۱۶، سنن ترمذی، باب ماجاء فی فضل الغرس فی سبیل اللہ، حدیث نمبر: ۱۶۳۹، سنن النسائی، غسل المرأة تری فی منامها ما یری الرجل، حدیث نمبر: ۱۹۸ میں موجود ہے، انیس

جمہور کے نزدیک بحالت خطبہ تحیۃ المسجد جائز نہیں، چنانچہ مؤلف خیر الکلام اس مسئلہ میں قول جمہور کے جواب میں فرماتے ہیں کہ جمہوریت حدیث کے معاملہ میں حجت نہیں۔ (خیر الکلام: ۵۶۳)

جناب والا قارئین کو دھوکہ دینا چاہتے ہیں کہ مسلک جمہور حدیث کے خلاف ہے؛ یعنی حدیث صرف وہ ہے، جس کو جناب حدیث کہیں؛ ورنہ صریح وصحیح احادیث جن پر جمہور امت کا عمل ہو، وہ بھی حدیث نہیں؛ بلکہ حدیث کی مخالفت ہے۔

اگر معاذ اللہ جمہور صحابہ، تابعین، محدثین، فقہاء اور ائمہ دین نے حدیث کو نہیں سمجھا، یا عمداً حدیث کی مخالفت کرتے رہے تو قرآن، حدیث اور پورے دین اسلام سے اعتماد اٹھ جائے گا۔

امر بالمعروف اور نہی عن المنکر فرض ہے، جب خطبہ کی حالت میں یہ بھی ممنوع ہے تو نوافل کی اجازت کیسے ہوسکتی ہے؟ تعجب ہے کہ غیر مقلدین قیام جماعت کے بعد فجر کی سنتوں کی اجازت نہیں دیتے، حالانکہ یہ آکد السنن ہیں، مگر بحالت خطبہ تحیۃ المسجد پڑھنے کو جائز قرار دیتے ہیں، پھر یہ کہ خارج جماعت کے لیے بوقت قیام جماعت انصات کا حکم نہیں اور بوقت خطبہ حاضرین کو انصات کا حکم ہے، مع ہذا سنت فجر کو ممنوع اور بوقت خطبہ تحیۃ المسجد کو جائز قرار دینا کیسے صحیح ہوسکتا ہے؟

حدیث جواز کا جواب:

(۱) امام نسائی رحمہ اللہ تعالیٰ نے سنن کبریٰ میں اس حدیث کا ترجمۃ الباب "**باب الصلوٰۃ قبل الخطبۃ**" قائم فرمایا ہے۔ (زیلعی: ۲/۲۰۴)(۱) اس سے ثابت ہوا کہ امام نسائی رحمہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک تحیۃ المسجد پڑھنے کا حکم خطبہ شروع ہونے سے پہلے ہے اور حدیث میں "**یخطب**" بمعنیٰ "**یرید الخطبۃ**" ہے، **کما فی قولہ تعالیٰ**: **یٰأیُّھا الذین اٰمنوا إذا قمتم إلی الصلوٰۃ فاغسلوا وجوھکم**﴾(الآیۃ) امام نووی رحمہ اللہ تعالیٰ "**إذا أمّن الإمام فامّنوا**" کی شرح میں فرماتے ہیں:

"**قالوا معناہ إذا أراد التأمین**". (النووی علی مسلم: ۱/۱۷۴)(۲)

صحیح بخاری کی دوسری روایت میں ہے:

"**والإمام یخطب أو قد خرج**". (صحیح البخاری: ۱/۱۵۶)(۳)

وقال الحافظ رحمہ اللّٰہ تعالیٰ: متفق علیہ. (فتح الباری: ۲/۳۴۱)

---

(۱) نصب الرأیۃ، باب صلاۃ الجمعۃ: ۲/۲۰۴، مؤسسۃ الرسالۃ بیروت/السنن الکبریٰ، الصلاۃ قبل الخطبۃ: ۱/۲۷۲، مؤسسۃ الرسالۃ بیروت. انیس

(۲) کتاب الصلاۃ، باب التشھد فی الصلاۃ، انیس

(۳) أبواب التھجد، باب ما جاء فی التطوع مثنیٰ مثنیٰ، رقم الحدیث: ۱۱۶۶، بیت الأفکار، انیس

اس حدیث سے بھی امام نسائی رحمہ اللہ تعالیٰ کی تحقیق کی تائید ہوتی ہے، اس لیے کہ اس میں راوی بصورت تردد بیان کررہا ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے "یخطب" فرمایا، یا "قد خرج" فرمایا، سامع کو بالعموم تردد الفاظ مترادفہ میں ہوتا ہے، اس سے ثابت ہوا کہ راوی "یخطب" بمعنی "أراد أن یخطب" لے رہا ہے، اس "أو" کو تنویع کے لیے نہیں کہہ سکتے، اس لیے کہ اس صورت میں صرف "یخطب" فرمانا کافی تھا، جب حالت خطبہ میں جواز ثابت ہوگیا تو قبل الخطبہ بطریق اولیٰ خود بخود ثابت ہوجائے گا، لہٰذا "یخطب" کے بعد "أو قد خرج" عبث ہوجاتا ہے، ہاں اگر عبارت برعکس یوں ہوتی: "والإمام قد خرج أو یخطب" تو "أو" بمعنی "بل للترقی" لینے کی گنجائش تھی، نیز اگر "أو" تنویع کے لیے ہوتا تو جمہور صحابہ وتابعین رضی اللہ تعالیٰ عنہم حالت خطبہ میں وغیر خطبہ میں فرق نہ فرماتے؛ بلکہ دونوں صورتوں میں یکساں جواز تحیۃ المسجد کے قائل ہوتے۔

علاوہ ازیں حدیث کے الفاظ "**ولیتجوز فیهما**" میں حکم ہے کہ تحیۃ المسجد مختصر پڑھے، یہ مستقل دلیل ہے کہ یہ حکم اس وقت ہے جب کہ امام خطبہ کے لیے تیار ہو، اگر حالت خطبہ میں بھی نماز جائز ہے اور یہ حکم انصات کے منافی نہیں تو بحالت خطبہ تحیۃ المسجد میں اختصار کا حکم کیوں؟ جب حکم انصات اور تحیۃ المسجد دونوں پر بیک وقت عمل ہورہا ہے تو تحیۃ المسجد خوب اطمینان سے ادا کرنا چاہیے، اختصار کا مقتضی کیا امر ہے؟

(۲)　یہ ایک واقعہ جزئیہ ہے بعض رواۃ نے اس کو عام سمجھ کر نقل بالمعنی کے تحت قاعدہ کلیہ بنادیا، قصہ یہ ہے کہ سلیک عطفانی رضی اللہ تعالیٰ عنہ خستہ حالت میں مسجد میں داخل ہوئے، حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو حکم فرمایا کہ کھڑے ہوکر دو رکعتیں پڑھیں؛ تاکہ لوگ ان کی حالت زار دیکھ کر ان کی امداد کی طرف متوجہ ہوں اور آپ نے لوگوں کو ان پر صدقہ کرنے کی ترغیب دی۔

سنن نسائی میں ہے:

جاء رجل یوم الجمعة والنبی صلّی اللّٰه علیه وسلّم یخطب بهیئة بذة فقال له رسول اللّٰه صلّی اللّٰه علیه وسلّم: "أصلیت؟ قال: لا، قال: صل رکعتین، وحث الناس علی الصدقة. (النسائی: ۱/۱۵۸)(۱)

مسند احمد رحمہ اللہ تعالیٰ میں یہ الفاظ ہیں:

أن هٰذا الرجل دخل المسجد فی هیئة بذة فأمرته أن یصلّی رکعتین وأنا أرجو أن یفطن له رجل فیتصدق علیه. (فتح الباری: ۲/۳۳۷)(۲)

(۱)　کتاب الصلاة، باب حث الإمام علی الصدقة یوم الجمعة فی الخطبة (ح: ۱۴۰۸) مکتبة المعارف، انیس

(۲)　کتاب الجمعة، باب الاستماع إلی الخطبة (ح: ۹۰۷) / مسند الإمام أحمد، مسند أبی سعید الخدری (ح: ۱۱۱۹۷) / السنن الکبریٰ للنسائی، باب إذا تصدق وهو محتاج هل یرد علیه (ح: ۲۳۲۸) انیس

اس روایت کی سند سے متعلق حافظ ابن حجر رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

'وأما قصة سليك رضى الله تعالىٰ عنه فقد ذكر الترمذى أنها أصح شئ روى فى هٰذا الباب وأقوىٰ. (فتح البارى: ۳۳۹/۲)(۱)

بعض روایات میں یہ الفاظ بھی ہیں:

"إركع ركعتين ولا تعد لمثل هٰذا". (الدار قطنى: ۱۶۹/۱)(۲)

اس روایت سے استدلال مقصود نہیں؛ بلکہ صرف تائیداً پیش کی گئی ہے، خود سلیک رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے بھی اس امر کو عام اور قاعدہ کلیہ نہیں سمجھا، اگر وہ اس کو عام قاعدہ سمجھتے تو آئندہ کے لیے وہ اس کی تعمیل میں غفلت نہ کرتے؛ حالانکہ تین جمعہ تک مسلسل یہی واقعہ پیش آتا رہا کہ انہوں نے تحیۃ المسجد از خود ادا نہیں کیا۔

ولأحمد وابن حبان أنه كرر أمره بالصلاة ثلاث مرات فى ثلاث جمع. (فتح البارى: ۳۳۸/۲)(۳)

اس جواب پر حافظ رحمہ اللہ تعالیٰ یوں رد فرماتے ہیں:

"والتعليل بكونه صلّى الله عليه وسلّم قصد التصدق عليه لايمنع القول بجواز التحية، فإن المانعين منها لايجيزون التطوع لعلة التصدق قال ابن المنير فى الحاشية لوساغ ذٰلك لساغ مثله فى التطوع عند طلوع الشمس وسائر الأوقات المكروهة". (فتح البارى: ۳۳۸/۲)(۴)

ابن منیر اور حافظؒ کا یہ اعتراض جب صحیح ہوتا کہ مانعین تحیۃ المسجد تصدق کو حکم کی علت اور مدار قرار دیتے؛ حالانکہ تصدق علت نہیں؛ بلکہ تخصیص کی حکمت ہے۔

نیز تخصیص بھی بحالت خطبہ نماز پڑھنے میں نہیں؛ بلکہ تخصیص اس امر میں ہے کہ ان کی خاطر خطبہ میں تاخیر کی گئی، كما فى رواية الليث عند مسلم رحمه الله تعالىٰ والنبى صلّى الله عليه وسلّم قاعد على المنبر. (فتح البارى: ۳۳۹/۲)(۵)

دارقطنی کی روایت سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے "وأمسك عن الخطبة حتىٰ فرغ من صلاته. (الدار قطنى: ۱۶۹/۱)(۶) یہ روایت بطور استدلال نہیں؛ بلکہ تائید کے لیے پیش کی گئی ہے، مرسل معتمر سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے، دارقطنی کی روایت میں "أمسك عن الخطبة" کے معنی یہ ہیں کہ خطبہ شروع فرمانے سے رک گئے، یہ مطلب نہیں کہ خطبہ پڑھتے ہوئے درمیان میں ٹھہر گئے، صحابی کی شان سے بعید ہے کہ خطبہ شروع ہونے کے بعد مسجد

(۱) كتاب الجمعة، باب الاستماع إلىٰ الخطبة، رقم الحديث: ۹۰۷، انيس
(۲) سنن الدارقطنى، باب فى الركعتين إذا جاء الرجل والإمام يخطب (ح: ۱۶۲۰) انيس
(۳-۵) كتاب الجمعة، باب الاستماع إلىٰ الخطبة، رقم الحديث: ۹۰۷، انيس
(۶) كتاب الجمعة، باب فى الركعتين إذا جاء الرجل والإمام يخطب (ح: ۱۶۱۸) مؤسسة الرسالة، انيس

میں آئے اور پھر مسلسل تین جمعہ تک یہی حال رہے، گزشتہ روایات میں ”قاعد علی المنبر“ اور ”قد خرج“ کے الفاظ نص صریح ہیں کہ تحیۃ المسجد پڑھنے کا حکم خطبہ شروع ہونے سے قبل تھا۔

(۹) مبارکپوری صاحب تحقیق الکلام: ۲/۵۱ میں مجمع البحار سے حدیث ”قرأرسول اللّٰہ صلّی اللّٰہ علیه وسلّم فیما أمر وسکت فیما أمر“ میں ”قرأ“ بمعنی ”جهر“ اور ”سکت“ بمعنی ”أسر“ نقل کرکے فرماتے ہیں کہ آیہ کریمہ: ﴿وإذا قرئ القراٰن﴾ إلخ، میں بھی جہری قرأت مراد ہے؛ اس لیے اس آیت میں صرف جہری نمازوں کا حکم ہے۔

مبارکپوری صاحب کا یہ استدلال اس لیے صحیح نہیں کہ مجمع البحار کا قول حجت نہیں، حدیث کے معنی یہ بھی ہوسکتے ہیں کہ ”قرأحال کونه إماما وسکت حال کونه مؤتما أو قرأ بعد الفاتحة فی الأولین وسکت بعدها فی الأخریین“، چناں چہ صحیح بخاری: ۱/۱۰۷ میں اس کی تصریح ہے کہ ”أخریین“ میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم صرف سورہ فاتحہ پڑھتے تھے۔ اسی طرح آپ کا مؤتم ہونا بھی ثابت ہے، چنانچہ باب البیت کے پاس آپ نے دوروز تک دس نمازیں حضرت جبریل علیہ السلام کی اقتدا میں پڑھیں اور غزوۂ تبوک سے واپسی پر حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ کی اقتدا فرمائی۔ (مسلم: ۱/۱۳۴۔ ابوداؤد: ۱/۲۰)(۱)

اہل قباء میں مصالحت سے واپسی پر نماز عصر میں حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی اقتداء فرمائی، لوگ ابوبکر کو متوجہ کرنے کے لیے تالیاں بجانے لگے، کافی دیر کے بعد آپ کو تنبہ ہوا تو پیچھے ہٹ گئے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز پڑھائی۔ (بخاری: ۲/۱۰۶۶)(۲)

اور اگر مجمع البحار کے بیان کردہ معنی ہی لے لیے جائیں تو اس کا وہی جواب ہوگا جو اوپر: ۸/ میں گزرا، یعنی قرأت بمعنی جہر مجاز ہے، جس کے لیے کسی قرینہ کا وجود ضروری ہے، قرأت کے حقیقی معنی مطلقاً پڑھنے کے ہیں، خواہ جہراً ہو یا سراً، نص قرآن میں کوئی قرینہ صارفہ عن الحقیقۃ نہیں؛ اس لیے اس میں قرأت اپنے حقیقی معنی کے مطابق سراً و جہراً دونوں کو شامل ہے۔

(۱۰) امام بخاری رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ آیت میں استماع وانصات دونوں کا حکم ہے، استماع چونکہ صرف جہری نمازوں ہی میں ہوسکتا ہے؛ اس لیے یہ حکم سری نمازوں کو شامل نہیں، لہٰذا اس سے مانعین قرأت خلف الامام کا علی الاطلاق استدلال صحیح نہ ہوا۔ (جزء القراءۃ، ص: ۹)(۳)

---

(۱) الصحیح لمسلم، باب أوقات الصلوات الخمس (ح: ٦١٣)/سنن أبی داؤد، باب فی المواقیت (ح: ٣٩٣)/ معرفة السنن والآثار للبیهقی، الصلاة بغیر أمر الولی (ح: ٥٩٢٣) جامعة الدراسات الإسلامیة کراتشی. انیس

(۲) الصحیح للبخاری، باب من دخل لیؤم الناس فجاء الإمام الأول (ح: ٦٨٤)/المنتخب من مسند عبد بن حمید، ت: مصطفی العدوی، سهل بن سعد الساعدی (ح: ٤٤٩): ٣٦٤/١، دار بلنشیة للنشر والتوزیع. انیس

(۳) القراء ة خلف الإمام للبخاری، باب هل یقرأ بأکثر من فاتحة الکتاب: ٤٠، المکتبة السلفیة. انیس

یہی مضمون امام بیہقی کتاب القراءۃ:۶۷ میں اور نواب صاحب دلیل الطالب:۲۸۰ میں اور مبارکپوری صاحب ابکار المنن:۱۴۸ اور تحقیق الکلام:۲/۵۱ میں نقل فرماتے ہیں۔

اس کا جواب یہ ہے کہ آیت میں دو حکم ہیں، ایک استماع اور دوسرا انصات، قرأت جہریہ میں استماع وانصات دونوں کا موقع ہے اور قرأت سریہ میں صرف انصات ہوسکتا ہے، اس لیے جہریہ میں استماع مع الانصات کا حکم ہے اور سریہ میں صرف انصات کا۔

انصات کے معنی مطلق سکوت اور ترک کلام کے ہیں، اس کے لیے استماع لازم نہیں، لقوله صلّى الله عليه وسلّم: فإن نأى حيث لا يسمع فانصت ولم يلغ كان له كفل من الأجر، رواه أبوداؤد. (جمع الفوائد: ۱/۲۵۷)(۱)

وفي كنز العمال ممّا رواه عبد الرازق عن زيد بن أسلم رضى الله تعالىٰ عنه مرسلاً وعن عثمان بن عفان رضى الله تعالىٰ عنه موقوفاً أقيموا الصفوف وحاذوا بالمناكب وأنصتوا فإن أجر المنصت الذى لايسمع كأجر المنصت الذى يسمع. (فتح الملهم: ۲/۲۰)(۲)

وقال الحافظ رحمه الله تعالىٰ فى الفتح: وقد وقع التفريق بين الإنصات و الاستماع فى قوله تعالىٰ فاستمعوا له وأنصتوا ومعناهما مختلف فالإنصات هو السكوت وهو يحصل ممن يستمع وممّن لا يستمع كأن يكون مفكراً فى أمر آخر وكذٰلک الاستماع قد يكون مع السكوت وقد يكون مع النطق بكلام آخر لا يشتغل الناطق به عن فهم مايقول الذى يستمع منه. (۳)

وقال فى أبواب التفسير: لاشک أن الاستماع أخص من الإنصات لأن الاستماع الإصغاء و الإنصات السكوت ولايلزم من السكوت الإصغاء. (فتح الملهم: ۲/۲۰)(۵)

وقال الإمام النووى رحمه الله تعالىٰ: فالاستماع الإصغاء والإنصات السكوت ولذا قال الله تعالىٰ: ﴿وإذا قرئ القرآن فاستمعوا له وأنصتوا﴾. (النووى مع مسلم: ۱/۲۸۳)(۵)

وقال البيهقى رحمه الله تعالىٰ: لافرق بين السكوت و الإنصات عند العرب. (كتاب القراءة: ۸٤)

(۱) سنن أبى داؤد، باب فضل الجمعة (ح: ۱۰۵۱) انيس

(۲) كنز العمال، الفصل الثانى فى الإمامة وما يتعلق بها (ح: ۲۰۵٦۹): ۷/٦۲۲، مؤسسة الرسالة/مصنف عبدالرزاق الصنعانى، باب الصفوف (ح: ۲٤٤۱) انيس

(۳) فتح البارى لابن حجر، باب الإنصات للعلماء: ۱/۲۱۷، دار المعرفة بيروت. انيس

(۴) فتح البارى، قوله: فإذا قرأناه فاتبع قرآنه: ۸/٦۸۳، دار المعرفة. انيس

(۵) كتاب الجمعة، رقم الحديث: ۸۵۷، انيس

البتہ مجد الدین فیروز آبادی صاحب قاموس فرماتے ہیں:

"نصت ینصت و انصت و انتصت سکت و الإسم النصتة بالضم و انصته و له سکت له و استمع لحدیثه". (ص:١٥٦)(١)

اور تاج العروس میں ہے:

"و انصته و انصت له إذا سکت له مثل نصحه و نصح له و انصته و انصت له مثل نصحته و نصحت له و الإنصات هو السکوت و الاستماع للحدیث یقال: انصته و انصت له". (۲)

اور مختار الصحاح میں ہے:

"الانصات: السکوت و الاستماع تقول: انصته و انصت له". (۳)

ان عبارات سے بعض کو یہ غلط فہمی ہوئی ہے کہ استماع وانصات دونوں کے ایک ہی معنی ہیں، مگر یہ صحیح نہیں، اس لیے کہ اس صورت میں قرآن کریم میں ایک لفظ کی زیادتی بلا مقصد لازم آئے گی، علماء لغت کی عبارات بالا میں انصات کے معنی سکوت مع الاستماع نہیں بیان کئے گئے؛ بلکہ سکوت والاستماع کہا گیا ہے؛ یعنی اس کے دونوں معنی آتے ہیں، پھر آگے "**انصت و انصت له**" سے وضاحت کر رہے ہیں کہ یہ استماع کے معنی میں جب ہوتا ہے کہ اس کا مفعول یا صلہ "لام" مذکور ہو، قرآن کریم میں ﴿**انصتوا**﴾ کا مفعول یا صلہ مذکور نہیں، لہٰذا اس میں استماع کے معنی نہیں؛ بلکہ مطلق سکوت کے معنی میں ہے، اگر انصات کا بدوں ذکر مفعول وصلہ بھی بمعنی استماع ہونا تسلیم کر لیا جائے تو اس کے دو معنی متعین مستقل ہیں، ایک سکوت دوسرے استماع، ان دونون معانی میں سے حسب قرائن کوئی ایک معنی متعین کئے جا سکتے ہیں، قرآن کریم میں اس سے قبل لفظ ﴿**استمعوا**﴾ کا ذکر اور قرأت سریہ کا قابل استماع نہ ہونا اس پر قرائن ہیں کہ یہاں انصات بمعنی استماع نہیں۔

بلکہ ذکر مفعول وصلہ کے باوجود اس کے دو مستقل معنی بیان کئے گئے ہیں، ایک "**سکت له**"، دوسرے "**استمع لحدیثه، سکت**" اور "**سکت له**" میں یہ فرق ہے کہ اول بدوں داعیہ تکلم سکوت مفرد ہے، مثلاً: کوئی شخص اکیلا بیٹھا ہے، یہ اس لیے خاموش ہے کہ اس کے لیے تکلم کا کوئی داعیہ ہی نہیں اور دوسرے میں داعیہ تکلم ہونے کے باوجود دوسرے شخص کی رعایت سے سکوت ہوتا ہے، گویا یہ سکوت مرکب ہے، پھر دوسرے شخص کی رعایت کی دو صورتیں ہیں: ایک یہ کہ اس کے کلام کو سننا مقصود ہو اور دوسری یہ کہ جو بات یہ کہنا چاہتا ہے، وہی بات اس کی طرف سے کوئی دوسرا کہہ

(۱) القاموس المحيط: ١٦١، فصل النون، مؤسسة الرسالة بيروت. انيس

(۲) تاج العروس، مادة: نصت: ١٢٢/٥، دار الهداية. انيس

(۳) مختار الصحاح، مادة: ن ص ت، ٣١١، المكتبة العصرية بيروت/ وكذا في الصحاح تاج اللغة وصحاح العربية، مادة: نصت: ٢٦٨. دار العلم للملايين، انيس

رہا ہے۔مثلاً: حاکم کے دربار میں درخواست پیش کرنے کے لیے ایک وفد جاتا ہے،ان کا سربراہ درخواست پیش کرتا ہے اور وفد کے دوسرے ارکان خواہ اس کا کلام نہ بھی سن رہے ہوں تو بھی اس لیے خاموش رہتے ہیں کہ ان کا قائد ان کی طرف سے وکالۃً درخواست پیش کررہا ہے۔ **ومن هٰذا القبيل قوله صلّى اللّٰه عليه وسلّم أناخطيبهم إذا انصتوا أى يوم القيامة.** (۱)

مبارکپوری صاحب نے تحقیق الکلام:۴۹/۲ میں ابن ہمام رحمہ اللہ تعالیٰ پر اعتراض کیا ہے کہ ان کا استماع کو جہری نمازوں اور انصات کو سری نمازوں سے متعلق قرار دینا تفسیر بالرائی ہے، جو حرام ہے۔

مبارک پوری صاحب کا یہ اعتراض محض تعنت ہے؛ اس لیے کہ ابن ہمام رحمہ اللہ تعالیٰ کی تفسیر احادیث صحیحہ،لغت اور جمہور مفسرین کی تحقیق پر مبنی ہے۔

امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ تعالیٰ سری نمازوں میں قرأت خلف الامام کے اثبات کی تقریر یوں فرماتے ہیں کہ بدون ذکر وقرأت ودعاء محض سکوت؛ نہ عبادت ہے،نہ مامور بہ؛ بلکہ سبب وساوس ہے،لہٰذا ذکر میں مشغول ہونا سکوت سے افضل ہے اور قرأت قرآن افضل ترین ذکر ہے؛ اس لیے سری نمازوں میں قرأۃ الفاتحہ خلف الامام مستحب ہے۔(فتاویٰ ابن تیمیہ:۱۵۰/۲)

تعجب ہے کہ ابن تیمیہ جب ﴿وإذا قرئ القراٰن﴾ (الآیة) کا شان نزول نماز قرار دے رہے ہیں اور اس پر اجماع نقل کررہے ہیں تو نص قرآنی کے مقابلہ میں اس قیاس آرائی کا کیا جواز؟

علاوہ ازیں ظہر اور عصر کی نماز میں صحیح حدیث کی رو سے تقریباً تیس آیات کی قرأت مسنون ہے اور ابن تیمیہ بھی مقتدی کو سورۂ فاتحہ سے زائد پڑھنے کی اجازت نہیں دیتے، جب اس قدر طویل سکوت مورث وساوس نہیں تو صرف سورۂ فاتحہ کی سات آیات تک مختصر سکوت کو سبب وساوس قرار دینا کیسے صحیح ہے؟

(۱۱)　امام بخاری رحمہ اللہ تعالیٰ جزء القرأۃ،ص:۹، ۲۵ میں، امام ترمذی رحمہ اللہ تعالیٰ سنن ترمذی:۴۲/۱ میں اور امام بیہقی کتاب القراءۃ،ص:۱۷، ۲۹ میں فرماتے ہیں کہ مقتدی کو امام کے سکتات میں سورۂ فاتحہ پڑھنا چاہیے،یہی بات مبارکپوری صاحب نے ابکار المنن،ص:۱۴۸، اور تحقیق الکلام:۵۱/۲ میں تحریر کی ہے اور ان کے دوسرے اتباع نے بھی لکھا ہے،سکتات امام کے اثبات کے لیے مندرجہ ذیل دلائل پیش کیے گئے ہیں۔

(۱)　حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں کہ جو شخص فرض نماز امام کے ساتھ پڑھے وہ امام کے سکتات میں سورۂ فاتحہ پڑھے۔(کتاب القراءۃ،ص:۵۴،مستدرک:۲۳۸/۱)

(۱)　سنن الدارمی،باب ما أعطى رسول اللّٰه صلى اللّٰه عليه وسلم ،الخ (ح: ٤٩) دار المغنی/مسند البزار،مسند أبی حمزة أنس بن مالک (ح: ٦٥٢٣)/السنة لأبی بکر بن الخلال،فضائل نبینا صلی اللّٰه علیه وسلم (ح: ٢٣٥)/ شرح السنة للبغوی،باب فضائل سید الأولین والآخرین (ح:٣٦٢٤)انیس

(۲)　عمرو بن شعیب اپنے والد کے واسطہ سے اپنے دادا سے روایت کرتے ہیں کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم انصات فرماتے تھے، اس میں صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم قرأت کرلیا کرتے تھے۔ (کتاب القراءۃ،ص:۶۹، ۸۶)

(۳)　**بسند عمرو بن شعیب عن ابیه عن جده** روایت ہے کہ جس نے سکتات امام میں سورۂ فاتحہ نہ پڑھی اس کی نماز کامل نہ ہوگی۔ (کتاب القراءۃ،ص:۵۴)

(۴)　حضرت ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما فرماتے ہیں کہ مقتدی امام کے سکتہ کی حالت میں قرأت کرے، اس لیے کہ جس نے قرأت نہ کی اس کی نماز میں خلل واقع ہوگا۔ (کنز العمال:۴/۹۶)

(۵)　حضرت سعید بن جبیر رحمہ اللہ تعالیٰ سلف کا تعامل نقل فرماتے ہیں کہ امام ضرور سکتہ کرتا تھا؛ تاکہ مقتدی قرأت فاتحہ کرلیں۔ (جزء القراءۃ،ص:۵۷)

(۶)　سعید بن جبیر رحمہ اللہ تعالیٰ کا قول مذکور۔ (کتاب القراءۃ،ص:۶۹، ۸۷)

(۷)　حضرت ابو ہریرہؓ یا حضرت ابو سلمہ رحمہ اللہ تعالیٰ سے مروی ہے کہ امام کے لیے دو سکتے ہوتے ہیں، ان کو قرأت فاتحہ کے لیے غنیمت سمجھو۔ (جزء القراءۃ،ص:۵۸، کتاب القراءۃ،ص:۷۰)

(۸)　ہشام بن عروہ کے والد نے ان سے فرمایا کہ جب امام سکتہ کرے، اس وقت قرأت کرلیا کرو اور امام کی قرأت کے وقت خاموش ہوجاؤ؛ اس لیے نماز خواہ فرض ہو، یا نفل بدوں قرأت فاتحہ کے ادا نہیں ہوتی۔ (جزء القراءۃ، ص:۸۵، کتاب القراءۃ،ص:۸۷)

(۹)　حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ امام کے سکتہ میں بدون قرأت فاتحہ نماز مکمل نہیں ہوتی۔ (کتاب القراءۃ،ص:۶۶)

دلائل مذکورہ کے جوابات بالترتیب ملاحظہ ہوں۔

(۱)　حدیث ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ، اس کی سند میں محمد بن عبداللہ بن عبید ابن عمیر ضعیف ہے، امام بخاری رحمہ اللہ تعالیٰ نے ضعفاء:۲۸ میں، امام مسلم رحمہ اللہ تعالیٰ نے صحیح مسلم:۱/۲۰ میں امام یحیٰ القطان سے، امام نسائی رحمہ اللہ تعالیٰ نے ضعفاء صغیر ص:۲۵ میں، امام ترمذی رحمہ اللہ تعالیٰ نے جامع ترمذی:۲/۱ میں، امام دارقطنی رحمہ اللہ تعالیٰ نے دارقطنی:۱/۱۲۱ میں اور خود امام بیہقی رحمہ اللہ تعالیٰ نے کتاب القراءۃ:۵۴ میں ان کی تضعیف کی ہے، امام یحیی بن معین رحمہ اللہ تعالیٰ بھی ان کو ضعیف قرار دیتے ہیں۔ (میزان الاعتدال:۳/۷۷، لسان المیزان:۵/۲۱۶)(۱)

(۱)　سنن الدارقطني، باب وجوب القراءة أم الكتاب في الصلاة:۲/۹۵، مؤسسة الرسالة/الضعفاء الصغير للبخاري:۱/۱۲۲، مكتبة ابن عباس، ت: أبو العينين/الضعفاء والمتروكين للنسائي، باب اللام:۱/۹۱، دار الوعي حلب. انيس

علاوہ ازیں اس حدیث میں صلوٰۃ مکتوبہ کی تخصیص ہے، حالانکہ اہل حدیث کے ہاں نفل نمازوں میں بھی قرأت فاتحہ ضروری ہے۔

(۲)　حدیث عمرو بن شعیب، محدثین میں سند ”عمرو بن شعيب عن أبيه عن جده“ کی تضعیف اور اس کا ناقابل قبول ہونا مشہور ومعروف ہے، عمرو بن شعیب اگر چہ فی نفسہ ثقہ ہیں، مگر جب وہ ”عن أبيه عن جده“ روایت کرتے ہیں تو یہ بالاتفاق قابل قبول نہیں؛ اس لیے کہ ان کو اپنے والد سے سماع حاصل نہیں؛ بلکہ وہ کتاب سے نقل کرتے ہیں، اس سند پر کلام اور اس کی تضعیف مندرجہ ذیل کتب میں ہے:

سنن ترمذی: ۱/۴۳۔ ۱/۸۲، طبقات المدلسین لابن حجر: ۱۱، میزان الاعتدال: ۲/۲۸۹، تہذیب التہذیب: ۸/۵۳۔۵۴، مستدرک حاکم: ۱/۱۹۷، شرح معانی الآثار: ۱/۴۵، محلی ابن حزم: ۱/۲۳۲، اسعاف المبطأ برجال الموطأ: ۲۳۔(۱)

تحفۃ الاحوذی: ۱/۲۶۷ میں لکھا ہے کہ امام احمد اور علی بن المدینی رحمہما اللہ تعالیٰ عمرو ابن شعیب کی روایت کو قابل اعتبار سمجھتے ہیں؛ حالانکہ امام علی بن المدینی تصریح فرماتے ہیں کہ ”عمرو بن شعيب عن أبيه عن جده“ روایت کریں، تو وہ ضعیف ہے۔ (تہذیب التہذیب: ۸/۵۳) اور امام احمد رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: **له أشياء مناكير وإنما يكتب حديثه يعتبر به فإما أن يكون حجة فلا،** نیز فرماتے ہیں: **وربما وجس في القلب منه شئ.** (تهذيب التهذيب: ۸/۴۹)(۲)

تفصیل مذکور سے ثابت ہوا کہ علامہ ذہبی کا عمرو بن شعیب کی روایت کو حسن کہنا، دوسرے طرق کے لحاظ سے ہے، اس سے عن ابیہ عن جدہ کی سند مراد نہیں؛ جیسا کہ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

”**ومن ضعفه مطلقا فمحمول عن روايته عن أبيه عن جده**“. (تهذيب التهذيب: ۸/۵۱)

(۳)　عمرو بن شعیب کی دوسری روایت میں ضعف مذکور کے علاوہ محمد بن عبد اللہ بن عبید بن عمیر بھی واقع ہے، جس کی تضعیف حدیث ابی ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے تحت گزر چکی ہے۔

مذکورہ بالا تین احادیث کے علاوہ جو روایات پیش کی گئی ہیں وہ سب صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم یا تابعین رحمہم اللہ تعالیٰ پر موقوف ہیں؛ حالانکہ اہل حدیث کے ہاں موقوف صحابہ بھی حجت نہیں تو تابعین کی موقوفات کس شمار میں؟ علاوہ ازیں احادیث مذکورہ کی طرح ان آثار میں سے بھی کوئی ایک اثر بھی صحیح نہیں، ان کی تنقیح ملاحظہ ہو۔

---

(۱)　شرح معاني الآثار، باب مس الفرج هل يجب عليه الوضوء أم لا: ۱/۷۵، عالم الكتاب/المستدرك للحاكم، أما حديث الثوري: ۱/۳۱۱، دار الكتب العلمية/العلل الكبير للترمذي، ماجاء في صدقة الفطر: ۱/۱۰۸، عالم الكتاب/إسعاف المبطأ، حرف العين: ۱/۲۳، المكتبة التجارية الكبرىٰ مصر. انيس

(۲)　من اسمه عمرو، مطبعة دائرة المعارف النظامية الهند. انيس

(۴) اثر ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما، درحقیقت یہ اثر عبداللہ بن عمرو بن العاص سے ہے، رواۃ میں سے کسی نے غلطی سے ابن عمر کردیا۔ (کتاب القرأۃ:۴۵)

اس کی سند میں مثنی بن صباح ضعیف ہیں، امام بخاری، امام نسائی، امام احمد، امام ترمذی، دارقطنی، امام یحییٰ بن قطان، ابن المہدی، حافظ ابن حجر، ابن معین، ابن عدی، ابن سعد، علی بن الجنید، حافظ ابن ابان، ساجی، ابواحمد الحاکم، سحنون اور امام عقیلی رحمہم اللہ تعالیٰ نے ان کو ضعیف قرار دیا ہے۔ (الضعفاء الصغير للبخاري: ۳۰، الضعفاء الصغير للنسائي: ۵۳، ميزان الإعتدال: ۷/۳، تهذيب التهذيب: ۳٦/۱۰، تقريب التهذيب: ۳٤٦)(۱)

علاوہ ازیں یہ اثر مجمل ہے، اس لیے کہ اس میں سورۂ فاتحہ کی صراحت نہیں۔

(۵) اثر سعید بن جبیر، اس کی سند میں دو راوی ضعیف ہیں، ایک عبداللہ بن رجاء مکی، امام احمد، ازدی اور ساجی رحمہم اللہ تعالیٰ نے ان کی تضعیف کی ہے۔ (میزان الاعتدال:۲/۳۷، تہذیب التہذیب:۵/۲۱۱)

دوسرے عبداللہ بن عثمان ابن خثیم، امام نسائی، امام ابن معین، امام ابوحاتم، حافظ ابن حبان، امام ابن المدینی، امام دار قطنی رحمہم اللہ تعالیٰ ان کو ضعیف قرار دے رہے ہیں۔ (میزان:۲/۵۶، تہذیب التہذیب:۵/۳۱۵، نصب الرایہ:۱/۳۵۳)(۲)

(٦) سعید بن جبیر کا دوسرا اثر، اس کی سند میں بھی عبداللہ بن عثمان بن خثیم ہیں جن کی تضعیف اوپر کئی ائمہ حدیث سے نقل کی گئی ہے۔

(۷) اثر ابی ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ، اس میں اولاً تو یہ کلام ہے کہ یہ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے یا کہ ابوسلمہ تابعی رحمہ اللہ تعالیٰ سے، رواۃ کو اس میں تردد ہے، علاوہ ازیں اس کی سند میں موسیٰ بن مسعود ضعیف ہے، امام احمد، امام ابن خزیمہ، امام ترمذی، ابوحاتم، بزار، عمرو بن علی الفلاس، ابواحمد الحاکم، امام حاکم، ابن قانع، ساجی اور امام دارقطنی رحمہم اللہ تعالیٰ نے ان کو ضعیف بتایا ہے۔ (میزان الاعتدال:۳/۲۸۱، تہذیب التہذیب:۱۰/۳۷۱)(۳)

---

(۱) العلل ومعرفة الرجال لأحمد رواية إبنه عبدالله: ۲/۲۹۸، دارالخاني الرياض/الضعفاء الكبير للعقيلي، المثنى بن الصباح: ٤/۲٤۹، دارالكتب العلمية/الضعفاء الصغير، ت:أبي العينين: ۱/۱۳۰، مكتبة ابن عباس/الضعفاء والمتروكين للنسائي، باب اللام: ۱/۹۸، دارالوعي حلب/تاريخ أسماء الضعفاء والكذابين، باب الميم: ۱/۱۷۸/ مختصر الكامل في الضعفاء: ۱/۷٤۰، مكتبةالسنة مصر/تهذيب التهذيب، من اسمه المثنى. دائرةالمعارف النظامية/ الضعفاء والمتروكين لابن الجوزي، من اسمه المثنى: ۳/۳٤، دارالكتب العلمية/المغني في الضعفاء، حرف الميم: ۲/۵٤۱/ديوان الضعفاء، المثنى بن الصباح: ۱/۳۳٦، مكتبةالنهضة مكة/ميزان الإعتدال، عمرو بن شعيب بن محمد، الخ: ۳/۲٦۵، انيس

(۲) نصب الرأية، باب صفة الصلاة: ۱/۳۵۳، مؤسسة الريان بيروت. انيس

(۳) المغني في الضعفاء، حرف الميم: ۲/٦۸۷/ميزان، موسى بن مسعود: ٤/۲۲۱، دارالمعرفة. انيس

(۸) اثر ہشام بن عروہ، اس کی سند میں بھی موسیٰ بن مسعود واقع ہیں، جن کی تضعیف تقریباً ایک درجن ائمہ حدیث سے اوپر نقل کی جا چکی ہے۔

علاوہ ازیں اس روایت میں "فصاعداً" کی زیادتی بھی ہے، جس پر غیر مقلدین کا بھی عمل نہیں۔

(۹) اثر ابی ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ، اس کی سند میں اسحٰق بن عبداللہ بن ابی فروہ ضعیف ہے، امام مالک، امام شافعی، امام نسائی، ابوحاتم، ابن حبان، ابوزرعہ، ابن عمار، علی بن المدینی، دارقطنی، برقانی، ابن خزیمہ، خلیلی، بزار، ابن جارود، عقیلی، دولابی، ابوالعرب، ساجی اور ابن شاہین رحمہم اللہ تعالیٰ نے ان کی تضعیف کی ہے۔ (تہذیب التہذیب: ۲۴۱/۱)(۱)

بحث مذکور سے واضح ہو گیا کہ مقتدیوں کی قرأت فاتحہ کے لیے امام کے سکتات کا کوئی ثبوت نہیں، البتہ دو مقام پر سکتہ ثابت ہے، ایک تکبیر تحریمہ کے بعد اور دوسرا سورۂ فاتحہ کے بعد، اول میں تو ظاہر ہے کہ قرأت فاتحہ کا موقع ہی نہیں اور سورہ فاتحہ کے بعد سکتہ صرف اس قدر ہے کہ امام ذرا سانس درست کر سکے، ائمہ حدیث اس کی تصریح فرماتے ہیں:

"حتیٰ یتراد إلیه نفسه". (النسائی: ۱۰۳/۱، أبوداؤد: ۱۱۳/۱، الترمذی: ۳۴/۱، الدارمی: ۱۴۶)(۲)

خود مبارکپوری صاحب فرماتے ہیں:

"بل السکتة الثانیة کانت لأن یتراد إلیه نفسه کما صرح به قتادة". (تحفة الأحوذی: ۲۰۹/۱)(۳)

ان تصریحات سے ثابت ہوا کہ اس سکتہ سے مقتدیوں کو قرأت فاتحہ کی مہلت دینا مقصود نہیں اور نہ ہی اتنے مختصر سکتہ میں اس کی گنجائش ہے، تعجب ہے کہ ہوا پرستی نے سکتہ کو سکتات کیسے بنا دیا؟ کہلائیں پھر بھی اہل حدیث، حافظ ابن قیم رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ کسی صحیح حدیث سے یہ ثابت نہیں کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے محض مقتدیوں کی قرأت فاتحہ کے لیے کبھی سکتہ کیا ہو، (غیث الغمام: ۱۷۵) اس لیے جمہور اہل اسلام ایسے سکتہ یا سکتات کے قائل نہیں، حتیٰ کہ خود غیر مقلدین میں سے اہل انصاف اس کی تردید فرماتے ہیں۔

شیخ الاسلام امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

"ولم نعلم نزاعاً بین العلماء أنه لایجب علی الإمام أن یسکت لقراءة المأموم بالفاتحة

(۱) نصب الرأیة، فصل فی نواقض الوضوء: ۵۷/۱، مؤسسة الریان/الضعفاء والمتروکین للنسائی، باب أسامة وغیره: ۱۹/۱، دار الوعی/الضعفاء والمتروکین للدارقطنی، باب اسحاق: ۲۵۷/۱، مجلة الجامعة الإسلامیة/تهذیب التهذیب، من اسمه إسحاق، انیس

(۲) سنن ابن ماجة، باب فی سکتتی الإمام (ح: ۸۴۴)/سنن الدارمی، باب السکتتین (ح: ۱۲۷۹)/سنن أبی داؤد، باب السکتة عند الإفتتاح (ح: ۷۸۰)/سنن الترمذی، أبواب الصلاة، باب ماجاء فی السکتتین فی الصلاة (ح: ۲۵۱)/انیس)

(۳) أبواب الصلاة، باب ما جاء فی التامین، رقم الحدیث: ۲۴۸، انیس

ولاغيرها،وقرأته معه منهى عنها بالكتاب والسنة.فثبت أنه لا تجب عليه القراء ة معه فى حال الجهر، بل نقول:لوكانت قراء ة المأموم فى حال الجهر والإستماع مستحبة،لا يستحب للإمام أن يسكت لقراء ة المأموم، ولا يستحب للامام السكوت ليقرأ المأموم عند جماهير العلماء، وهٰذا مذهب أبى حنيفة ومالك وأحمد بن حنبل وغيرهم رحمهم اللّٰه تعالٰى". (فتاوى ابن تيمية:٢/٦/١٤٦، تنوع العبادات:٨٥)(١)

محمد بن اسماعیل بن الصلاح امیر یمانی فرماتے ہیں:

ثم اختلف القائلون بوجوب قرأتها...فقيل فى محل سكتات الإمام وقيل فى سكوته بعد تمام قراء ة الفاتحة،ولادليل علٰى هٰذين القولين فى الحديث. (سبل السلام شرح بلوغ المرام:١/١٠٦)

شیخ محمد بن اسماعیل مذکور سے متعلق نواب صدیق حسن خان صاحب فرماتے ہیں:

امام صنعاء وعلامہ یمن وشاعر مجید ومجتہد مفید ومحدث کامل وعارف واصل ست، عامل بود بہ کتاب وسنت بحسب اجتہاد نفس خود وتقید بتقلید احدے از اہل علم نداشت۔ (تقصار جيود الأحرار من تذكار جنود الأبرار:٨٠)(٢)

درایۃً بھی مقتدیوں کے لیے امام کا سکتہ کرنا اصول شرع کے خلاف؛ بلکہ قانون شریعت کا مقابلہ ہے،شریعت نے مقتدیوں کو اتباع امام کا حکم دیا ہے اور مدعیان اتباع حدیث امام کو مقتدیوں کے اتباع کا حکم دے رہے ہیں کہ ان کی خاطر خاموشی اختیار کرے،حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد تو یہ ہے کہ جب امام قرأت کرے تم خاموش رہو،مگر بزعم خویش اہل حدیث کا فیصلہ یہ ہے کہ مقتدیوں کی قرأت کے لیے امام خاموش رہے۔امام ابوبکر الجصاص رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

"وقوله (صلّى اللّٰه عليه وسلّم): وإنماجعل الإمام ليؤتم به فإذاقرأ فأنصتوا،إخبارمنه من أن من الائتمام بالإمام الإنصات لقرأته وهٰذا يدلّ علٰى أنه غيرجائز أن ينصت الإمام لقراء ة المأموم لأنه لو كان مأموراًبالانصات له لكان مأموراً بالائتمام به فيصير الإمام مأمومًاوالمأموم إماماً فى حالةواحدة وهٰذا فاسد". (أحكام القران:٣/٥١)(٣)

(۱۲) صاحب خیر الکلام فرماتے ہیں کہ سورۂ اعراف کی آیت میں انصات سے بالکلیہ خاموشی مراد نہیں؛اس لیے کہ دوسری آیات سے ثابت ہوتا ہے کہ بوقت قرأت قرآن چند جائز کلمات کہنا آیت اعراف کے منافی نہیں۔آیات یہ ہیں:

﴿إِنَّ الَّذِيْنَ أُوْتُوا الْعِلْمَ مِنْ قَبْلِهِ إِذَا يُتْلٰى عَلَيْهِمْ يَخِرُّوْنَ لِلْأَذْقَانِ سُجَّدًا وَيَقُوْلُوْنَ سُبْحَانَ رَبِّنَا إِنْ كَانَ وَعْدُ رَبِّنَا لَمَفْعُوْلاً﴾. (بنى إسرائيل)(٤)

(۱) الفتاوىٰ الكبرىٰ،كتاب الصلاة،مسألة:فى القراء ة خلف الإمام:٢/٢٩٢،دارالكتب العلمية،انيس

(۲) (شیخ محمد بن اسماعیل)امام صنعاء،علامہ یمن،معزز شاعر،اچھے مجتہد،کامل محدث اور پہنچے ہوئے بزرگ ہیں،اپنے اجتہاد سے کتاب وسنت پر عمل کرتے ہیں،کسی دوسرے اہل علم کی تقلید نہیں کرتے ہیں۔انیس

(۳) قوله تعالٰى:خذ العفو وأمربالمعروف (سورة الأعراف:١٩٩)باب القراء ة خلف الإمام،دارإحياء التراث،انيس

(۳) سورة بنى إسرائيل:١٠٧-١٠٨،انيس

﴿وَإِذَا سَمِعُوْا مَا اُنْزِلَ إِلَى الرَّسُوْلِ تَرٰى اَعْيُنَهُمْ تَفِيْضُ مِنَ الدَّمْعِ مِمَّا عَرَفُوْا مِنَ الْحَقِّ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَا اٰمَنَّا فَاكْتُبْنَا مَعَ الشَّاهِدِيْنَ، وَمَا لَنَا لَا نُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَمَا جَاءَ نَا مِنَ الْحَقِّ وَنَطْمَعُ اَنْ يُدْخِلَنَا رَبُّنَا مَعَ الْقَوْمِ الصَّالِحِيْنَ﴾. (المائدة)

﴿اَلَّذِيْنَ اٰتَيْنَاهُمُ الْكِتَابَ مِنْ قَبْلِهٖ هُمْ بِهٖ يُؤْمِنُوْنَ، وَإِذَا يُتْلٰى عَلَيْهِمْ قَالُوْا اٰمَنَّا بِهٖ اِنَّهُ الْحَقُّ مِنْ رَبِّنَا اِنَّا كُنَّا مِنْ قَبْلِهٖ مُسْلِمِيْنَ﴾. (القصص)

ان آیات سے معلوم ہوا کہ بعض جائز کلمات کہنا قرآن کے استماع وانصات کے منافی نہیں۔ (خیر الکلام: ۳۶٦)

ہم اوپر ثابت کر چکے ہیں کہ آیت اعراف کا شان نزول بالاجماع قرأت خلف الامام ہے آیات بالا میں جو کلمات مذکور ہیں وہ نہ تو حالت نماز میں ہیں اور نہ ہی بحکم قرأت قرآن ہیں، نیز کیا پوری سورۂ فاتحہ صرف چند کلمات ہیں؟ درایۃً بھی آیات بالا میں مذکورہ کلمات اور قرأت فاتحہ میں یہ فرق ہے کہ قرأت فاتحہ میں منازعۂ قرآن ہے اور ایسے کلمات کہنا جن میں قرآن کریم پر ایمان اور انقیاد کا اظہار ہو منازعہ نہیں؛ بلکہ متابعت قرآن ہے، مثلاً دربار شاہی میں درخواست پیش کرتے وقت سب حاضرین درخواست کا مضمون پڑھنے لگیں تو خلاف ادب ہے اور اگر ایک شخص درخواست پیش کرتا ہے اور دوسرے اس کی تائید میں کچھ کلمات کہہ دیں تو یہ عین ادب ہے۔

یہاں تک ان تاویلات کے جوابات تھے، جو نص قرآنی: ﴿وإذا قرئ القراٰن فاستمعوا له وأنصتوا﴾ (۳) میں کی جاتی ہیں، آگے فریق مخالف کے بعض الزامات کا حال سنئے، الزامات کی فہرست ذکر کرنے سے قبل ہم یہ حقیقت دوبارہ ذہن نشین کرانا چاہتے ہیں کہ آیت اعراف بالاجماع نماز میں قرأت خلف الامام سے ممانعت کے بارے میں نازل ہوئی ہے، جس کا مفصل بیان اس آیت پر بحث کی ابتداء میں گزر چکا ہے، لہٰذا نماز سے خارج قرأت اور نماز کے اندر غیر مقتدی کی قرأت اور نماز میں قرأت کے سوا، دوسرے اذکار مثلاً ثنا وغیرہ کو یہ آیت شامل نہیں، اس حقیقت کو پیش نظر رکھنے کے بعد فریق مخالف کی طرف سے وارد کردہ الزامات از خود بے حقیقت اور باطل ہو جاتے ہیں، اب ان الزامات کی فہرست ملاحظہ ہو۔

(۱)　امام بخاری رحمہ اللہ تعالیٰ جزء القراءۃ: ۳۵ میں اور مبارکپوری صاحب تحقیق الکلام: ۲/۴۴ میں فرماتے ہیں کہ جب کوئی شخص ایسے وقت میں اقتدا کرنا چاہے کہ امام قرأت شروع کر چکا ہو تو لازماً یہ تکبیر تحریمہ کہے گا اور یہ آیت استماع وانصات کے منافی ہے، لہٰذا آیت مذکورہ پر مانعین فاتحہ خلف الامام کا بھی عمل نہیں۔

(۱)　سورۃ المائدۃ: ۸۳-۸٤، انیس
(۲)　سورۃ القصص: ۵۲-۵۳، انیس
(۳)　سورۃ الأعراف: ۲۰٤، انیس

اس الزام کا بطلان ظاہر ہے کہ تکبیر تحریمہ نہ قرآن ہے اور نہ ہی نماز کے اندر ہے، اس لیے کہ عندالاحناف تکبیر تحریم کا شرط ہے اور شرط مشروط سے خارج اور اس سے مقدم ہوتی ہے۔

(۲) امام بخاری رحمہ اللہ تعالیٰ جزء القراءۃ: ۷-۱۰ میں، امام بیہقی رحمہ اللہ تعالیٰ کتاب القراءۃ: ۱۵۷ میں اور مبارکپوری صاحب تحقیق الکلام: ۴۶/۲ میں فرماتے ہیں کہ مانعین قرأت خلف الامام بھی حالت اقتدا میں ثنا وغیرہ پڑھنے کے قائل ہیں؛ اس لیے یہ آیت استماع وانصات پر عامل نہ رہے۔

احناف کے ہاں مدرک اس لیے ثناء پڑھ سکتا ہے کہ تاحال امام نے قرأت شروع نہیں کی اور مسبوق کو امام کی جہری قرأت کے وقت ثنا پڑھنا جائز نہیں۔ منیہ میں ہے:

"(و)روی (عن الفقیه أبی جعفر الهندوانی) أنه قال إذاأدرک الإمام فی الفاتحة یثنی بالإتفاق".

یہ قول بصیغہ تمریض منقول ہونے کی وجہ سے ضعیف ہے، چنانچہ علامہ حلبی رحمہ اللہ تعالیٰ عبارت مذکورہ کے ذیل میں فرماتے ہیں:

"وإن أدرکه فی السورة یثنی عند أبی یوسف لاعند محمد ذکره فی الذخیرة وهوبعید إذلا فصل فی قولہٖ تعالیٰ: ﴿وإذا قرئ القرآن فاستمعوا له﴾ (الآیة) بین الفاتحة وغیرها بل الأصح هو القول الأول أنه لایأتی به مطلقًالاطلاق النص. (الکبیری، صفة الصلاة: ۲۹۵)

البتہ سری قرأت کے ساتھ ثنا پڑھنے کی اجازت ہے، اس کا جواب وہی ہے کہ منصوص ممانعت صرف قرأت قرآن سے ہے، "لقوله صلّی اللّٰه علیه وسلّم فلا تقرؤا بشئ من القراٰن". (۱)

قاضی شوکانی فرماتے ہیں: "وظاهر التقیید بقوله من القراٰن یدل علیٰ أنه لابأس بالاستفتاح حال قرأة الإمام بما لیس بقراٰن والتعوذ والدعاء". (نیل الأوطار: ۲۴۴/۲) (۲)

اور نواب صدیق حسن خاں صاحب فرماتے ہیں: وایں روایات (فلا تقرؤا بشئ من القرآن وغیرها) ونحو آں دلالت دارند برآنکہ منہی عنہ نزد قرأت امام ہماں قرآن کریم ست فقط واما قراءۃ توجہ واستعاذہ ونحوآں پس لاباس بہ است ونہی متناول آں نیست ونہ بوجہے از وجوہ برآں دلالت دارد۔ (دلیل الطالب: ۲۹۴) (۳)

مولانا عبدالصمد صاحب بھی اعلام الاعلام: ۱۹۲ میں یونہی تحریر فرماتے ہیں:

"روایات کے علاوہ درایۃً بھی یہ امر معقول ہے کہ قرأت امام کے وقت مقتدی کے لیے صرف قرأت ممنوع ہے

(۱) سنن أبی داؤد، باب من ترک القراءة فی صلاته بفاتحةالکتاب (ح: ۸۲۴) انیس

(۲) باب ماجاء فی قراءة المأموم وإنصاته: ۲۵۳/۲، دار الحدیث مصر. انیس

(۳) اور یہ روایت (فلا تقرؤا بشیء من القرآن وغیرها) اور اس جیسی روایات صرف اس بات پر دلالت کرتے ہیں کہ امام کے قرآن کریم کی قرأت کے وقت قرأت کی جائے، البتہ قرأت توجہ، استعاذہ اور اس جیسی چیزیں چنانچہ اس میں کوئی حرج نہیں ہے اور اس پر نہی شامل نہیں ہے اور نہ اس پر دلالت کرتے ہیں۔

ثناء وغیرہ سے ممانعت نہیں، اس لیے کہ سورۃ فاتحہ میں امام سب مقتدیوں کی طرف سے درخواست پیش کرتا ہے لہٰذا مقتدیوں کا ساتھ پڑھنا خلاف ادب ہے، بخلاف ثنا وغیرہ کے کہ وہ دربار میں دخول کے وقت ابتدائی سلام وآداب کی حیثیت رکھتے ہیں اور ان امور میں وکالت ونمائندگی نہیں ہوتی؛ بلکہ ان کی ادائیگی سب حاضرین پر لازم ہوتی ہے"۔

(۳)　امام بخاری رحمہ اللہ تعالیٰ جزء القراءۃ: ۷ میں، امام بیہقی رحمہ اللہ تعالیٰ کتاب القراءۃ: ۱۵۷ میں اور مبارکپوری صاحب تحقیق الکلام: ۴۲/۲ میں فرماتے ہیں کہ مانعین قرأت خلف الامام کے نزدیک امام کی قرأت مقتدی کے لیے کافی ہے، مگر ثنا وغیرہ میں امام کفایت نہیں کرتا، اس سے ثابت ہوا کہ ان کے نزدیک فرض سے غیر فرض کی اہمیت زیادہ ہے۔

اس کا جواب اوپر گزر چکا ہے کہ روایت حدیث کے علاوہ درایت کا مقتضیٰ بھی یہ ہے کہ وکالت اور نمائندگی صرف درخواست پیش کرنے میں ہوتی ہے، آداب بجالانے میں نہیں۔

ان اکابر سے گزارش ہے کہ کیا آپ کے ہاں سورۂ فاتحہ کے سوا باقی پورے قرآن کی اہمیت ثناؤ غیرہ سے کم ہے کہ سورۂ فاتحہ سے زائد قرأت سے منع فرماتے ہیں اور ثنا وغیرہ کا حکم دیتے ہیں۔

قرآن، حدیث اور عقل سلیم کے اس فیصلہ کو خود آپ کے گھرانے میں سے قاضی شوکانی، نواب صاحب اور مولانا عبدالصمد بھی تسلیم کرنے پر مجبور ہیں۔

(۴)　امام بخاری رحمہ اللہ تعالیٰ جزء القراءۃ: ۷ میں فرماتے ہیں کہ فجر کی جماعت ہو رہی ہو تو احناف کے ہاں اس سے قریب ہی سنتیں پڑھنا جائز ہے، یہ آیت استماع وانصات کے منافی ہے۔

یہ الزام اس لیے صحیح نہیں کہ یہ شخص تا حال امام کی اقتدا میں داخل نہیں ہوا۔

(۵)　مبارکپوری صاحب تحقیق الکلام: ۴۳/۲ میں بحوالہ کفایہ: ۶۸/۱ وشرح وقایہ: ۱۷۵/۱ فرماتے ہیں کہ احناف کے نزدیک جب خطیب "یا أیھا الذین اٰمنو صلّوا علیه وسلّموا تسلیما" پڑھے تو سامعین کو آہستہ درود شریف پڑھنا جائز ہے، حالانکہ آیت اعراف خطبہ کو بھی شامل ہے۔

یہ الزام بھی غلط ہے، اس لیے کہ یہ تحقیق تفصیل سے گزر چکی ہے کہ آیت اعراف بالاجماع قرأت خلف الامام سے متعلق نازل ہوئی ہے، نزول آیت کے وقت خطبہ کا تو وجود ہی نہ تھا، حالت خطبہ میں سکوت کا حکم حدیث پر مبنی ہے؛ البتہ چونکہ خطبہ بھی دو رکعت نماز کے قائم مقام ہے، اس لیے بعض حضرات نے اس کو بھی آیت اعراف کے عموم الفاظ میں داخل قرار دیا ہے۔

علاوہ ازیں مذہب حنفی میں محقق اور مفتی بہ قول کے مطابق حالت خطبہ میں سامعین کے لیے درود شریف آہستہ پڑھنا بھی جائز نہیں۔

قال فی الخانیة ومشایخنا قالوا بأنه لایصلّی علی النبی صلّی اللّٰه علیه وسلّم بل یستمع و ینصت لأن الاستماع فرض والصلوٰة علی النبی صلّی اللّٰه علیه وسلّم یمکن بعد هٰذه الحالة. (خانیة علی الهندیة: ۸۷/۱)

وقال العلامة ابن عابدین رحمه اللّٰه تعالی تحت (قوله یصلّی علی النبی صلّی اللّٰه علیه وسلّم عند سماع إسمه فی نفسه) وعن أبی یوسف رحمه اللّٰه تعالیٰ: قلبا ائتمارًا لأمری الإنصات والصلوٰة علیه صلّی اللّٰه علیه وسلّم، کما فی الکرمانی. قهستانی، قبیل باب الإمامة، واقتصر فی الجوهرة علی الأخیر حیث قال: ولم ینطق به لأنها تدرک فی غیر هٰذا الحال والسماع یفوت. (رد المحتار: ۶۸/۱)(۱)

خاتمۃ الکلام:

مسئلہ قرأت خلف الامام پر لکھنے سے قبل بندہ نے اس پر غور کیا کہ اگر اس مسئلہ سے متعلق کسی دوسرے عالم کا کوئی ایسا رسالہ مل جائے، جو جامعیت کے ساتھ مختصر بھی ہو تو بجائے اس کے کہ میں کوئی جدید رسالہ لکھنے پر محنت کروں سائلین کو اسی رسالہ سے استفادہ کا مشورہ دے دیا جائے، مگر اس صفت کا کوئی رسالہ اس وقت میری نظر میں نہیں تھا، مولانا محمد سرفراز خان صاحب صفدر کی کتاب احسن الکلام اس موضوع پر تحقیق اور جامعیت کے لحاظ سے بہت بلند پایہ ہے، مگر بہت طویل ہے، اس لئے میں نے اپنے درس صحیح بخاری کی تقریر کو سامنے رکھ کر اس پر بقدر ضرورت مزید تحقیق کا کام شروع کر دیا، اضافات میں احسن الکلام طبع دوم سے بھی مدد لی گئی ہے، اس میں جن کتابوں کے حوالے دیئے گئے ہیں، ان کی مراجعت سے ثابت ہوا کہ حوالجات کی تحریر میں کتابت کی غلطیاں بہت ہیں، جہاں بدوں کاوش غلطی کا علم ہوگیا، اس کی اصلاح کر دی ہے، ورنہ ویسے ہی نقل کر دیئے ہیں، لہٰذا اہل علم کہیں حوالہ میں جلد یا صفحہ کی غلطی پائیں تو اس کو احسن الکلام میں کتابت کی غلطی پر محمول فرمائیں، مصنف پر اعتماد ہے کہ انہوں نے جس مضمون کی جس کتاب کی طرف نسبت کی ہے، وہ صحیح ہوگی۔

نصوص قرآنیہ کی بحث قریب التکمیل تھی کہ اچانک حضرت مولانا ظفر احمد صاحب قدس سرہ کا رسالہ فاتحۃ الکلام نظر سے گزرا، جو بظاہر میرے مقصد کے مطابق ہے، لہٰذا میں اپنے رسالہ کو یہیں ختم کرتا ہوں اور مسئلہ زیر بحث سے متعلق احادیث کی بحث، احناف کے دلائل اور فریق مخالف کے دلائل کے جوابات کی تفصیل کو فاتحۃ الکلام پر محول کرتا ہوں اور دعا کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ امت مسلمہ کو فروعی مسائل میں الجھنے اور مجتہد فیہ امور میں دماغ وقلم کی صلاحیتیں اور طاقتیں صرف کرنے اور آپس میں دست وگریبان ہونے کی بجائے دشمنان اسلام کی ریشہ دوانیوں اور الحاد واباحت کے فتنوں سے دین اسلام کی حفاظت کے لیے متحدہ مساعی کی توفیق عطا فرمائیں اور "أشدّاء علی الکفار رحمآء بینهم" کا مصداق بنائیں۔ (آمین) فقط واللّٰه المستعان

رشید احمد۔ ۱۲/رمضان المبارک سنہ ۹۸ھ یوم الجمعۃ۔ (احسن الفتاویٰ: ۱۰۵/۳-۱۶۲)

(۱)　کتاب الصلاۃ، باب الجمعة، قبیل مطلب فی حکم المرقی بین یدی الخطیب، انیس

مقتدی اور سورۂ فاتحہ کی قرأت- حنفی مذہب کا موقف کتاب اور سنت کی روشنی میں:

بعد الحمد و الصلوٰۃ!

میرے پاس ایک دوست نے رسالہ تکمیل البرہان فی قراءۃ اُم القرآن ڈاک سے بھیجا، جس کے مطالعہ سے معلوم ہوا کہ مصنف رسالہ نے امام کے پیچھے مقتدیوں پر سورۂ فاتحہ پڑھنے کو فرض لازم قرار دیا ہے اور اپنے نزدیک اس کو اجماعی مسئلہ فرض کیا ہے، چونکہ اس سے مذہب حنفی کی تخفیف مترشح ہوتی ہے، اس لیے مناسب معلوم ہوا کہ اس مسئلہ میں حنفیہ کے دلائل بیان کر دیئے جائیں؛ تاکہ دنیا کو معلوم ہو جائے کہ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کسی مسئلہ میں بے دلیل کوئی بات نہیں کہتے؛ بلکہ کتاب وسنت کی دلیل سے کہتے ہیں۔ دلائل حنفیہ بیان کرنے کے بعد ان الزامات کا جواب بھی انشاءاللہ دیا جائے گا جو اس رسالہ میں حنفیہ پر وارد کئے گئے ہیں۔ **و اللّٰہ المستعان و علیہ التکلان حسبنا اللّٰہ و نعم الوکیل.**

(۱) **قال اللّٰہ تعالیٰ: ﴿و إذا قرئ القراٰن فاستمعوا له و أنصتوا لعلّکم ترحمون﴾** (سورۃ الأعراف: ۲۰۴)

ترجمہ: اور جب قرآن پڑھا جائے تو اس کو (اچھی طرح) سنو اور خاموش رہو امید ہے کہ تم پر رحم کیا جائے۔

ابوداؤد صاحب سنن نے امام احمد بن حنبل سے روایت کیا ہے کہ سب لوگوں کا اس پر اجماع ہے کہ یہ آیت نماز کے بارے میں نازل ہوئی ہے، امام احمد فرماتے ہیں کہ سب لوگ اسی پر ہیں کہ یہ آیت نماز کے بارے میں ہے، سعید بن المسیب، حسن بصری، ابراہیم نخعی، محمد بن کعب اور زہری سب یہی فرماتے ہیں کہ یہ آیت نماز کے بارے میں نازل ہوئی ہے۔ زید ابن اسلم اور ابوالعالیہ بھی یہی کہتے ہیں کہ لوگ امام کے پیچھے قرأت کرتے تھے تو یہ آیت نازل ہوئی:

﴿و إذا قرئ القراٰن فاستمعوا له و أنصتوا﴾.

پھر اس پر اجماع ہے کہ مقتدی پر امام کے پیچھے قرأت لازم نہیں۔ امام احمد فرماتے ہیں کہ ہم نے اہل اسلام میں سے کسی کو یہ کہتے نہیں سنا کہ جب امام جہر سے قرأت کرے تو اس کے پیچھے نماز پڑھنے والوں کی نماز بغیر قرأت کے صحیح نہ ہوگی۔ چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہ وتابعین اور اہل حجاز میں امام مالک، اہل عراق میں سفیان ثوری، اہل شام میں اوزاعی، اہل مصر میں لیث بن سعد ان میں سے کسی نے یہ نہیں کہا کہ جب امام قرأت کر رہا ہو اور مقتدی قرأت نہ کرے تو اس کی نماز باطل ہے۔ (ملاحظہ ہو! مغنی ابن قدامہ: ۱/۶۰۶)

اس سے صاف معلوم ہوا کہ جن احادیث سے مقتدی کے ذمہ امام کے پیچھے قرأت کو فرض بتایا جا رہا ہے وہ امام احمد کے نزدیک صحیح نہیں اور جو صحیح ہیں، وہ منفرد اور امام کے حق میں ہیں، مقتدی کے بارے میں نہیں ہیں؛ جیسا آئندہ واضح ہو جائے گا۔

(۲) مفسر ابن جریر طبری نے میسّب بن رافع سے روایت کیا ہے کہ عبداللہ بن مسعود نے فرمایا: ہم نماز کے اندر ایک دوسرے کو سلام کیا کرتے تھے۔ "سلام علٰی فلان و سلام علٰی فلان"، پھر قرآن میں یہ آیت نازل ہوئی: ﴿وإذا قرئ القراٰن فاستمعوا لہ وأنصتوا﴾. جب قرآن پڑھا جائے تو اس کی طرف کان لگاؤ اور خاموش رہو۔(۱)

(۳) ابن جریر نے ابوعیاض سے روایت کیا ہے کہ ابوہریرہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ لوگ نماز میں کلام کیا کرتے تھے تو جب یہ آیت نازل ہوئی ﴿وإذاقرئ القراٰن﴾ اور دوسری آیت: ﴿قوموا للّٰہ قانتین﴾ تو خاموش رہنے کا حکم کیا گیا۔ دونوں روایتوں کے راوی ثقہ ہیں۔(۲)

یسیر بن جابر سے روایت ہے کہ ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے نماز پڑھی اور بعض لوگوں کو امام کے ساتھ قرأت کرتے ہوئے سنا تو نماز سے فارغ ہو کر فرمایا: کیا تمہارے لیے اس کا وقت نہیں آیا کہ سمجھ لو، کیا اس کا وقت نہیں آیا کہ جان لو کہ جب قرآن پڑھا جائے تو کان لگاؤ اور خاموش رہو؛ جیسا اللہ تعالیٰ نے حکم فرمایا ہے: ﴿وإذا قرئ القراٰن فاستمعوا لہ وأنصتوا﴾ اس کو بھی امام طبری نے روایت کیا ہے اور اس کے سب راوی ثقہ ہیں اور سند صحیح ہے۔(۳)

(۴) امام بیہقی نے مجاہد سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نماز میں قرأت کر رہے تھے تو آپ نے ایک انصاری نوجوان کی قرأت سنی تو یہ آیت نازل ہوئی: ﴿وإذا قرئ القراٰن فاستمعوا لہ وأنصتوا﴾ (۴) بیہقی نے اس کی سند پر کوئی جرح نہیں کی صرف اتنا کہا کہ یہ مرسل ہے اور یہ مرسل ہمارے یہاں حجت ہے اور جب اس کی تائید دوسرے مراسیل وغیرہ سے ہو جائے تو سب کے نزدیک حجت ہے۔(۵)

مفسر طبری نے اسی کے موافق زہری سے بھی مرسلاً روایت کیا ہے کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کچھ پڑھتے تو ایک انصاری نوجوان بھی ساتھ ساتھ پڑھتا تھا اور اس پر یہ آیت نازل ہوئی:

﴿وإذا قرئ القراٰن فاستمعوا لہ وانصتوا﴾.(۶)

(۱-۳) تفسیر الطبری، القول فی تأویل قولہ: ﴿وإذا قرئ القراٰن فاستمعوا لہ وأنصتوا لعلکم ترحمون﴾ سورۃ الأعراف: ۲۰۴، ذکر من قال ذلک: ۱۰/۶۵۴ - ۶۵۹، دار ھجر للطباعۃ والنشر، انیس

(۴) السنن الکبریٰ للبیھقی، باب من قال یترک المأموم القراءۃ فیما جھر (ح: ۲۸۸۶) انیس

(۵) قال أبوبکر: مذھب أصحابنا أن مراسیل الصحابۃ والتابعین مقبولۃ وکذلک عندی: قبولہ أتباع التابعین بعد أن یعرف بإرسال الحدیث عن العدول الثقات. (الفصول فی الأصول، باب القول فی الخبر المرسل: ۳/۱۴۵، وزارۃ الأوقات الکویتیۃ. انیس)

(۶) تفسیر الطبری، القول فی تأویل قولہ: ﴿وإذا قرئ القراٰن فاستمعوا لہ﴾ ذکر من قال ذلک: ۱۰/۶۵۹، انیس

(۵)　حافظ ابن مردویہ نے اپنی تفسیر میں معاویہ بن قرہ سے روایت کیا ہے کہ میں نے بعض صحابہ سے دریافت کیا، عبدالرحمٰن مسروقی (راوی) کہتا ہے کہ میرا گمان یہ ہے کہ وہ عبداللہ بن مغفل ہیں، ان سے میں نے کہا: کیا ہر شخص پر جو قرآن سنے، اس کا سننا اور خاموش رہنا واجب ہے، فرمایا کہ یہ آیت: ﴿وإذا قرئ القرآن فاستمعوا له وانصتوا﴾ قرأت خلف الامام کے بارے میں نازل ہوئی ہے کہ جب امام قرأت کرے تو سنو اور خاموش رہو۔(۱)

اس کے تمام راوی ثقہ ہیں، صرف ابوالمقدام ضعیف ہے، مگر اس سے وکیع اور زید بن الحباب ونضر بن شمیل ویزید بن ہارون جیسے ائمہ حدیث روایت کرتے ہیں (تو وہ ایسا ضعیف نہیں، جس کی روایت رد کردی جائے، خصوصاً جب کہ اس کی تائید میں بہت سے آثار موجود ہیں)۔

امام بیہقی نے ابوالعالیہ سے مرسلاً روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب نماز میں قرأت کرتے، صحابہ بھی قرأت کرتے تھے تو آیت نازل ہوئی ''فاستمعوا له وأنصتوا'' (حضور کی قرأت کو سنو اور خاموش رہو) پھر لوگ خاموش رہتے اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم قرأت کرتے۔ (ان تمام آثار و احادیث کی جو اس مضمون میں مذکور ہیں سندوں کی مفصل تحقیق اعلاء السنن میں مذکور ہے؛ جس کو شوق ہو، وہیں دیکھ لے)۔(جزء القراءۃ:۷۴)(۲)

بیہقی نے اس کے راویوں پر کوئی جرح نہیں کی صرف اتنا کہا کہ یہ منقطع (یعنی مرسل) ہے اور مرسل ہمارے یہاں حجت ہے۔

(۶)　امام بیہقی نے جزء القراءۃ میں عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ مومن قرآن کی طرف کان لگانے سے وسعت میں ہے (چاہے سنے یا نہ سنے) مگر نماز فرض میں اور جمعہ وعید الفطر اور عید الاضحیٰ کے دن؛ یعنی (ان نمازوں میں) جب قرآن پڑھا جائے تو قرآن کو سنو اور خاموش رہو۔(ص:۷۳)

(ف)　ابن عباس کا مذہب یہ معلوم ہوتا ہے کہ نماز کے علاوہ قرأت کا سننا واجب نہیں، اس میں فقہا کا اختلاف ہے، ایک قول حنفیہ کا بھی اس کے موافق ہے۔ دوسرا قول یہ ہے کہ خارج صلوٰۃ بھی قرأت قرآن کے لیے خاموش رہنا اور سننا واجب ہے، اس میں احتیاط ہے؛ کیوں کہ آیت قرآن کا شان نزول اگرچہ قرأت خلف الامام ہے، مگر الفاظ مطلق ہیں۔

(۷)　محمد بن کعب قرظی (امام تفسیر وحدیث) سے روایت ہے کہ صحابہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ

---

(۱)　كذا في تفسير ابن أبي حاتم، الوجه الثاني: ۱۶۴۶/۵، مكتبة مصطفى نزار البابي/الكنىٰ والأسماء للدولابي، من كنيته أبو المقدام (ح:۱۸۵۹). انيس

(۲)　إعلاء السنن، باب قوله تعالىٰ: إذا قرىء القرآن فاستمعوا له وانصتوا والنهي عن القراءة خلف الإمام في الجهرية والسرية واكتفاء المأموم بقراءة الإمام، ج:۴/من ص:۵۰. إلى إخر البحث، مطبوعة إدارة القرآن. انيس

ساتھ پڑھا کرتے تھے یہاں تک کہ سورۂ اعراف کی آیت نازل ہوئی: ﴿وإذا قرئ القراٰن فاستمعوا له وأنصتوا﴾. (جزء القرءة، ص: ٧٤) بیہقی نے اس کی سند میں کوئی علت بیان نہیں کی؛ بلکہ سکوت کیا ہے۔

(ف) مفسر ابن جریر طبری نے اپنی تفسیر میں اس آیت کے متعلق متعدد آثار بیان کرکے فرمایا ہے کہ سب اقوال میں صحت وصواب کے زیادہ قریب ان لوگوں کا قول ہے، جو کہتے ہیں مقتدیوں کو نماز میں قرآن سننے کا حکم دیا گیا ہے، جب امام قرأت کرے اور لوگ اس کے پیچھے اقتداء کر رہے ہوں اور خطبہ سننے کا امر کیا گیا ہے، ہم نے اس قول کو زیادہ صحیح اس لیے کہا ہے کہ حدیث صحیح سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد ثابت ہے کہ آپ نے فرمایا: ﴿إذا قرأ الإمام فأنصتوا﴾. جب امام قرأت کرے تو خاموش رہو اور سب (علما) کا اس پر اتفاق ہے کہ جو شخص جمعہ کا خطبہ امام سے سنے اس پر سننا اور خاموش رہنا واجب ہے، اجماع کے علاوہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے احادیث میں بھی بتواتر اس کا امر وارد ہے اور ان دو حالتوں کے سوا اور کسی حالت میں قرآن کا سننا اور قرأت کے لیے خاموش رہنا واجب نہیں، اگر چہ ایک صورت میں اختلاف ہے، جب کہ مقتدی امام کے پیچھے ہو (بعض علما اس پر خاموش رہنے کو واجب نہیں کرتے بلکہ قرأت فاتحہ کو واجب کہتے ہیں)، مگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے حدیث صحیح میں ثابت ہو چکا ہے کہ آپ نے فرمایا کہ جب امام قرأت کرے خاموش رہو، پس امام کے پیچھے اس کی قرأت کے لیے خاموش رہنا، ان لوگوں پر واجب ہے، جو اس کے مقتدی ہوں اور قرأت سن رہے ہوں؛ بوجہ ظاہر قرآن کے عموم اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث مذکور کے۔ (۲۹/۹)(۱)

اس تقریر سے یہ امر واضح ہے کہ امام ابن جریر طبری جن کو شافعی المذہب کہا جاتا ہے، نماز جہری میں مقتدی کے ذمہ قرآن سننے اور خاموش رہنے کو واجب سمجھتے ہیں اور نماز سری میں قرأت مقتدی کو جائز سمجھتے ہیں اور زیادہ اختلاف نماز جہری میں ہے، نماز سری میں زیادہ اختلاف نہیں؛ جیسا آئندہ واضح ہو جائے گا، اگر چہ حنفیہ کے پاس اس کے بھی دلائل موجود ہیں کہ سری نماز میں بھی مقتدی کو امام کے پیچھے قرأت نہ کرنا چاہیے؛ کیوں کہ قرآن میں دو حکم ہیں: ایک **استمعوا** (کہ امام کی قرأت کو سنو)، یہ تو جہری نماز کے ساتھ خاص ہے۔ دوسرا حکم ہے: **أنصتوا** (کہ قرأت امام کے وقت خاموش رہو)، یہ جہری اور سری دونوں نمازوں کو شامل ہے، پس اگر مقتدی سری نماز میں حکم استماع پر عمل نہیں کر سکتا تو حکم انصات پر تو عمل کر سکتا ہے، اس کو کس لیے ترک کرتا ہے، اس کے علاوہ احادیث وآثار بھی آئندہ بیان کئے جائیں گے، جن سے مقتدی کے ذمہ امام کے پیچھے مطلقاً خاموش رہنے کا وجوب ثابت ہے، خواہ جہری ہو یا سری۔

---

(۱) تفسیر الطبری، القول فی تأویل قوله: ﴿وإذا قرئ القراٰن فاستمعوا له وأنصتوا لعلكم ترحمون﴾ سورة الأعراف: ٢٠٤، ذكر من قال ذلك: ٦٦٦/١٠، دار هجر للطباعة والنشر، انیس

یہاں یہ بات بھی سمجھ لینی چاہیے کہ جن صحابہ یا تابعین نے آیت: ﴿وإذا قرئ القرآن فاستمعوا له وأنصتوا﴾ کے شان نزول میں خطبہ جمعہ کا ذکر کیا ہے، ان کا مطلب یہ ہے کہ بعد میں خطبہ جمعہ کو بھی اس آیت کے تحت داخل کرلیا گیا ہے؛ کیوں کہ جملہ مفسرین وقراء ومحدثین کا اس بات پر اتفاق ہے کہ سورۂ اعراف مکی ہے۔ بیضاوی نے صرف آٹھ آیتوں کو مستثنیٰ کیا ہے جو ﴿إذ نتقنا الجبل﴾ سے شروع ہوتی ہیں، جن میں یہ آیت: ﴿وإذا قرئ القرآن فاستمعوا له﴾ داخل نہیں، یہ بالاتفاق مکی ہے اور مکہ میں جمعہ قائم نہیں ہوا تھا، نہ وہاں جمعہ کا خطبہ ہوا تو اس کو شان نزول میں کیسے بیان کیا جاسکتا ہے؟ پس صحیح یہی ہے کہ یہ آیت قرأت خلف الامام کے بارے میں نازل ہوئی ہے اور خطبہ کا حکم بھی نماز کی طرح ہے، اس کے بعد امام بیہقی کا یہ فرمانا کہ اس آیت میں مقتدیوں کو امام کے پیچھے دنیوی باتیں کرنے یا جہر کے ساتھ قرأت کرنے سے منع کیا گیا ہے، سورۂ فاتحہ آہستہ پڑھنے سے منع نہیں کیا گیا، درست نہیں ہے؛ کیوں کہ ظاہر ہے کہ آیت کے الفاظ فاتحہ وغیرہ سب کو شامل ہیں۔ آیت میں انصات کا حکم ہے، جس کے معنی بالکل خاموش رہنے کے ہیں، جو فاتحہ سے بھی خاموش رہنے کو مقتضی ہے، پھر ہم پوچھتے ہیں: کیا امام بیہقی خطبہ کی حالت میں آہستہ آہستہ ذکر اللہ اور تسبیح وغیرہ پڑھنے کی اجازت دے دیں گے؟ اگر نہیں تو وہاں اس آیت سے مطلقاً خاموشی واجب ہونے پر استدلال کیوں کر صحیح ہوگیا؟ اگر اجازت دیں گے تو ان کے مذہب کے بھی خلاف ہوگا اور اجماع کے بھی خلاف ہے، خطبہ جمعہ میں کسی کے بھی نزدیک خطبہ سننے والے کو ذکر اللہ اور تسبیح پڑھنا جائز نہیں، نہ آہستہ، نہ زور سے، پس حیرت ہے کہ خطبہ میں تو مطلقاً ذکر وتلاوت وغیرہ کو منع کیا جائے؛ سراً بھی اور جہراً بھی اور نماز میں قرأت سریہ کو جائز کہا جائے، حالاں کہ اس پر اجماع ہے کہ آیت اعراف: ﴿وإذا قرئ القرآن فاستمعوا له وأنصتوا﴾ کا نزول قرأت خلف الامام کے بارے میں ہوا ہے، اگر یہ کہا جائے کہ خطبہ کے لیے احادیث میں انصات کی تاکید ہے تو ہم کہیں گے کہ نماز کے اندر مقتدی کو انصات کی تاکید قرآن میں بھی ہے اور حدیثوں میں بھی؛ جیسا آئندہ معلوم ہوجائے گا۔

(۸)　ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"إذا قرأ (أی الإمام) فأنصتوا". جب امام قرأت کرے تو خاموش رہو، اس کو امام مسلم نے روایت کیا ہے، (۱) اور حافظ ابن حجر نے فرمایا حدیث صحیح ہے، (۲) اور امام احمد نے بھی اس کو صحیح کہا ہے، جیسا حافظ ابن عبد البر نے تمہید میں بیان کیا، (۳) اور امام ابوجعفر طبری کا قول گزر چکا ہے: "وقد صح الخبر عن رسول الله صلى الله عليه

(۱)　الصحیح لمسلم، باب التشهد فی الصلاة (ح: ٤٠٤) انیس

(۲)　النووی شرح مسلم، باب التشهد فی الصلاة: ١٢٢/٤، دار إحیاء التراث العربی بیروت. انیس

(۳)　التمهید لما فی الموطأ من المعانی والأسانید، الحدیث التاسع والثلاثون: ٣٤/١١، وزارة أمور الأوقاف والشئون الإسلامیة، المغرب. انیس

وسلّم من قوله: إذا قرأ الإمام فانصتوا" کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے صحیح حدیث میں یہ ثابت ہو چکا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جب امام قرأت کرے تو خاموش رہو۔ اس حدیث کو امام احمد بن حنبل نے بھی اپنی مسند میں امام مسلم کی سند سے ابوموسیٰ اشعری سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہم کو تعلیم دی ہے کہ جب تم نماز کو کھڑے ہو تو ایک آدمی امام بنے اور جب امام قرأت کرے تو خاموش رہو۔(۱) صحیح ابوعوانہ میں اس حدیث کو عبداللہ بن رشید سے ابوعبیدہ (مجاعۃ بن زبیر عتکی) سے قتادہ سے یونس ابن جبیر سے حطان بن عبداللہ رقاشی سے ابوموسیٰ اشعری سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جب امام قرأت کرے تو خاموش رہو اور جب "**غیر المغضوب علیهم ولا الضالین**" کہے تو آمین کہو۔(۲) اس میں سلیمان تیمی کی متابعت ابوعبیدہ نے کی ہے، وہ بھی قتادہ سے سلیمان تیمی کی طرح "**إذا قرأ الإمام فأنصتوا**" روایت کر رہا ہے اور ابوعبیدہ ثقہ ہے، انساب سمعانی میں عبداللہ بن رشید اور ابوعبیدہ دونوں کو مستقیم الحدیث کہا ہے۔(۳) دارقطنی نے بھی اپنی سنن میں اس حدیث کو روایت کیا ہے، ان کی سند میں عمر بن عامر اور سعید بن ابی عروبہ نے قتادہ سے سلیمان تیمی کی طرح "**وإذا قرأ فانصتوا**" روایت کیا ہے۔(۴) عمر بن عامر امام مسلم کے راویوں میں سے ہے، اسی طرح اس کا شاگرد سالم بن نوح بھی رجال مسلم میں ہے، امام مسلم اور ابن خزیمہ اور ابن حبان اپنی صحیح میں اس سے روایت کرتے ہیں۔(۵) پس بعض محدثین کا یہ کہنا کہ قتادہ کے شاگردوں میں سے صرف سلیمان تیمی نے اس حدیث میں "**إذا قرأ الإمام فانصتوا**" زیادہ کیا ہے، غلط ہے۔ قتادہ کے تین شاگردوں نے جو ثقہ ہیں، سلیمان تیمی کی موافقت کی ہے، پھر امام مسلم سے جب ان کے شاگرد نے سوال کیا کہ اس حدیث میں "**إذا قرأ فانصتوا**" صحیح ہے؟ امام مسلم نے جواب دیا: "**ترید أحفظ من سلیمان**" کیا تم سلیمان سے بڑھ کر حدیث کا حافظ چاہتے ہو؟ یعنی وہ کامل الحفظ، تام الحفظ، تام الضبط ہے، اس کا تفرد مضر نہیں (اگر چہ وہ منفرد بھی ہوتا؛ حالانکہ وہ اس زیادت میں منفرد نہیں، اس کی متابعت و موافقت کرنے والے دوسرے حفاظ ثقات بھی ہیں)۔

(۹) حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: امام اسی لیے بنایا

---

(۱) مسند الإمام أحمد، حدیث أبی موسیٰ الأشعری (ح:۱۹۷۲۳) انیس

(۲) مستخرج أبی عوانة، بیان إجازة القراءة خلف الإمام (ح:۱٦۹۸) انیس

(۳) الأنساب للسمعانی، الجندیسابوری: ۳۴۹/۳، مجلس دائرة المعارف العثمانیة حیدرآباد. انیس

(۴) سنن الدارقطنی، باب ذکر قوله صلی اللّٰه علیه وسلم من کان له إمام، الخ (ح:۱۲۴۹) انیس

(۵) الصحیح لمسلم، باب فضل السحور: ۷۷۱/۲، دار إحیاء التراث العربی/صحیح بن خزیمة، باب تأخیر السحور: ۲۱۵/۳، المکتب الإسلامی بیروت/صحیح ابن حبان: ۲٦۹/٦، مؤسسة الرسالة. انیس

گیا ہے کہ اس کی اقتدا کی جائے، سو جب وہ ''اللہ اکبر'' کہے، تم بھی ''اللہ اکبر'' کہو اور جب وہ قرأت کرے تو خاموش رہو اور جب ''سمع اللّٰه لمن حمده'' کہے تو ''ربنا لک الحمد'' کہو، اس کو نسائی نے روایت کیا ہے اور امام مسلم نے اپنی صحیح میں اس کو صحیح کہا ہے اور امام احمد ابن حنبل اور ابن حزم نے بھی اس کو صحیح کہا ہے۔ (جوہر نقی) (۱)

(ف) پس امام ابوداؤد کا یہ فرمانا کہ {اس حدیث میں ''وإذا قرأ فانصتوا'' کی زیادت محفوظ نہیں، ہمارے نزدیک ابوخالد نے وہم کیا ہے} صحیح نہیں؛ کیوں کہ ابوخالد احمر مسلم و بخاری کے رجال میں سے ہیں، دونوں اس سے احتجاج کرتے ہیں، پھر ابوخالد احمر کی متابعت بھی موجود ہے، محمد بن سعد انصاری نے بھی ابن عجلان سے اس حدیث کو ابوخالد احمر کی طرح ''إذا قرأ فانصتوا'' کے ساتھ روایت کیا ہے، سنن نسائی میں یہ متابعت موجود ہے اور امام نسائی نے محمد بن سعد کی توثیق کی ہے۔ (۲) امام ابن جریر طبری نے بھی اس کو صحیح کہا ہے۔ پس انصاف یہ ہے کہ اس حدیث میں بجز ان لوگوں کے جو قرأت فاتحہ خلف الامام کے قائل ہیں کسی نے جرح نہیں کی اور اصول حدیث کے لحاظ سے ان کی جرح صحیح نہیں؛ کیوں کہ اول تو اصولی طور پر زیادت ثقہ مقبول ہے، دوسرے جس راوی کو زیادت میں منفرد کہا جارہا ہے، اس کی متابعت دوسرے ثقات نے بھی کی ہے۔ اب سمجھنا چاہیے، حدیث سے معلوم ہوا کہ امام اس لیے بنایا جاتا ہے کہ اس کا اتباع کیا جائے اور قرآن پڑھنے والے کا اتباع یہی ہے کہ خاموشی کے ساتھ اس کو سنا جائے، یہی سورۂ اعراف کی آیت: ﴿وإذا قرئ القراٰن فاستمعوا له وانصتوا﴾ کا مدلول ہے۔ یہی دوسری آیت ﴿وإذ صرفنا إليک نفراً من الجنّ يستمعون القراٰن فلما حضروه قالوا: انصتوا﴾ (۳) (ترجمہ: اور جب ہم نے آپ کے پاس جنوں کی ایک جماعت کو متوجہ کیا کہ قرآن سنیں، جب وہ قرآن سننے کے لیے حاضر ہوئے تو آپس میں کہنے لگے: خاموش رہو) یہی تیسری آیت ({نزول وحی کے وقت} ''اپنی زبان کو حرکت نہ دیا کیجئے؛ تاکہ جلدی یاد کرلیں، ہمارے ذمہ ہے اس کا (آپ کے دل میں) جما دینا اور اسکا پڑھا دینا تو جب ہم (بزبان جبریل) قرآن پڑھیں تو اس کے پڑھنے کا اتباع کیجئے''، عبداللہ بن عباس نے اتباع کی تفسیر میں فرمایا ہے کہ سنئے اور خاموش رہئے۔ (بخاری:۲۲۳)

اس سے معلوم ہوا کہ قرآن پڑھنے والے کا اتباع یہی ہے کہ اس کی طرف کان لگائے اور خاموش رہے۔ ﴿لا تحرّک به لسانک لتعجل به أن علينا جمعه وقراٰنه فإذا قرأناه فاتّبع قراٰنه﴾ (قال ابن عباس فی

(۱) الصحيح لمسلم، باب التشهد فی الصلاة (ح: ٤٠٤) / سنن النسائی، تأويل قوله عزوجل: وإذا قرئ القرآن، الخ (ح: ٩٢١) / مسند الإمام أحمد، مسند أبی هريرة رضی اللّٰه عنه (ح: ٨٨٨٩) / المحلی بالآثار، مسألة قراءة المأموم خلف الإمام: ٢٧٠/٢، دارالفكر بيروت / الجوهر النقی: ١٥٦/٢، دارالفكر بيروت. انيس

(۲) سنن النسائی، تأويل قوله عزوجل: وإذا قرئ القرآن، الخ (ح: ٩٢٢) انيس

(۳) سورة الأحقاب: ٢٩، انيس

تفسیره فاستمع له وانصت، کما فی البخاری (۱) کا مدلول ہے، اسی مفہوم کو ابو موسی اشعری اور ابو ہریرہ رضی اللہ عنھما کی حدیثوں میں واضح کیا گیا ہے کہ جب امام قرأت کرے تو خاموش رہو اور جو احادیث نص قرآن کے موافق نہ ہوں، ایسی احادیث میں تاویل لازم ہے، اگر سند صحیح ہو؛ ورنہ رد کر دیا جائے گا، اگر سند ضعیف ہو۔

چنانچہ حضرت عبادۃ بن الصامت رضی اللہ عنہ کی حدیث کا جتنا حصہ صحیح ہے؛ یعنی: "**لا صلاۃ لمن لم یقرأ بفاتحۃ الکتاب**" (اس شخص کی نماز نہیں جو سورۂ فاتحہ نہ پڑھے۔) اس میں مقتدی یا امام کا کوئی ذکر نہیں اور اس کو سفیان بن عیینہ اور زہری راوی حدیث اور امام احمد بن حنبل وغیرہ نے امام اور منفرد پر محمول کیا ہے؛ کیوں کہ امام مالک نے موطا میں اور ترمذی نے جامع میں حضرت جابر بن عبداللہ صحابی سے موقوفاً اور امام طحاوی نے مرفوعاً روایت کیا ہے: "**من صلّٰی رکعۃ لم یقرأ فیھا بأم القرآن فلم یصل إلا وراء الإمام**". (۲) (جس نے کوئی نماز بغیر سورہ فاتحہ کے پڑھی، اس نے نماز نہیں پڑھی، مگر امام کے پیچھے ہو تو نماز ہو جائے گی۔) پہلی روایت کی سند صحیح اور دوسری کی حسن ہے۔

امام احمد بن حنبل فرماتے ہیں کہ دیکھو جابر بن عبداللہ صحابی نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد "**لا صلاۃ لمن لم یقرأ بفاتحۃ الکتاب**" (جس نے سورۂ فاتحہ نہیں پڑھی اس کی نماز نہیں۔) کا یہ مطلب بیان کیا ہے کہ یہ حکم اس کے لیے ہے جو تنہا نماز پڑھتا ہو۔ (ترمذی) (۳) مقتدی کے واسطے یہ حکم نہیں ہے اور حدیث عبادہ کے جس حصہ سے امام کے پیچھے قرأت ثابت کی جاتی ہے، اس کی صحت میں محدثین کو کلام ہے، جیسا کہ آئندہ واضح ہوگا تو اس کو رد کیا جائے گا؛ کیوں کہ وہ نص قرآن اور حدیث کے خلاف ہے، یا اس میں تاویل کی جائے گی۔

(۱۰) حضرات عمران بن حصین رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ظہر کی نماز پڑھی تو ایک شخص آپ کے پیچھے ﴿**سبح اسم ربّک الأعلٰی**﴾ پڑھنے لگا، جب نماز سے فارغ ہوئے تو فرمایا: تم میں سے کس نے (قرأت کی) فرمایا، میں خیال کر رہا تھا کہ کوئی مجھ سے قرأت میں منازعت کر رہا ہے۔ امام مسلم نے اس کو روایت کیا ہے۔ (۴)

(ف) اس سے واضح ہوا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اس وقت تک یہی معلوم تھا کہ صحابہ آپ کے پیچھے قرأت نہیں کرتے؛ کیوں کہ سورۂ اعراف میں قرأت خلف الامام سے منع کر دیا تھا، جب کسی نے قرأت کی تو آپ نے

(۱) الصحیح للبخاری، کیف کان بدء الوحی إلی رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم (ح:۵) انیس

(۲) جامع الترمذی، کتاب الصلاۃ، باب ماجاء فی القراءۃ خلف الإمام إذا جھر الإمام بالقراءۃ: ۷۲/۱، رقم الحدیث: ۳۱۳، بیت الأفکار، انیس

(۳) سنن الترمذی، باب ماجاء فی ترک القراءۃ خلف الإمام: ۴۱۲/۱، دار الغرب الإسلامی بیروت. انیس

(۴) الصحیح لمسلم، باب نھی المأموم عن جھرۃ القراءۃ خلف الإمام (ح:۸-۲۱-۳۹۸) انیس

دریافت کیا کہ یہ قرأت کرنے والا کون تھا؟ اگر قرأت خلف الامام جائز ہوتی تو اس سوال کی کوئی وجہ نہ تھی، رہا یہ کہ اس شخص نے ﴿سبّح اسم ربّک الأعلیٰ﴾ پڑھی تھی، سورۂ فاتحہ نہ پڑھی تھی؛ اس لیے تنبیہ کی گئی تو جواب یہ ہے کہ اس سے معلوم ہوا کہ صحابہ امام کے پیچھے سورہ فاتحہ کا پڑھنا واجب نہ سمجھتے تھے، ورنہ یہ صحابی سورہ فاتحہ کی جگہ دوسری سورت کیوں پڑھتا؟ ان کے نزدیک فاتحہ اور غیر فاتحہ سب برابر تھیں، اگر فاتحہ کا پڑھنا مقتدی پر واجب ہوتا تو آپ صرف اتنی بات پر کفایت نہ فرماتے کہ میں خیال کر رہا تھا کہ کوئی مجھ سے قرأت میں منازعت کر رہا ہے؛ بلکہ صاف فرمادیتے کہ ﴿سبّح اسم ربّک الأعلیٰ﴾ نہ پڑھنا چاہئے؛ بلکہ سورۂ فاتحہ پڑھنا چاہئے اور امام بیہقی نے حضرت عمران کی جس روایت سے امام کے پیچھے سورۂ فاتحہ کا وجوب ثابت کیا ہے وہ موقوف ہے اور اس کی سند میں زیاد بن ابی زیاد بجصاص ہے، جس کو اکثر محدثین نے ضعیف اور متروک قرار دیا ہے، اس کی روایت سے حجت لانا انصاف سے بعید ہے۔

(۱۱) عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پیچھے قرأت کرتے تھے تو آپ نے فرمایا تم نے مجھ پر قرآن کو مخلوط کر دیا؛ (یعنی میری قرأت میں خلط ملط کر دیا، اس کی سند بزار کے یہاں عمدہ ہے اور مسند احمد میں اس کے راوی صحیح کے راوی ہیں۔(۱)

(ف) اس میں بھی مقتدیوں کی قرأت پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا انکار فرمانا صریح ہے اور امام بیہقی کی یہ تاویل کہ ''لوگ زور سے قرأت کرتے ہوں گے؛ کیوں کہ امام کی قرأت میں خلط اسی وقت ہوسکتا ہے، صحیح نہیں؛ کیوں کہ اول تو صحابہ کا حضور کے پیچھے زور سے قرأت کرنا بہت بعید ہے۔ دوسرے یہ بھی مسلم نہیں کہ آہستہ قرأت سے امام کو خلجان نہیں ہوتا، یقیناً اصحاب قلوب کو آہستہ قرأت سے بھی خلجان ہوتا ہے، پھر آیت: ﴿إذا قرئ القرآن فاستمعوا له و أنصتوا﴾ اور حدیث ﴿و إذا قرأ الإمام فانصتوا﴾ سے مقتدی کے ذمہ سکوت کا واجب ہونا واضح ہے کہ اس کو نہ زور سے پڑھنے کی اجازت ہے، نہ آہستہ؛ کیوں کہ اسی آیت اور احادیث انصات للخطبہ سے تمام فقہا نے خطبہ کے اندر مقتدیوں کو قرأت اور ذکر سے مطلقاً منع کیا ہے کہ نہ آہستہ قرأت کریں، نہ زور سے، پھر اس کی کوئی وجہ نہیں کہ خطبہ میں تو مطلقاً سکوت کو واجب کہا جائے اور نماز میں زور سے قرأت کو منع کیا جائے اور آہستہ قرأت کی اجازت دی جائے، حالانکہ بالاتفاق یہ آیت قراءۃ خلف الامام کے بارہ میں نازل ہوئی؛ جیسا اوپر گزر چکا۔

(۱۲) حسن بن صالح ابوالزبیر حضرت جابر بن عبداللہ (صحابی) سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ

(۱) مسند الإمام أحمد، مسند عبدالله بن مسعود رضى الله عنه (ح: ۴۳۰۹)/مسند أبى يعلى الموصلى، مسند عبد الله بن مسعود (ح: ۵۰۰۶-۵۳۹۷)/مسند البزار، أبواسحاق الهمدانى عن أبى الأحوص عن عبدالله (ح: ۲۰۷۹) انيس

قال الهيثمى: رواه أحمد و أبويعلى و البزار ورجال أحمد رجال الصحيح. (مجمع الزوائد، باب القراءة فى الصلاة: ۱۱۰/۲، مكتبة القدسى القاهرة. انيس)

علیہ وسلم نے فرمایا: "كل من كان له إمام فقرأته له قراءة" (جس کسی کا کوئی امام ہو تو امام کی قرأت اس کے لیے بھی قرأت ہے۔) اس کو امام ابوبکر بن ابی شیبہ نے (مصنف میں) روایت کیا ہے اور اس کی سند صحیح ہے۔(۱) اس حدیث کو امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ تعالیٰ نے بھی ابوالحسن موسیٰ بن ابی عائشہ سے عبداللہ بن شداد بن الہاد سے حضرت جابر سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "جو شخص امام کے پیچھے نماز پڑھے تو امام کی قرأت اس کے لیے قرأت ہے"، اس کو امام محمد نے موطا میں روایت کیا ہے۔(۲) علامہ عینی فرماتے ہیں کہ سند صحیح ہے اور امام ابن الہمام نے اور محمد بن منیع نے کہا ہے کہ یہ سند شرط شیخین پر صحیح ہے اور کتاب الآثار میں امام محمد نے اس کو مفصلاً روایت کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نماز پڑھا رہے تھے تو آپ کے پیچھے ایک شخص نے قرأت کی اس کے پاس والے نمازی نے اس کو دبا دیا، نماز کے بعد اس نے پوچھا تو نے مجھے کیوں دبایا؟ کہا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تیرے آگے تھے تو میں نے اس کو مکروہ سمجھا کہ تو حضور کے پیچھے قرأت کرے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بات سن لی تو فرمایا "من كان له إمام فإن قرأته له قراءة" "جس کے لیے کوئی امام ہو تو اس کی قرأت یقیناً اس کے لیے قرأت ہے" اور اس کی سند بھی صحیح ہے، اس حدیث کو حافظ احمد ابن منیع نے بھی اپنی مسند میں امام سفیان ثوری اور شریک (عبداللہ بن نخعی) سے موسیٰ بن ابی عائشہ سے عبداللہ بن شداد سے حضرت جابر سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جس کے لیے امام ہو تو امام کی قرأت اس کے لیے بھی قرأت ہے اور بزار کی طرح عبد بن حمید نے بھی اپنی مسند میں اس حدیث کو حسن بن صالح کے واسطہ سے ابوالزبیر سے حضرت جابر سے مرفوعاً روایت کیا ہے۔(فتح القدیر)(۳) اور حافظ ابن حجر نے فرمایا ہے کہ حضرت جابر سے یہ حدیث مشہور ہے۔(تلخیص الحبیر: ۸۷)(۴) پس دار قطنی کا یہ کہنا کہ "اس حدیث کو دیگر ثقات نے مرسلاً روایت کیا ہے۔ صرف (امام) ابوحنیفہ اور حسن بن عمارہ نے موصولاً روایت کیا ہے اور مرسل ہی صواب ہے" غلط ہے؛ کیوں کہ ہم نے ثابت کر دیا ہے کہ اس حدیث کو امام سفیان ثوری اور شریک بن عبداللہ نخعی نے بھی امام ابوحنیفہ کی طرح موصولاً روایت کیا ہے۔ امام سفیان ثوری بالاتفاق ثقہ اور حجت ہیں اور شریک بن عبداللہ مسلم کے رجال میں سے ہیں اور حسن بن عمارہ محمد بن اسحٰق سے کسی طرح کم نہیں، پس

(۱)　مصنف ابن أبي شيبة،باب من كره القراءة خلف الإمام (ح:۳۸۰۲)انيس

(۲)　موطأ الإمام محمد،باب افتتاح الصلاة (ح: ۱۱۷)/كتاب الآثار لأبي يوسف،باب افتتاح الصلاة (ح:۱۱۳)/ وكذا لمحمدبن الحسن الشيباني (ح: ۸۶)/مسند أبي بروایة الحصكفي، كتاب الصلاة (ح: ۲۵)/وكذا مسند أبي حنيفة بروایة بونعيم،أبو حنيفة عن أبي الزبير محمد بن مسلم عن جابر: ۳۲/۱،مكتبةالكوثر الرياض.انيس

(۳)　فتح القدير لابن الهمام،فصل في القراءة: ۳۳۸/۱-۳۳۹،دارالفكر.انيس

(۴)　باب صفة الصلاة: ۵۶۸/۱،دارالكتب العلمية.انيس

تین راویوں کی متابعت کے بعد یہ کہنا کہ یہ روایت موصولاً صحیح نہیں، اصول کے خلاف ہے، پھر امام ابوحنیفہ تنہا بھی کسی حدیث کو مرفوعاً روایت کریں تو حجت ہے؛ کیوں کہ ان کا جو درجہ علماء امت میں ہے، کسی پر مخفی نہیں۔ رہا بعض اہل حدیث کا یہ کہنا کہ اس حدیث سے اتنا معلوم ہوا کہ مقتدی کو امام کی قرأت کافی ہے، یہ تو معلوم نہ ہوا کہ مقتدی کو قرأت کرنا منع ہے، تو جواب یہ ہے کہ اس سے یہ تو معلوم ہو گیا کہ مقتدی پر امام کے پیچھے قرأت کرنا واجب نہیں اور یہی ہمارا مقصود ہے۔ ممانعت کے لیے سورہ اعراف کی آیت اور حدیث صحیح ﴿إذا قرأ الإمام فانصتوا﴾ اوپر گزر چکی، جس میں مقتدی کو امام کے پیچھے خاموش رہنے کا حکم ہے۔

اور علامہ ابن الہمام فرماتے ہیں کہ جب اس حدیث سے مقتدی کے لیے امام کی قرأت کی وجہ سے ایک قرأت شرعاً ثابت ہوگئی اگر وہ خود بھی قرأت کرے گا تو اس کی دو قرأتیں ایک نماز میں ہو جائیں گی اور یہ مشروع نہیں۔

(۱۳)　حضرت ابوالدرداء رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک شخص نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا: یارسول اللہ! کیا ہر نماز میں قرأت ہے؟ فرمایا: ہاں، تو جماعت میں سے ایک شخص نے کہا: یہ واجب ہو گیا؟ بر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: نہیں، میرے نزدیک جب امام قرأت کرے تو وہ (سب کے لیے) کافی ہے۔ اس کو طبرانی نے روایت کیا ہے اور اس کی سند حسن ہے۔ (مجمع الزوائد)(۱) مطلب یہ کہ ہر شخص پر قرأت واجب نہیں؛ بلکہ جس کا کوئی امام نہ ہو، اس پر واجب ہے؛ کیوں کہ امام کی قرأت مقتدی کو کافی ہو جاتی ہے۔

اس حدیث کو نسائی نے بھی سند صحیح کے ساتھ سنن مجتبیٰ میں روایت کیا ہے اور کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے مرفوعاً درست نہیں؛ بلکہ یہ ابوالدردا کا قول ہے (یعنی حدیث موقوف ہے مرفوع نہیں)، دارقطنی نے کہا اس حدیث کو زید بن حباب اور ابوصالح کاتب اللیث نے مرفوعاً روایت کیا ہے اور یہ خطا ہے، صواب یہ ہے کہ ابوالدردا کا قول ہے، میں کہتا ہوں کہ زید بن الحباب سے امام مسلم نے اپنی صحیح میں روایت کی ہے اور احمد بن حنبل اور ابن المدینی و عجلی وغیرہ نے ثقہ کہا ہے اور ابوصالح کاتب اللیث سے امام بخاری نے اپنی صحیح میں تعلیقاً روایت کی ہے۔ ابوحاتم نے اس کو ثقہ مامون اور ابن القطان نے صدوق حسن الحدیث کہا ہے (بہت سچا ہے، اس کی حدیث حسن ہے) تو جس حدیث کو ایسے راوی مرفوع کریں، محققین کے نزدیک اس کو مرفوع ہی کہا جائے گا، پھر ہمارے نزدیک حدیث موقوف بھی حجت ہے، کم از کم اس سے ان صحابہ کا عدد تو زیادہ ہو گیا جو قرأت خلف الامام کے قائل نہیں ہیں۔ (۲)

---

(۱)　مجمع الزوائد، باب القراءة في الصلاة: ۲/ ۱۱۰، مكتبة القدسي القاهرة وقال: رواه الطبراني في الكبير وإسناده حسن. انيس

(۲)　مسند ابن أبي شيبة، ما رواه أبو الدرداء (ح: ۳٤) دار الوطن الرياض/ مسند الإمام أحمد، بقية حديث أبي الدرداء (ح: ۲۷۵۳۰)/ سنن النسائي، إكتفاء المأموم بقراءة الإمام (ح: ۹۲۳): ۲/ ۱٤۲، المطبوعات الإسلامية حلب/　==

(۱۴) عطاء بن یسار سے روایت ہے کہ انہوں نے زید بن ثابت رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے امام کے ساتھ قرأت (کرنے) کو دریافت کیا تو فرمایا: امام کے ساتھ کسی حالت میں قرأت نہیں، اس کو امام مسلم نے اپنی صحیح میں سجود تلاوت کے باب میں روایت کیا اور طحاوی نے بھی صحیح سند سے ان الفاظ کے ساتھ روایت کیا ہے کہ امام کے پیچھے کسی نماز میں بھی قرأت نہ کرو۔(۱)

(ف) حضرت زید بن ثابت صحابی کا فتویٰ صراحۃً امام ابوحنیفہ کا مؤید ہے کہ کسی نماز میں امام کے پیچھے قرأت نہ کرنا چاہیے، جو سورۂ فاتحہ وغیرہ فاتحہ سب کو عام ہے۔

(۱۵) امام مالک نے موطا میں وہب بن کیسان سے روایت کی ہے کہ انہوں نے حضرت جابر بن عبداللہ صحابی سے سنا، وہ فرماتے تھے کہ جو شخص کوئی رکعت بغیر سورۂ فاتحہ کے پڑھے، اس نے نماز نہیں پڑھی؛ مگر امام کے پیچھے (بغیر سورۂ فاتحہ پڑھے نماز ہو جاتی ہے)، اس کی سند صحیح ہے، ترمذی نے بھی اس کو روایت کیا ہے اور فرمایا کہ یہ حدیث حسن ہے اور طحاوی نے مرفوعاً رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اسی حدیث کو انہی الفاظ سے روایت کیا ہے اور اس کی سند حسن ہے۔(۲) اس سے بھی معلوم ہوا کہ امام کے پیچھے سورۂ فاتحہ پڑھنا مقتدی کے ذمہ واجب نہیں اور اس میں بیہقی کی یہ تاویل نہیں چل سکتی کہ قرأت سے مراد جہر ہے؛ کیوں کہ اس صورت میں مطلب یہ ہوگا کہ جو شخص کوئی رکعت پڑھے اور اس میں سورۂ فاتحہ جہر سے نہ پڑھے، اس نے نماز نہیں پڑھی؛ مگر امام کے پیچھے زور سے نہ پڑھے تو لازم آئے گا کہ تنہائی میں نماز پڑھنے والے پر سورۂ فاتحہ زور سے پڑھنا واجب ہے، حالاں کہ اس کا کوئی قائل نہیں۔

== مسند الشاميين للطبراني، يونس بن مسيرة عن أبي إدريس الخولاني (ح: ٢٢٣)/سنن الدارقطني، باب ذكر قوله صلى الله عليه وسلم: من كان له إمام، الخ (تحت بحث حديث: ١٢٦٢): ٢٦٠/٢، مؤسسة الرسالة، وكذا في باب ذكر نيابة الإمام عن قراءة المأمومين (ح: ١٥٠٥)/سنن البيهقي، باب من قال لا يقرأ خلف الإمام على الإطلاق (ح: ٢٩٠٩)/و ذكر الإمام مسلم القشيري في الصحيح عن زيد بن الخباب رقم الحديث: ٢٣٤-٣٣٨-٧٣٢-١٠٣٧-١٠٦٣/١٢١١-١٨١٤-٢٠٢١-٢١٢٣-٢٤٥٧)/العلل ومعرفة الرجال لأحمد رواية إبنه: ٩٦/٢، دار الخاني الرياض/الثقات لعجلي، باب الزاي: ١٧١/١، دار الباز/علل الحديث لابن أبي حاتم، مطابع الحميضي، ت: سعد بن عبدالله وخالد بن عبدالرحمن الجريسي. انيس

(۱) الصحيح لمسلم، باب سجود التلاوة (ح: ٥٧٧) انيس

(۲) موطأ الإمام مالك ت: الأعظمي، ماجاء في أم القرآن (ح: ٢٧٦)/أبو مصعب الزهري، ماجاء في أم القرآن (ح: ٢٣٣)/موطأ الإمام محمد، باب افتتاح الصلاة (ح: ١١٣)/سنن الترمذي، باب ماجاء في ترك القراءة خلف الإمام (ح: ٣١٣)/شرح معاني الآثار، باب القراءة خلف الإمام (ح: ١٣٠٠)/القراءة خلف الإمام للبخاري، باب القراءة في الظهر في الأربع كلها (ح: ١٧٤)/السنن الكبرىٰ للبيهقي، باب من قال لا يقرأ خلف الإمام على الإطلاق (ح: ٢٨٩٩) انيس

حافظ ابن عبدالبر نے کتاب التمہید میں فرمایا ہے:

”ثبت عن علی وسعد وزید بن ثابت أنه لاقراءة مع الإمام لا فیما أسر ولا فیما جهر“. (الجوهر النقی: ۱۵۶-۱۵۷)(۱)

حضرت علی اور سعد (بن ابی وقاص) اور زید بن ثابت سے ثابت ہو چکا ہے کہ (ان کے نزدیک) امام کے ساتھ قرأت نہیں، نہ سری نماز میں، نہ جہری نماز میں۔

(۱۶)　امام مالک نے نافع سے عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ ان سے جب پوچھا جاتا کہ کیا امام کے پیچھے قرأت کی جائے؟ تو فرماتے: جب کوئی امام کے پیچھے نماز پڑھے تو امام کی قرأت اسے کافی ہے اور جب تنہا نماز پڑھے تو قرأت کرنا چاہیے۔ نافع کہتے ہیں کہ عبداللہ بن عمر امام کے پیچھے قرأت نہ کرتے تھے۔ (موطا) اور اس کی سند اصح الاسانید ہے۔ (یعنی بہت صحیح ہے)۔(۲)

(۱۷)　ابو وائل سے روایت ہے کہ ایک شخص عبداللہ بن مسعود کے پاس حاضر ہوا اور کہا، میں امام کے پیچھے قرأت کرلیا کروں؟ فرمایا، قرآن کے لیے خاموش رہو؛ کیوں کہ نماز میں (دوسرا) شغل ہے (یعنی قرآن کے اوامر ونواہی اور وعدو وعید پر غور کرنا) اور تم کو (قرأت کے بارے میں) امام کافی ہے، اس کو طبرانی نے کبیر واوسط میں روایت کیا ہے اور اس کے راوی ثقہ ہیں اور طحاوی نے بھی سند صحیح سے روایت کیا ہے اور بیہقی نے جزء القراءۃ میں علقمہ سے روایت کیا ہے کہ عبداللہ ابن مسعود نے فرمایا: امام کے پیچھے قرات نہ کرو؛ کیوں کہ اس کی قرأت تمہارے لیے بھی قرأت ہے اور امام محمد نے کتاب الآثار میں ابراہیم نخعی سے روایت کیا ہے کہ علقمہ امام کے پیچھے کسی نماز میں خواہ وہ جہری ہو یا سری نہ سورۂ فاتحہ پڑھتے تھے اور نہ اور کوئی سورت اور نہ عبداللہ بن مسعود کے دوسرے اصحاب۔ عبداللہ بن مسعود کا یہ مذہب مشہور ہے کہ وہ امام کے پیچھے قرأت نہ کرتے تھے اور اس سے منع کرتے تھے، یہی مذہب ان کے اصحاب علقمہ واسود وغیرہ کا ہے، اسی پر ابراہیم نخعی کا عمل تھا۔ (حوالہ روایات کے لیے اعلاء السنن ملاحظہ ہو۔)(۳)

---

(۱)　وقال آخرون منهم سفیان الثوری وابن عیینة وابن أبی لیلیٰ وأبوحنیفة وأصحابه والحسن بن حی: لایقرأ مع الإمام لا فیما أسر ولا فیما جهر وهو قول جابر بن عبدالله وجماعة من التابعین بالعراق وروی ذلک أیضا عن زید بن ثابت وعلی وسعد هؤلاء ثبت ذلک عنهم من جهة الإسناد، الخ. (التمهید لما فی الموطأ من المعانی والأسانید، الحدیث التاسع والثلاثون: ۴۷/۱۱، وزارة أمور الأوقاف والشئون الإسلامیة، المغرب. انیس)

(۲)　الموطأ للإمام مالک، ت: الأعظمی، ترک القراءة خلف الإمام فیما جهر فیه (ح: ۲۸۳)/ موطأ الإمام محمد، باب افتتاح الصلاة (ح: ۱۱۲) انیس

(۳)　المعجم الکبیر للطبرانی (ح: ۱۰۴۳۵)/ المعجم الأوسط، من اسمه موسیٰ (ح: ۸۰۴۹)/ موطأ الإمام محمد، باب افتتاح الصلاة (ح: ۱۲۱)/ کتاب الآثار لمحمد بن الحسن، باب القراءة خلف الإمام وتلقینه (ح: ۸۴)/　==

(۱۸) عبیداللہ بن مقسم کہتے ہیں کہ میں نے عبداللہ بن عمر اور زید بن ثابت اور جابر بن عبداللہ (رضی اللہ عنہم) سے (امام کے پیچھے قرأت کرنے کو) دریافت کیا: سب نے فرمایا کہ امام کے پیچھے کسی نماز میں بھی قرأت نہیں کی جاتی۔ اس کو امام طحاوی نے صحیح سند سے روایت کیا ہے۔(۱)

(۱۹) ابو جمرہ کہتے ہیں کہ میں نے ابن عباس (رضی اللہ عنہما) سے پوچھا کہ جب امام میرے آگے (قرأت کرتا) ہو تو کیا میں بھی قرأت کروں؟ فرمایا نہیں۔ اس کو بھی امام طحاوی نے سند حسن سے روایت کیا ہے۔(۲)

(۲۰) علقمہ نے ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے، وہ فرماتے ہیں: کاش اس شخص کا منہ مٹی سے بھر جائے جو امام کے پیچھے قرأت کرتا ہے۔ اس کو بھی امام طحاوی نے سند صحیح سے روایت کیا ہے۔(۳)

(۲۱) عون (بن عبداللہ) بن عباس رضی اللہ عنہما سے وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں، آپ نے فرمایا: تم کو امام کی قرأت کافی ہے، خواہ اخفاء کرے، یا جہر کرے، اس کو دارقطنی نے روایت کیا ہے اور کہا (اس کی سند میں) عاصم قوی نہیں ہے، میں کہتا ہوں: اس سے علی بن المدینی شیخ البخاری جیسے ائمہ حدیث روایت کرتے ہیں اور معن بن عیسیٰ نے اس کو ثقہ کہا ہے اور اس کی بہت تعریف کی ہے اور ایسے راوی کا روایت کو مرفوع کرنا اصول حدیث کے موافق مقبول ہے۔(۴)

(۲۲) امام شعبی نے مرسلاً روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: امام کے پیچھے قرأت نہیں ہے۔ اس کو دارقطنی نے روایت کیا، پھر شعبی سے حارث سے حضرت علی سے (موصولاً) روایت کیا کہ ایک شخص نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا کہ میں امام کے پیچھے قرأت کروں یا خاموش رہوں؟ حضور نے فرمایا: بلکہ خاموش رہو؛ کیوں کہ امام تم کو کافی ہو جائے گا، پھر موصول کو ضعیف بتا کر کہا کہ مرسل جو اس سے پہلے مذکور ہوا ہے، زیادہ صحیح ہے۔(۵) میں کہتا ہوں: مرسل حنفیہ کے یہاں حجت ہے، خصوصاً شعبی کا مرسل کہ وہ تو محدثین کے نزدیک بھی صحیح ہے

== شرح معانی الآثار، باب القراءة خلف الإمام (ح:۱۳۰۷)/ معجم بن المقرئ، باب الیاء (ح:۲۰۸)/ السنن الکبریٰ للبیہقی، باب من قال لا یقرأ خلف الإمام علی الإطلاق (ح:۲۹۰۰)/ إعلاء السنن، النہی عن القراءة خلف الإمام، المجلد الرابع، انیس

(۱) شرح معانی الآثار، باب القراءة خلف الإمام (ح:۱۳۱۲) انیس

(۲) شرح معانی الآثار، باب القراءة خلف الإمام (ح:۱۳۱۶) انیس

(۳) شرح معانی الآثار، باب القراءة خلف الإمام (ح:۱۳۱۰) انیس

(۴) سنن الدارقطنی، ذکر قوله صلی الله علیه وسلم من کان له، الخ (ح:۱۲۵۲): ۱۲۲/۲، مؤسسة الرسالة بیروت لبنان. انیس

(۵) سنن الدارقطنی، ذکر قوله صلی الله علیه وسلم من کان له، الخ (ح:۱۲۴۸) انیس

اور جب مرسل کی تائید موصول سے ہوجائے تو پھر بالاتفاق حجت ہے، اگر چہ موصول ضعیف بھی ہو؛ جیسا کہ مقدمہ اعلاء السنن میں بحوالہ شرح النخبہ وتدریب الراوی وغیرہ بیان کردیا گیا ہے۔

(۲۳) عبدالرزاق نے اپنے مصنف میں موسیٰ بن عقبہ (امام المغازی سے) مرسلاً روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور ابوبکر (صدیق) اور حضرت عمر وعثمان (رضی اللہ عنہم) امام کے پیچھے قرأت کرنے سے منع کرتے تھے۔ (عمدۃ القاری) (۱) علامہ عینی فرماتے ہیں کہ یہ مرسل صحیح ہے۔

(۲۴) عبداللہ بن وہب نے یحییٰ بن عبداللہ بن سالم عمری اور یزید بن عیاض سے مرسلاً روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جس کے لیے کوئی امام ہو اور یہ اس کی اقتداء کررہا ہو تو اس کے ساتھ قرأت نہ کرے؛ کیوں کہ امام کی قرأت اس کے لیے بھی قرأت ہے۔ اس کو امام بیہقی نے جزء القراءۃ میں روایت کیا اور فرمایا یحییٰ بن عبداللہ میں نظر ہے اور یزید بن عیاض پر جملہ محدثین نے جرح کی ہے۔ میں کہتا ہوں حدیث کا مدار یزید بن عیاض پر نہیں، اس کے ساتھ یحییٰ بن عبداللہ بھی ہے اور وہ صحیح مسلم کے رجال میں سے ہے، نسائی اور دارقطنی نے اس کو ثقہ کہا ہے، پس یحییٰ کا مرسل صحیح ہے۔ یزید بن عیاض کے مجروح ہونے سے اس کو کوئی ضرر نہیں اور مرسل ہمارے یہاں حجت ہے۔

(۲۵) امام مالک نے ابن شہاب (زہری) سے ابن اکیمہ لیثی سے حضرت ابوہریرہ سے روایت کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک نماز سے فارغ ہوکر جس میں آپ نے قرأت جہر سے کی تھی، فرمایا کہ تم میں سے کسی نے اس وقت میرے ساتھ قرأت کی ہے۔ ایک شخص نے کہا: ہاں! یا رسول اللہ: میں نے قرأت کی ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میں بھی تو کہوں کہ یہ کون مجھ سے قرأت کو چھین رہا ہے؛ (یعنی قرأت میں منازعت کررہا ہے) جب لوگوں نے یہ بات سنی تو اس نماز میں قرأت کرنے سے رک گئے، جس میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم جہر سے قرأت کرتے تھے، اس کو امام مالک نے موطأ میں، امام شافعی نے مسند میں اور ائمہ اربعہ نے سنن میں روایت کیا ہے اور امام ترمذی نے اس کو حسن کہا اور ابن حبان نے صحیح کہا ہے، امام مالک کا اس کو سند موصول سے روایت کرنا صحت کے لیے کافی ہے۔ (۲) اس پر بعض محدثین کا یہ جرح کرنا کہ: "**فانتهى النّاس عن القراءة فيما جهر فيه، إلخ** کہ "لوگ جہری نماز

(۱) مصنف عبدالرزاق الصنعانی، باب القراءة خلف الإمام: ۱۳۹/۲، المكتب الإسلامی بیروت/عمدة القاری، باب وجوب القراءة للإمام والمأموم: ۱۳/٦، دار إحیاء التراث العربی بیروت. انیس

(۲) موطأ الإمام مالک، ت: الأعظمی، ترک القراءة خلف الإمام فیما جهر فیه (ح: ۲۸٦)/موطأ الإمام محمد، باب افتتاح الصلاة (ح: ۱۱۱)/مسند الإمام أحمد، مسند أبی هریرة (ح: ۷۸۰٦)/السنن الماثورة للشافعی، ماجاء فی الجمع بین الصلاتین فی المطر (ح: ۳۳)/سنن أبی داؤد، باب من کره القراءة بفاتحة الکتاب إذا جهر (ح: ۸۲٦)/ سنن الترمذی، باب ماجاء فی ترک القراءة خلف الإمام (ح: ۳۱۲)/سنن النسائی، باب ترک القراءة خلف الإمام فیما جهر فیه (ح: ۹۱۹)/صحیح ابن حبان، ذکر کراهیة رفع الصوت للمأموم بالقراءة (ح: ۱۸٤۹) انیس

میں قرأت کرنے سے رک گئے، الخ، زہری کا قول ہے، صحابی کا قول نہیں‘‘ قابل تسلیم نہیں؛ کیوں کہ سنن ابی داؤد میں اس حدیث کو معمر نے زہری سے روایت کیا ہے اور صاف کہا ہے: ’’**قال أبو هريرة فانتهى الناس عن القراءة**‘‘ **إلخ** ابو ہریرہ نے فرمایا کہ سب لوگ حضور کے پیچھے قرأت کرنے سے رک گئے، الخ اور معمر ثقہ متقن ہے، اس سے روایت کرنے والا احمد بن السرح بھی ثقات اثبات میں سے ہے، پس اصول حدیث کے موافق معمر کو ترجیح دی جائے گی، پھر اگر زہری کا قول مان لیا جائے تو وہ سیر و مغازی کا امام اور اخبار زمانہ رسالت کا خوب جاننے والا ہے۔ اس باب میں اس کا قول حجت ہے، اس سے قطعاً معلوم ہو گیا کہ اس واقعہ کے بعد تمام صحابہ نے حضور کے پیچھے جہری نماز میں قرأت کرنا ترک کر دیا تھا۔

(ف) اس حدیث سے امور ذیل مستفاد ہوئے۔

(۱) جو لوگ امام کے پیچھے قرأت کرتے تھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے امر سے نہ کرتے تھے اور نہ آپ کو اس کا علم تھا، ورنہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو اس سوال کی ضرورت نہ ہوتی کہ کیا کسی نے اس وقت میرے پیچھے قرأت کی ہے۔

(۲) سب صحابہ امام کے پیچھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں قرأت نہ کرتے تھے؛ کیوں کہ حضور کے دریافت کرنے پر صرف ایک شخص نے جواب دیا کہ میں نے قرأت کی ہے۔

(۳) حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس شخص کی قرأت پر انکار فرمایا، جس سے سب لوگ جہری نمازوں میں قرأت سے باز آگئے۔

(۴) سرّی نمازوں میں اس کے بعد بھی کچھ لوگ قرأت کرتے ہوں گے، بعد میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے بھی منع فرما دیا؛ جیسا عبد اللہ بن شداد کی روایت میں گزر چکا ہے کہ ایک شخص نے عصر کی نماز میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پیچھے قرأت کی، ایک صحابی نے اس کو اشارہ سے روکا، نماز کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جس کے لیے امام ہو، اس کے واسطے امام کی قرأت کافی ہے۔

(۲۶) انس بن سیرین کہتے ہیں کہ میں نے عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے یہ دریافت کیا کہ میں امام کے پیچھے قرأت کیا کروں؟ فرمایا تو تو بڑے پیٹ کا معلوم ہوتا ہے (یعنی بیوقوف)، تجھے امام کی قرأت کافی ہے۔ اس کو عبد الرزاق نے مصنف میں روایت کیا ہے۔(۱) میں کہتا ہوں اس کی سند صحیح ہے جس کے راوی صحیحین کے راوی ہیں۔

(۲۷) زید بن اسلم سے روایت ہے کہ عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما امام کے پیچھے قرأت کرنے سے منع فرماتے تھے، اس کو بھی عبد الرزاق نے روایت کیا ہے۔ (جوہر نقی) (۲) میں کہتا ہوں: اس کی سند بھی صحیح ہے۔

(۱-۲) مصنف عبدالرزاق الصنعاني، باب القراءة خلف الإمام، رقم الحديث: ۲۸۱۲) و رقم الحديث: ۲۸۱٤. انيس

(۲۸) موسیٰ بن سعد بن زید بن ثابت اپنے دادا (زید بن ثابت صحابی) سے روایت کرتے ہیں کہ انہوں نے فرمایا: جو شخص امام کے پیچھے قرأت کرے، اس کی نماز (درست) نہیں۔ اس کو امام محمد نے موطا میں روایت کیا ہے اور اس کی سند صحیح نسخہ میں جس طرح ہے، امام بیہقی نے اسی طرح امام بخاری سے روایت کر کے نقل کی ہے اور اس کے سب راوی ثقہ ہیں اور موسیٰ بن سعد کا اپنے دادا زید بن ثابت سے روایت کرنا ابن حبان اور امام بخاری نے ذکر کیا ہے۔ (تہذیب)(۱)

(ف) ان تمام آثار سے ثابت ہوگیا کہ اجلہ صحابہ کا اس باب میں وہی قول ہے، جو امام ابوحنیفہ کا قول ہے۔ غرض امام ابوحنیفہ کا مذہب اس مسئلہ میں کہ مقتدی کو امام کے پیچھے قرأت نہ کرنا چاہیے، قرآن سے بھی ثابت ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث سے بھی اور صحابہ کرام کے اقوال و عمل سے بھی تو یہ کتنا بڑا ظلم ہے کہ بعض لوگ اب بھی اس مسئلہ میں حنفیہ پر زبان درازی کرتے ہیں، اب ہم بتلائیں گے کہ تابعین میں بھی بہت حضرات اس مسئلہ میں امام ابوحنیفہ کے موافق ہیں۔

(۲۹) فضل (ابن دکین) زہیر (ابن معاویہ) سے وہ ولید بن قیس سے روایت کرتے ہیں کہ انہوں نے کہا کہ میں نے سوید بن غفلہ سے (جو تابعی کبیر ہیں اور بعض نے ان کو صحابی بھی کہا ہے) دریافت کیا کہ میں ظہر و عصر میں امام کے پیچھے قرأت کرلیا کروں؟ فرمایا: نہیں، اس کو ابوبکر ابن ابی شیبہ نے مصنف میں روایت کیا ہے اور اس کی سند بالکل صحیح ہے۔ (۲)

(۳۰) ہیثم ابوبشیر (جعفر بن ایاس) سے، وہ سعید بن جبیر سے روایت کرتے ہیں کہ ان سے قرأت خلف الامام کے متعلق سوال کیا گیا تو فرمایا: امام کے پیچھے قرأت نہیں ہے، اس کو بھی ابن ابی شیبہ نے (اپنی) مصنف میں روایت کیا ہے، (۳) اور اس کے تمام راوی ثقہ ہیں، صحیحین کے راویوں میں سے ہیں اور سعید بن جبیر تابعی جلیل ہیں۔ (۴)

(۱) موطأ الإمام محمد، باب افتتاح الصلاة (ح: ۱۲۷)/السنن الکبریٰ للبیهقی، باب من قال لا یقرأ خلف الإمام علی الإطلاق (ح: ۲۹۱۲)/تهذیب التهذیب، من اسمه موسی: ۳۴۵/۱۰، مطبعة دائرة المعارف النظامیة الهند/إکمال تهذیب الکمال، موسی بن سعد بن زید بن ثابت: ۱۶/۱۲، الفاروق الحدیثة للنشر و التوزیع/تهذیب الکمال فی أسماء الرجال، ترجمة موسی بن سعد بن زیدبن ثابت: ۶۸/۲۹-۶۹، مؤسسة الرسالة بیروت. انیس

(۲) مصنف ابن أبی شیبة، من کره القراء ة خلف الإمام (ح: ۳۷۹۶) انیس

(۳) مصنف ابن أبی شیبة، من کره القراء ة خلف الإمام (ح: ۳۷۹۲) انیس

(۴) هیثم عن ابی البشر کذا رواه البخاری، فی باب إتمام التکبیر فی السجود و کذا فی باب حدیث بنی نضیر و باب غزوة الحدیبیة و باب الذوائب وغیره/مسلم فی باب استحباب إفاضة الماء علی الرأس و باب صوم یوم عاشوراء و باب ما یفعل المحرم إذا مات وغیره/الثقات لابن حبان، باب السین: ۲۷۵/۴، دائرة المعارف العثمانیة بحیدر آباد الدکن. انیس

(۳۱) محمد بن سیرین سے (جو تابعی جلیل ہیں) روایت ہے، انہوں نے فرمایا: میں امام کے پیچھے قرأت کرنے کو سنت نہیں جانتا۔ اس کو بھی ابن ابی شیبہ نے مصنف میں روایت کیا ہے اور اس کی سند صحیح ہے۔(۱)

(۳۲) ابراہیم نخعی اسود (تابعی کبیر) سے روایت کرتے ہیں کہ انہوں نے فرمایا کہ جو شخص امام کے پیچھے قرأت کرے، میں چاہتا ہوں کہ اس کا منہ مٹی سے بھر جائے۔ اس کو عبدالرزاق نے مصنف میں روایت کیا ہے،(۲) اور اس کی سند صحیح ہے جس کے راوی صحیحین کے راوی ہیں۔

(۳۳) اعمش ابراہیم نخعی سے روایت کرتے ہیں کہ لوگوں نے جو اوّل بدعت ایجاد کی ہے، وہ امام کے پیچھے قرأت کرنا ہے۔ اس کو بھی عبدالرزاق نے مصنف میں روایت کیا ہے اور اس کی سند صحیحین کی شرط پر صحیح ہے۔(جوہر نقی)(۳)

(۳۴) منصور ابراہیم نخعی سے روایت کرتے ہیں کہ جس شخص نے امام کے پیچھے سب سے پہلے قرأت کی ہے، وہ (دین میں) متہم تھا۔ اس کو امام محمد نے موطا میں روایت کیا ہے اور اس کی سند صحیح ہے۔(۴)

(ف) ابراہیم نخعی فقہا کوفہ میں سے ہیں، بظاہر مطلب یہ معلوم ہوتا ہے کہ کوفہ میں سب سے پہلے جس شخص نے قرأت خلف الامام شروع کی وہ متہم تھا، ممکن ہے کوئی خارجی یا قدری ہو، اس سے پہلے اہل کوفہ کا عمل عبداللہ بن مسعود کے موافق تھا کہ وہ امام کے پیچھے قرأت نہ کرتے تھے، ابراہیم نخعی کا یہ مطلب نہیں کہ مکہ اور حجاز میں بھی قرأت خلف الامام کرنے والا مبتدع یا متہم تھا۔

(۳۵) امام ابوحنیفہ نے حماد سے، انہوں نے ابراہیم نخعی سے روایت کیا ہے کہ علقمہ بن قیس نے امام کے پیچھے کسی نماز میں قرأت نہیں کی، نہ جہری میں نہ سری، نہ سورۂ فاتحہ پڑھتے، نہ اور کوئی سورت، اس کو امام محمد نے کتاب الآثار میں روایت کیا ہے اور اس کی سند صحیح ہے۔(۵) جامع مسانید الامام میں بھی اسی سند سے اس کو ذکر کیا گیا ہے اور **ولا أصحاب عبد الله جميعا** زیادہ کہا ہے؛ یعنی عبداللہ بن مسعود کے اور تمام اصحاب بھی امام کے پیچھے قرأت نہ کرتے تھے، اس کو مسند حافظ ابن خسرو اور آثار محمد کی طرف منسوب کیا ہے۔(۶)

(ف) یہ حضرات اجلہ تابعین ہیں، جن کی امامت پر علما امت کا اتفاق ہے، ان آثار سے معلوم ہو گیا کہ یہ

(۱) مصنف ابن أبي شيبة، من كره القراءة خلف الإمام (ح:۳۷۹٤) انيس
(۲) مصنف عبدالرزاق الصنعاني، باب القراءة خلف الإمام (ح:۲۸۰۷) انيس
(۳) مصنف عبدالرزاق، باب القراءة خلف الإمام (ح:۲۸۱۷)/ الجوهر النقي الجزء الثاني:۱٦۹، دار الفكر. انيس
(۴) موطأ الإمام محمد، باب افتتاح الصلاة (ح:۱۲۳) انيس
(۵) موطأ الإمام محمد، باب افتتاح الصلاة (ح:۱۲۰) انيس
(٦) الآثار للإمام محمد، باب القراءة خلف الإمام وتلقينه (ح:۸٤) انيس

حضرات امام کے پیچھے قرأت نہ کرتے تھے؛ بلکہ اس سے منع فرماتے تھے اور بعضے اس کو بدعت اور بعضے اس کو خلاف سنت تک کہتے تھے، کیا اب بھی کسی کا یہ منہ ہے کہ اس مسئلہ میں امام ابوحنیفہؒ پر زبان درازی کرے، جب قرآن سے، صحیح حدیثوں سے، اقوال صحابہ واقوال تابعین سے، ان کے قول کی پوری تائید اور تقویت ہو رہی ہے اور جن احادیث سے حضرات شافعیہ یا ظاہریہ نے استدلال کیا ہے، ان سب کا جواب اعلاء السنن میں مفصل دے دیا گیا ہے، (۱) اور بتلا دیا گیا ہے کہ جن احادیث میں صرف سورۂ فاتحہ پڑھنے کی تاکید ہے، وہ امام اور منفرد پر محمول ہیں، مقتدی پر محمول نہیں؛ چنانچہ خود راوی حدیث امام احمد اور سفیان بن عیینہ نے بھی اسی پر حدیث کو محمول کیا ہے اور امام ومنفرد کے حق میں سورۂ فاتحہ کا پڑھنا ہمارے نزدیک بھی واجب ہے اور جن احادیث میں امام کے پیچھے قرأت فاتحہ کا ذکر ہے، وہ مرفوعاً صحیح نہیں؛ بلکہ ضعیف ہے، البتہ بعض صحابہ سے امام کے پیچھے قرأت کرنا ثابت ہے، مگر ان کے خلاف اجلۂ صحابہ واجلۂ تابعین سے اس کی ممانعت اور نفی بھی ثابت ہے؛ جیسا ہم نے مفصل بیان کردیا ہے، پس اختلافِ صحابہ کی صورت میں ان صحابہ کا قول مقدم اور راجح ہوگا جو آیت قرآن: ﴿إذا قرئ القرآن فاستمعوا له وأنصتوا﴾ اور حدیث صحیح: ”إذا قرأ الإمام فانصتوا“ کے موافق ہو اور جن صحابہ کا قول نص قرآن اور حدیث صحیح کے خلاف ہو، اس میں تاویل کی جائے گی کہ وہ جہری نمازوں میں امام کے سکتات میں قرأت کرتے ہوں گے اور سکتات امام میں مقتدی کو قرأت فاتحہ کرنا ہمارے نزدیک بھی جائز ہے، گو واجب نہیں؛ کیوں کہ خود امام کے ذمہ سکتات واجب نہیں اور گو ہمارے نزدیک سری نمازوں میں قرأت نہ کرنا بہتر ہے؛ لیکن اگر قرأت کرے تو جائز ہے، کچھ مضائقہ نہیں، جن صحابہ

(۱) قلت: وأورد عليه ما أخرجه البخاري (كذا البيهقي) في جزء ه عن أبي العالية سألت ابن عمر بمكة أقرأ في الصلاة ؟ قال: أستحيي من رب هذه البنية أن أصلي صلاة لا أقرأ فيها ولو بأم القرآن، إسناده حسن. (التعليق الحسن: ۸۲/۱) لكنه ليس فيه ذكر القراء ة خلف الإمام فلا يعارض ما هٰهنا ويحمل على غير المقتدى. (إعلاء السنن، النهى عن القراء ة خلف الإمام: ۸۷/٤-۸۸)

... قلت: لا دلالة فيه على الوجوب، وأما قوله صلى الله عليه وسلم: كل صلاة لا يقرأ فيها بأم القرآن فهو خداع، فهو محمول على الإمام والمنفرد، كما مر في قول أحمد عند الترمذي أو يقال بالعموم، فالمأموم قارىء حكما، لأن قراء ة الإمام له قراء ة، ونظير هذا التأويل لرفع التعارض ما أخرجه النسائي عن أبي هريرة في إتيانه الطور، ولقائه كعبا، وفيه: قال: عبدالله: هي (أي ساعة الجمعة) آخر ساعة من يوم الجمعة قبل أن تغيب الشمس فقلت: إليس قد سمعت رسول الله صلى الله عليه وسلم يقول: لا يصادفها مؤمن وهو في الصلاة؟ ليست تلك ساعة صلاة، قال: أليس قد سمعت رسول الله صلى الله عليه وسلم يقول: من صلى وجلس ينتظر الصلاة فهو في صلاة حتى تأتيه الصلاة التي تليها، قلت: بلى، قال: فهو كذلك، اه. (نسائي مجتبائي: ۲۱۱/۱) (إعلاء السنن، النهى عن القراء ة خلف الإمام: ۱۰۸/٤-۱۰۹، إدارة القرآن والعلوم الإسلامية، انيس)

... وأيضا قد أسلفنا عن الترمذي أن الإمام أحمد قد أول حديث بما أوله سفيان　==

سے امام کے پیچھے قرأت ثابت ہے، وہ سری نمازوں میں قرأت کرتے ہوں گے، جہری نمازوں میں امام کے پیچھے قرأت کرنا امام شافعی کا بھی مذہب نہیں، (۱) وہ صرف اس کے قائل ہیں کہ مقتدی کو امام کے سکتات میں فاتحہ پڑھنا ضروری ہے، ان کے نزدیک امام کو سورۂ فاتحہ کے بعد اتنا طویل سکتہ کرنا چاہیے کہ مقتدی سورۂ فاتحہ پڑھ لیں، ہمارے نزدیک ضروری تو نہیں؛ کیوں کہ امام کے ذمہ کسی دلیل سے اس سکتہ کا وجوب ثابت نہیں؛ لیکن اگر امام سکتہ طویلہ کرے تو مقتدی کو سورۂ فاتحہ پڑھنا جائز ہے۔ واللہ اعلم

(۳۶) دلیل اجماعی:

امام طحاوی اور موفق بن قدامہ حنبلی نے دلائل کتاب وسنت واقوال وآثار صحابہ وتابعین بیان کر کے اجماع سے بھی اس کا ثبوت دیا ہے کہ امام کے پیچھے مقتدی پر قرأت فاتحہ واجب نہیں؛ کیوں کہ اس پر سب کا اتفاق ہے، کسی نے بھی اختلاف نہیں کیا کہ جو شخص رکوع کی حالت میں امام کو پائے اور تکبیر تحریمہ (اللہ اکبر) کہہ کر رکوع میں شریک ہوجائے تو وہ رکعت اس نے پالی ہے؛ حالانکہ اس نے قرأت نہیں کی ہے۔

== وقال: معنى قول النبي صلى الله عليه وسلم: لا صلاة لم لم يقرأ بفاتحة الكتاب، أن هذا إذا كان وحده وهذا يدل على أن زيادة خلف الإمام لم يثبت عنده في الحديث وإلا بطل تأويله رأساً.

وأيضا فقدروى الطبرى فى تفسيره (١١١/١٥) والبيهقى فى جزء ه (ص: ٧٥) بطريق عبد الله بن المبارك عن يونس عن الزهرى قال: لا يقرأ من وراء الإمام فيما يجهر به الإمام القراء ة يكفيهم قراء ة الإمام وإن لم يسمعهم صوته ولكنهم يقرؤون فيما لا يجهر به سراً فى أنفسهم ولا يصلح لأحد أن يقرأ معه فيما يجهر به سراً ولا علانية، اه.

قلت: وسند الطبرى رجاله كلهم ثقات معروفون فلو كان الزهرى روى هذه الزيادة فى الحديث لم يقل بوجوب الإنصات على المأموم فى الجهرية بل قال بوجوب قراء ة الفاتحة عليه ويدل على ضعفها ونكارتها أيضا سكوت الحافظ ابن حجر عنها فى فتح البارى تحت حديث عبادة مع فرط اعتناء ه بجمع الطرق الصحيحة والحسنة للحديث وبيان الزيادات التى ثبتت فيها من طرق أخر، الخ. (إعلاء السنن، المرجع السابق: ١١١/٤-١١٢)

(١) أما المأموم فلا يقرأ السورة فى الجهرية بل يقرأ الفاتحة فى سكتة الإمام بعد الفاتحة ثم يستمع السورة وإن لم يبلغه صوت الإمام فوجهان: القياس أنه يقرأ لأنه كالمنفرد عند فوات السماع، والثانى لا لقوله صلى الله عليه وسلم: إذا كنتم خلفى فلا تقرؤوا إلا بفاتحة الكتاب فإنه لا صلاة إلا بها. (الوسيط فى المذهب: ١٢٤/٢، دار السلام القاهرة. انيس)

ويستحب سكوت الإمام بعد تأمينه فى الجهرية قدر ما يقرأ المأموم الفاتحة ويشتغل حينئذ بدعاء أو ذكر أو قراء ة سراً قاله فى المجموع والقراء ة أولى والسكتات المستحبة فى الصلاة أربع على المشهور: سكتة بعد تكبيرة الإحرام يفتتح فيها، وثانية بين ﴿ولا الضآلين﴾ وآمين وثالثة للإمام بين التأمين فى الجهرية وقراء ة السورة بقدر قراء ة المأموم ورابعة قبل تكبيرة الركوع. (نهاية المنهاج إلى شرح المنهاج، الرابع من أركان الصلاة قراء ة الفاتحة: ٤٩٤/١، دار الفكر بيروت. انيس)

موفق بن قدامہ فرماتے ہیں:

”ولأنّها قراءة لا تجب على المسبوق،فلا تجب على غيره كقراءة السورة“إلخ .(۱)(اور اجماعی دلیل یہ ہے کہ) مقتدی مسبوق پر قراءۃ فاتحہ واجب نہیں (وہ رکوع پالینے سے رکعت پالیتا ہے) تو اس کے سوا اور کسی مقتدی پر بھی یہ قرأت واجب نہ ہوگی جیسے سورت کا پڑھنا واجب نہیں (حالانکہ دلائل حدیث سے ضم سورت کا وجوب بھی ثابت ہے) اگر مقتدی کے ذمہ قرأت واجب ہوتی تو بقیہ ارکان کی طرح مسبوق سے بھی ساقط نہ ہوتی۔(۱/۶۰۹)

حافظ ابن عبد البر نے شرح الاستذکار میں فرمایا ہے کہ تمام فقہا کا قول یہ ہے کہ جو شخص امام کو رکوع میں پائے اور تکبیر کہہ کر رکوع میں شامل ہوجائے اور ہاتھ گھٹنوں پر جمادے،اس سے پہلے کہ امام سر اٹھائے تو اس نے رکعت پالی ہے، یہی مذہب ہے امام مالک کا اور امام شافعی اور امام ابوحنیفہ اور ان کے اصحاب کا اور سفیان ثوری و اوزاعی و ابوثور و احمد و اسحاق کا،یہی حضرت علی سے اور عبد اللہ بن مسعود اور زید بن ثابت اور عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہم سے منقول ہے،ہم نے کتاب التمہید میں سند کے ساتھ ان سب کے اقوال بیان کردیئے ہیں۔(۲) غرض اس پر فقہا کا اتفاق ہے،حافظ ابن عبد البر امام نووی اور حافظ ابن حجر وغیرہ نے اس پر اجماع نقل کیا ہے۔ابن الامیر یمانی نے بھی سبل السلام میں عامۂ فقہاء کے قول کو ترجیح دی ہے،(۳) مگر ظاہریہ نے صرف اس لیے کہ اس صورت میں مقتدی پر سورۂ فاتحہ کا وجوب باقی نہیں رہتا، اجماع کے خلاف یہ دعویٰ کردیا کہ رکوع پانے سے مسبوق رکعت کو نہیں پاسکتا؛ کیوں کہ اس نے سورۂ فاتحہ نہیں پڑھی۔

تضعیف حدیث ابی ہریرہ متعلق مسبوق:

اور ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کے ایک قول سے سہارا لے لیا، جو امام بخاری نے جزء القرأۃ میں ذکر کیا ہے کہ اگر کوئی امام کو رکوع میں پائے تو اس رکعت کو شمار نہ کیا جائے گا؛(۴) حالانکہ موطا مالک میں حضرت ابو ہریرہ سے اس کے خلاف روایت موجود ہے، جو جمہور امت کے موافق ہے،حافظ ابن عبد البر نے شرح موطأ میں فرمایا ہے کہ فقہا امصار میں سے کسی کا بھی یہ قول نہیں ہے اور اس کی سند میں نظر ہے۔(۵) امام نووی فرماتے ہیں کہ یہ قول خلاف اجماع ہے اور ابو ہریرہؓ کی حدیث

(۱) المغني، فصل ويكره أن يتطوع الإمام في موضع الصلاة المكتوبة،مسألة:قال،والمأموم إذا سمع قراءة الإمام فلا يقرأ بالحمد١/٦٢٢١،دار عالم الكتب الرياض،انيس

(۲) الإستذكار،باب العمل في الصلاة: ٤٣١/١ .وكذا في التمهيد لما في الموطأ من المعاني والأسانيد (ح:٢٨):١١١/١٦،وزارة أمور الأوقاف والشئون الإسلامية المغرب.انيس

(۳) سبل السلام،أذكار الركوع والسجود: ٢٦٦/١،دار الحديث.انيس

(۴) عن أبي هريرة قال:إذا أدركت القوم ركوعاً لم تعتد بتلك الركعة.(القراءة خلف الإمام،باب من قرأ في سكتات الإمام إذا كبر،الخ (ح:١٧٣)انيس)

(۵) التمهيد لما في الموطأ من المعاني والأسانيد:٧٢/٧_٧٤.انيس

صحیح نہیں۔ ہر زمانہ کے فقہانے بالاتفاق اس کو رد کردیا ہے تو اس کا اعتبار نہیں کیا جاسکتا اور اس کے خلاف ابوداؤد نے ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جب تم نماز کو آؤ اور ہم سجدہ میں ہوں تو سجدہ کرلو اور اس کو کچھ شمار نہ کرو اور جس نے رکوع پالیا اس نے نماز (کی رکعت) پالی۔ ابوداؤد نے اس پر سکوت کیا ہے اور منذری نے بھی اور حاکم نے اس کو صحیح الاسناد کہا ہے، ذہبی نے بھی تلخیص مستدرک میں حاکم کی تائید کی ہے۔(۱)

ابن خزیمہ نے اپنی صحیح میں اس حدیث کو ان الفاظ سے مرفوعاً روایت کیا:

''من أدرک رکعة من الصلوٰة،فقد أدرکھا قبل أن یقیم الإمام صلبه''. (۲)

''جس نے نماز میں رکوع پالیا اس سے پہلے کہ امام اپنی کمر سیدھی کرے اس نے رکعت کو پالیا''۔

ابن خزیمہ نے اس حدیث کو حجت قرار دیا ہے۔(التلخیص الحبیر)(۳) اور ابن حبان نے بھی اپنی صحیح میں اس کو صحیح کہا ہے۔(المرقاۃ)(۴) پس یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ اپنی روایت کردہ حدیث مرفوع کے خلاف کوئی قول بیان کریں، پس ان کا وہی قول صحیح ہے جو موطا مالک میں حدیث مرفوع کے موافق ہے، اگر مقتدی کے ذمہ امام کے پیچھے قرأت واجب ہوتی تو رکوع پانے سے وہ رکعت نہ پاسکتا؛ کیوں کہ خود اس نے تو قرأت نہیں کی، پس ثابت ہوا کہ امام کی قرأت مقتدی کے لیے کافی ہوجاتی ہے؛ اسی لیے وہ رکوع پالینے سے وہ رکعت پالیتا ہے۔

اہل حدیث کے دلائل کا جواب:

پہلی دلیل:

اب میں مؤلف تکمیل البرہان کے دلائل کی حقیقت واضح کرنا چاہتا ہوں۔

سب سے پہلے انہوں نے وہی حدیث عبادۃ بن الصامت بیان کی ہے:

''لا صلوٰة لمن لم یقرأبفاتحة الکتاب''. (البخاری ومسلم)(۵)

''اس شخص کی نماز نہیں جو سورۂ فاتحہ نہ پڑھے''۔

(۱) سنن أبی داؤد،باب فی الرجل یدرک الإمام ساجداً کیف یصنع؟ (ح:۸۹۳)/المستدرک للحاکم مذیلاً بالتعلیقات للذھبی،ومن کتاب الإمامة وصلاة الجماعة (ح:۷۸۳):۳۳۶/۱،دار الکتب العلمیة بیروت.انیس

(۲) صحیح ابن خزیمة،کتاب الإمامة فی الصلاة،باب ذکر الوقت الذی یکون فیه المأموم مدرکًا للرکعة إذا رکع إمامه قبل:۴۵/۳ (ح:۱۵۹۵) المکتب الإسلامی،انیس

(۳) التلخیص الحبیر،کتاب صلاة الجماعة:۱۰۸/۲،دار الکتب العلمیة.انیس

(۴) مرقاة المفاتیح،باب ما علی المأموم من المتابعة حکم المسبوق:۸۸۰/۳،دار الفکر.انیس

(۵) البخاری،کتاب الأذان،باب وجوب القراءة للإمام والمأموم:۱۵۷/۱(ح:۷۵۶) بیت الأفکار/مسلم،کتاب الصلاة،باب وجوب قراءة الفاتحة فی کل رکعة:۱۶۹/۱ (ح:۳۹۴) بیت الأفکار،انیس

ہم بتلا چکے ہیں کہ اس حدیث کو امام احمد اور سفیان بن عیینہ اور زہری جیسے ائمہ راویان حدیث نے امام اور منفرد کے حق میں قرار دیا ہے، مقتدی کو اس حکم میں شامل نہیں کیا؛ کیوں کہ حضرت جابر بن عبداللہ صحابی رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً اور موقوفاً ثابت ہے:

"من صلّٰی رکعة لم یقرأ فیھابأم القراٰن،فلم یصل إلا أن یکون وراء الإمام".(موطأ الامام مالک والطحاوی والترمذی)(۱)

جس نے کوئی رکعت پڑھی جس میں سورۂ فاتحہ نہیں پڑھی اس نے نماز نہیں پڑھی مگر امام کے پیچھے (ہو تو نماز ہو جائے گی۔

امام ترمذی کہتے ہیں کہ امام احمد بن حنبل نے فرمایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد: **" لا صلاة لمن لم یقرأ بفاتحة الکتاب"**. (۲) کا مطلب یہ ہے کہ جب تنہا نماز پڑھے تو سورۂ فاتحہ کے بغیر نماز نہ ہوگی، دیکھو جابر بن عبداللہ صحابی اس حدیث کا یہی مطلب بیان فرماتے ہیں، دوسرے جب حدیث صحیح سے ثابت ہو چکا ہے:**"من کان له إمام فإن قرأته له قراء ة"**. (۳) جو کسی امام کے پیچھے نماز پڑھے اس کی قرأت اس کے لیے بھی قرأت ہے تو اب یہ کہنا صحیح نہیں کہ مقتدی نے سورۂ فاتحہ نہیں پڑھی، جب امام نے پڑھ لی ہے تو اس نے بھی حکماً پڑھ لی ہے، گو زبان سے نہیں پڑھی؛ کیوں کہ مقتدی کو حدیث صحیح میں قرأت امام کے وقت خاموش رہنے کا حکم ہے:**"إذا قرأ الإمام فانصتوا"** یہی قرآن میں حکم ہے: **﴿وإذا قرئ القراٰن فاستمعوا له وأنصتوا﴾**(۴)

دوسری دلیل:

"لا تفعلوا إلابأم القرآن فإنّه لاصلوٰة لمن لم یقرأ بھا".(الترمذی، أبوداؤد،النسائی) (۵)

نہ معلوم مؤلف تکمیل البرہان نے اس حدیث کو پورا کیوں نہیں لکھا۔ پوری حدیث یہ ہے کہ محمود بن الربیع کہتے ہیں میں نے عبادہ بن الصامت رضی اللہ عنہ کو امام کے پیچھے قرأت کرتے ہوئے سنا تو میں نے کہا کہ میں آپ کو امام کے

(۱) موطأ الإمام مالک،ت:الأعظمی،ماجاء فی أم القرآن (ح: ۲۷۶)/شرح معانی الآثار،باب القراء ة خلف الإمام (ح: ۱۳۰۰)/سنن الترمذی،باب ما جاء فی ترک القراء ة خلف الإمام إذا جھر الإمام بالقراء ة: ۷۲/۱ (ح:۳۱۳) بیت الأفکار،انیس

(۲) صحیح البخاری،کتاب الأذان،باب وجوب القراء ة للإمام والمأموم: ۱۵۷/۱ (ح:۷۵٦)/الصحیح لمسلم،کتاب الصلاة،باب وجوب قراء ة الفاتحة فی کل رکعة: ۱٦۹/۱ (ح:۳۹٤)بیت الأفکار،انیس

(۳) تقدم تخریجه.انیس

(۴) سورة الأعراف:۲۰٤.انیس

(۵) سنن الترمذی،کتاب الصلاة،باب ماجاء فی القراء ة خلف الإمام: ۷۲/۱ (ح:۳۱۲) بیت الأفکار/سنن أبی داؤد،باب من ترک القراء ة فی صلاته بفاتحة الکتاب: ۲۱۷/۱ (ح:۸۲۳)،المکتبةالعصریة صیدا/سنن النسائی، إیجاب قراء ة فاتحة الکتاب فی الصلاة: ۱۳۷/۲ (ح:۹۱۰) المطبوعات الإسلامیة حلب،انیس

پیچھے قرأت کرتے ہوئے دیکھتا ہوں، نہ معلوم آپ نے قصداً ایسا کیا ہے یا سہو ہوگیا ہے۔ فرمایا: میں نے سہو نہیں کیا بلکہ قصداً قرأت کی ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سب کو ایک نماز پڑھائی، جس میں جہر کیا جاتا ہے تو آپ کو قرأت میں الجھن ہوئی، نماز کے بعد فرمایا: کیا تم لوگ میرے ساتھ قرأت کرتے ہو؟ لوگوں نے کہا: ہاں! فرمایا: ”**لاتفعلوا إلا بأم القراٰن فإنّه لا صلوٰة لمن لم يقرأ بها**“. ایسا مت کرو، مگر ام القرآن (پڑھ سکتے ہو) جو اس کو نہ پڑھے اس کی نماز نہیں۔ اس حدیث کو اگر صحیح مان لیا جائے تو اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ صحابہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھے بغیر قرأت کرتے تھے، جبھی تو آپ کو دریافت کرنا پڑا کہ تم میرے ساتھ قرأت کرتے ہو؟ اگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے امام کے پیچھے قرأت کا حکم دیا ہوتا تو اس سوال کی ضرورت ہی نہ ہوتی۔ اس کے بعد جب معلوم ہوا کہ وہ امام کے پیچھے قرأت کرتے ہیں تو فرمایا: ایسا نہ کرو، مگر فاتحہ (پڑھ سکتے ہو)، اس سے وجوب ثابت نہیں ہوسکتا، صرف اباحت مفہوم ہوتی ہے؛ کیوں کہ اصول فقہ میں ثابت کر دیا گیا ہے: ”**أن الاستثناء بعد الحظر إباحة و إطلاق**“(۱) کہ نہی کے بعد جو استثناء ثابت ہوتا ہے، وہ اباحت کے لیے ہوتا ہے، وجوب کے لیے نہیں ہوتا اور یہ ہم کو مضر نہیں؛ کیوں کہ سکتات امام کے وقت نماز جہری میں ہم مقتدی کی قرأت کو جائز کہتے ہیں اور خصم کو مضر ہے؛ کیوں کہ وہ اباحت کا قائل نہیں؛ بلکہ وجوب کا مدعی ہے اور ہماری تاویل کی تائید طبرانی کی روایت سے ہوتی ہے، جو مجمع الزوائد میں حضرت عبادۃ بن الصامت ہی سے مروی ہے:

”**أن رسول اللّٰه صلّى اللّٰه عليه وسلّم قال من قرأخلف الإمام فليقرأ بفاتحة الكتاب**“.(۱۸۶/۱)

اور اس کے راویوں کو ثقہ کہا گیا ہے؛ یعنی جو کوئی امام کے پیچھے قرأت کرنا چاہے، وہ سورہ فاتحہ پڑھ لیا کرے اور مجمع الزوائد ہی میں امام احمد کے حوالہ سے ایک صحابی سے یہ روایت بھی ہے:

قال رسول اللّٰه صلّى اللّٰه عليه وسلّم لعلكم تقرؤن والإمام يقرأ قالها ثلثًا قالوا إنا لنفعل ذٰلک قال فلا تفعلوا إلاأن يقرأ أحدكم بفاتحة الكتاب في نفسه،رواه أحمد ورجاله رجال الصحيح.(۱۸۶/۱)(۲)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ سے فرمایا: شاید تم امام کے ساتھ قرأت کرتے ہو؟ تین بار دریافت فرمایا، صحابہ نے کہا: بیشک ہم ایسا کرتے ہیں، فرمایا: ایسا نہ کرو، مگر یہ کہ کوئی سورہ فاتحہ اپنے دل میں پڑھ لے۔ اس کو امام احمد نے روایت کیا ہے اور اس کے راوی صحیح کے راوی ہیں۔

---

(۱) إذا وردت صيغة ”افعل“بعد الحظر وهو النهي فماذا تقتضي؟لقد اختلف العلماء في ذلک على مذاهب، المذهب الأول: أنها تقتضي الإباحة وهومذهب كثير من العلماء منهم الإمام مالک وأحمد والشافعي في ظاهر كلامه وهو اختيار بعض الحنفية وأكثر الحنابلة وأكثر الفقهاء.(المهذب في علم أصول الفقه المقارن،المطلب التاسع إذا ورد الأمر بعد النهي ما ذا تقتضي؟:۱۳۶۱/۳ ،مكتبة الرشدالرياض.انيس)

(۲) مجمع الزوائد،باب القراءة في الصلاة (ح:۲۶۵۱-و-۲۶۵۶)انيس

اس سے واضح ہوا کہ سورۂ فاتحہ بھی زبان سے پڑھنے کی اجازت نہیں، صرف دل دل میں پڑھنے کی اجازت ہے اور اس کو کوئی بھی منع نہیں کرتا اور یہ دعویٰ غلط ہے کہ دل کی قرأت کو قرأت نہیں کہا جاتا؛ کیوں کہ عرفاً اس کو بھی قرأت کہا جاتا ہے؛ چنانچہ اگر کوئی قسم کھالے کہ میں زید کا خط نہیں پڑھوں گا اور پھر اس کے خط کو دیکھ لے اور مضمون سمجھ لے، مگر زبان سے نہ پڑھے، حانث ہوجائے گا اور قسم کا کفارہ دینا پڑے گا، البتہ جہاں شریعت نے قرأت فرض کی ہے، وہاں بغیر زبان سے پڑھے، فرض ادا نہ ہوگا اور حدیث عبادہ سے مقتدی کے ذمہ قرأت فاتحہ کا وجوب ثابت نہیں ہوتا، صرف اباحت ثابت ہوتی ہے اور وہ دل میں پڑھنے سے بھی ادا ہوجائے گی۔ دوسرے اس پوری حدیث کے سیاق سے معلوم ہوتا ہے کہ محمود بن ربیع نے حضرت عبادہ کے سوا کسی صحابی کو امام کے پیچھے قرأت کرتے ہوئے نہ دیکھا تھا، صرف حضرت عبادہ کو دیکھا تھا تو شبہ ہوا یہ قصداً ایسا کررہے ہیں، یا سہواً اور محمود بن ربیع صحابی صغیر ہیں، اجلہ صحابہ کے دیکھنے والے ہیں، ان کا قرأت خلف الامام پر انکار اور تعجب کرنا، خود اس کی دلیل ہے کہ امام کے پیچھے قرأت فاتحہ لازم نہیں اور حضرت عبادہ کی حدیث سے بھی وہ قرأت فاتحہ کا وجوب نہیں سمجھے، ورنہ اپنی گزشتہ نمازوں کا اعادہ کرتے، مگر نہ انہوں نے اعادہ کیا، نہ حضرت عبادہ نے اعادہ کرنے کا امر کیا، پس یہ حدیث مقتدی کو امام کے پیچھے قرأت کی اجازت فاتحہ کی اجازت دے رہی ہے، وجوب کو بیان نہیں کررہی (ہے) اور ہم بھی سکتات امام میں مقتدی کے لیے قرأت فاتحہ کی اجازت کے قائل ہیں اور سکتات امام کی شرط اپنی طرف سے ہم نہیں لگارہے؛ بلکہ بعض احادیث میں یہ قید صراحۃً موجود ہے، جو گو ہمارے نزدیک سند کے لحاظ سے صحیح نہیں، مگر امام بیہقی نے جزء القراءۃ میں بطور حجت کے بیان کیا ہے کہ عبداللہ بن عمرو بن العاص سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جب تم امام کے ساتھ ہو تو اس کی (قرأت) سے پہلے، یا جب وہ سکتہ کرے، ام القرآن پڑھ لیا کرو۔ بیہقی نے فرمایا ہے کہ یہ مرفوعاً صحیح نہیں موقوفاً صحیح ہے؛ یعنی یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد نہیں؛ بلکہ عبداللہ بن عمرو صحابی کا قول ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ جو صحابہ امام کے پیچھے قرأت فاتحہ کرتے تھے، امام کے ساتھ قرأت نہ کرتے تھے؛ بلکہ اس کی قرأت سے پہلے یا سکتہ کی حالت میں کرتے تھے، پھر یہ ساری گفتگو اس صورت میں ہے کہ حدیث عبادہ میں **"إلا بأمّ القراٰن فإنّه لا صلاة لمن لم يقرأبها"**(۱) کی زیادت کو صحیح مان لیا جائے، مگر محدثین کو اسی میں کلام ہے، چنانچہ موفق بن قدامہ (یہ حنابلہ میں بہت بڑے امام محدث اور فقیہ ہیں، ان کی کتاب المغنی کو کتب اسلام میں بے نظیر مانا گیا ہے۔) کتاب المغنی میں فرماتے ہیں:

فأما حديث عبادة الصحيح، فهو محمول على غير المأموم... وقد روى أيضاً موقوفاً عن جابر

(۱) صحيح البخاري، كتاب الأذان، باب وجوب القراءة للإمام والمأموم: ۱/۱۵۷ (ح:۷۵۶) انيس

... وحدیث عبادة الأخر، لم یروہ غیر ابن إسحاق، کذٰلک قالہ الإمام أحمد وقد رواہ أبو داؤد عن مکحول عن نافع بن محمود بن الربیع الأنصاری وھو أدنٰی حالاً من ابن إسحاق فإنہ غیر معروف من أھل الحدیث. (۱/۶۰۶)(۱)

یعنی: حضرت عبادہ کی جو حدیث صحیح ہے، وہ تو مقتدی کے سوا دوسروں پر محمول ہے، چنانچہ حضرت جابر نے یہی فرمایا ہے اور ابوداؤد نے اس حدیث کو مکحول سے نافع بن محمود سے روایت کیا ہے اور وہ ابن اسحٰق سے بھی ادنی ہے؛ کیوں کہ وہ محدثین کے نزدیک معروف نہیں (بلکہ مجہول ہے)۔

تائید حنفیہ از علامہ ابن تیمیہ:

شیخ الاسلام حافظ ابن تیمیہ نے رسالہ تنوع العبادات میں فرمایا ہے کہ نماز میں (سکتہ کے متعلق) لوگوں کے تین قول ہیں: ایک یہ کہ نماز میں کوئی سکتہ نہیں ہے، جیسے امام مالک کا مذہب ہے، ان کے نزدیک ثنا اور تعوذ نہیں ہے اور قرأت امام میں بھی سکتہ نہیں ہے۔ دوسرا قول یہ ہے کہ نماز میں صرف ایک سکتہ ثنا و تعوذ کے لیے ہے، جیسے امام ابوحنیفہ کا مذہب ہے؛ کیوں کہ یہ حدیث (جس کو شیخین نے حضرت ابوہریرہ سے روایت کیا ہے کہ یارسول اللہ آپ جو تکبیر اور قرأت کے درمیان سکتہ کرتے ہیں، اس میں آپ کیا کہا کرتے ہیں؟) اس سکتہ پر دلالت کرتی ہے۔ تیسرا قول یہ ہے کہ نماز میں دو سکتے ہیں، جیسا سنن کی روایات میں ہے، مگر یہ سکتہ قرأت سے فارغ ہونے کے بعد (رکوع سے پہلے) ہے اور یہی صحیح ہے۔ ایک روایت میں یہ بھی ہے کہ آپ سورۂ فاتحہ سے فارغ ہوکر سکتہ کرتے تھے، امام شافعی اور امام احمد کے اصحاب میں بعض لوگوں کا قول (اس روایت کی بنا پر) یہ ہے کہ نماز میں تین سکتے مستحب ہیں، سورہ فاتحہ کے (بعد والے) سکتہ کو امام شافعی کے اصحاب اور بعض اصحاب احمد نے مقتدی کی قرأت فاتحہ کے لیے قرار دیا ہے، مگر صحیح یہ ہے کہ صرف دو سکتے مستحب ہیں۔ حدیث (صحیح) میں اس کے سوا کچھ نہیں اور ایک غلط روایت دو میں سے ہے، ورنہ تین سکتے ہوجائیں گے اور امام احمد سے یہی منصوص ہے کہ صرف دو سکتے مستحب ہیں اور دوسرا قرأت سے فارغ ہونے کے بعد راحت کے لیے اور قرأت اور رکوع میں فصل کرنے کے لیے ہے اور سورۂ فاتحہ کے بعد سکتہ کرنے کو امام احمد اور امام مالک اور امام ابوحنیفہ مستحب نہیں سمجھتے اور جمہور بھی ان کو مستحب نہیں سمجھتے کہ امام اس غرض سے سکتہ (طویلہ) کرے کہ مقتدی سورۂ فاتحہ پڑھ لے؛ کیوں کہ جب امام جہر سے قرأت کرے، اس وقت مقتدی کے ذمہ جمہور کے نزدیک قرأت واجب یا مستحب نہیں؛ بلکہ قرأت کرنا مقتدی کو منع ہے اور اگر امام کے ساتھ اس حالت میں مقتدی قرأت کرے تو اس کی نماز فاسد ہے یا نہیں؟ امام احمد کے مذہب میں اس کے متعلق دو قول ہیں اور عامۂ سلف

(۱) المغنی، فصل: ویکرہ أن یتطوع الإمام فی موضع صلاتہ المکتوبۃ مسألۃ: قال والمأموم إذا سمع قراءۃ الإمام فلا یقرأ بالحمد، دار عالم الریاض، انیس

صالحین جو امام کے پیچھے قرأت کو مکروہ کہتے ہیں، یہ کراہت اس صورت میں ہے، جب کہ امام جہر سے قرأت کر رہا ہو اور اکثر ائمہ سورۂ فاتحہ کے بعد سکوت طویل نہیں کرتے اور جہری نماز میں امام کے پیچھے قرأت کرنے والے بہت کم لوگ تھے، اس سے تو کتاب اللہ (قرآن) میں بھی منع کیا گیا ہے اور حدیث میں بھی اور جمہور سلف وخلف اسی پر ہیں کہ امام کے پیچھے جہری نماز میں قرأت مکروہ ہے۔ بعض علما اس طرف گئے ہیں کہ جس وقت امام جہر سے قرأت کر رہا ہو، مقتدی فاتحہ پڑھے، اگر نہ پڑھے گا تو اس کی نماز باطل ہونے میں اختلاف ہے۔ غرض نزاع طرفین سے ہے؛ لیکن جو لوگ امام کے ساتھ قرأت کرنے سے مقتدی کو منع کرتے ہیں، ان کے ساتھ جمہور سلف وخلف بھی ہیں اور کتاب اللہ اور سنت صحیحہ بھی ہے اور جو لوگ اس حالت میں مقتدی پر قرأت کو واجب کہتے ہیں، ان کی حدیث کو ائمہ نے ضعیف کہا ہے، ابوداؤد نے اس کو روایت کیا ہے اور ابوموسیٰ اشعری کی حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ فرمان: ﴿إذا قرأ فانصتوا﴾ کہ جب امام قرأت کرے، خاموش رہو، امام احمد بن حنبل اور اسحٰق (بن راہویہ) اور مسلم بن الحجاج وغیرہم کے نزدیک صحیح ہے، ان سب نے اس کو صحیح قرار دیا ہے، بخلاف اس حدیث کے (جس سے مقتدی پر امام کے ساتھ قرأت کو واجب کیا جاتا ہے)؛ کیوں کہ وہ صحیح میں شامل نہیں کی گئی اور بہت وجوہ سے اس کا ضعیف ہونا ثابت ہے اور حقیقت میں وہ عبادہ بن الصامت کا قول ہے (رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد نہیں)۔ (۸۵-۸۶)

حدیث عبادہ کی سند میں اضطراب ہے:

علامہ ابن تیمیہ رحمہ اللہ کا درجہ علم اسناد وحدیث میں جتنا بلند ہے، ظاہر یہ اس کا انکار نہیں کر سکتے، کیا مؤلف تکمیل البرہان (۱) نے علامہ کی کتابوں کا بھی مطالعہ نہیں کیا کہ حدیث عبادہ کو بروایت محمد بن اسحٰق صحیح کہنے لگے؛ حالانکہ اس کی سند میں اس قدر اضطراب ہے کہ اگر حنفیہ میں سے کوئی عالم بھی ایسی مضطرب حدیث کو اپنی حجت میں پیش کرتا تو ظاہر یہ آسمان سر پر اٹھا لیتے کہ حنفیہ کو علم اسناد وعلل سے مس نہیں، اسی لیے ایسی حدیثیں حجت میں لاتے ہیں۔ جوہر نقی میں ہے کہ حافظ عبدالحق (اشبیلی) نے اپنی کتاب الاحکام میں فرمایا ہے کہ اس حدیث کو اوزاعی نے مکحول سے عبداللہ بن عمر سے روایت کیا ہے اور (حافظ ابن عبدالبر کی کتاب) التمہید میں ہے کہ اس حدیث (کی سند) محمد بن اسحاق کی مخالفت کی گئی ہے اس کو اوزاعی نے مکحول سے رجاء بن حیوہ سے عبداللہ بن عمرو سے روایت کیا ہے، پھر حدیث بیان کی (اور امام اوزاعی کا درجہ محمد بن اسحاق سے بہت زیادہ بلند ہے وہ حدیث وفقہ میں اہل شام کے امام ہیں) اور امام طحاوی

(۱) مؤلف تکمیل نے اس مقام پر حضرت مولانا احمد علی محدث سہارنپوری رحمۃ اللہ علیہ پر اعتراض کیا ہے کہ ''انہوں نے الدلیل القوی میں لکھا ہے کہ عبادۃ بن الصامت کی روایت نسائی وابوداؤد کی سند میں نافع بن محمود واقع ہے اور اس کو تقریب میں مستور الحال لکھا ہے، الخ؛ حالانکہ امام ابوحنیفہ کے نزدیک مستور الحال کی روایت مقبول ہے''۔ اس کا جواب یہ ہے کہ مستور کی روایت اس وقت مقبول ہے، جب ثقات معروفین کے خلاف نہ ہو اور یہاں نافع نے جو زیادتی کی ہے وہ ثقات کے خلاف ہے، دوسرے اس کی سند میں اضطراب ہے اور حدیث مضطرب بالاتفاق ضعیف ہے۔ ظ

نے اس حدیث کو رجاء بن حیوہ کے واسطہ سے محمود بن ربیع سے روایت کیا ہے اور حضرت عبادہ پر موقوف کر دیا (رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب نہیں کیا) اور دارقطنی نے اپنی سنن میں اس کو مکحول سے عبادۃ بن الصامت سے مرسلاً روایت کیا ہے (یعنی سند منقطع ہے، مکحول اور حضرت عبادہ کے درمیان واسطہ حذف ہے، جزء القرأۃ بیہقی ص:۴۴ میں بھی اسی طرح ہے، پھر امام بیہقی نے دوبارہ اس کو مکحول سے نافع بن محمود سے عبادہ سے روایت کیا ہے۔ ابوداؤد میں بھی اسی طرح (نافع بن محمود کے واسطہ سے) اور اس کو روایت کیا ہے (اور نافع بن محمود مجہول ہے) ایک طریق میں جس کو حاکم نے مستدرک میں ذکر کیا ہے، اس حدیث کو مکحول نے محمود سے ابونعیم سے حضرت عبادہ سے روایت کیا ہے اور یہ ابونعیم معلوم نہیں کون ہے، حاکم نے کہا: وہ وہب بن کیسان ہے اور ابن صاعد نے کہا کہ وہ مؤذن (جامع دمشق ہے)، دارقطنی نے اپنی سنن میں ایسا ہی کہا ہے اور حافظ نے اصابہ میں اس حدیث کو دوسرے طریق سے نقل کیا ہے، اس میں مکحول نے نافع سے محمود بن الربیع سے عبادۃ بن الصامت سے روایت کیا ہے، جس حدیث کی سند میں اختلافات ہوں، اس کے اضطراب میں کس کو کلام ہوسکتا ہے۔

خلاصہ یہ کہ حضرت عبادہ کی صحیح حدیث وہی ہے، جس کو صاحب تکمیل نے سب سے پہلے بیان کیا ہے، اس میں مقتدی اور امام کا کوئی ذکر نہیں اور جس حدیث میں یہ مضمون ہے کہ مقتدی امام کے پیچھے فاتحہ کے سوا قرأت نہ کرے، وہ صحیح نہیں، اس کو محمد بن اسحٰق کے سوا کوئی روایت نہیں کرتا اور محمد بن اسحٰق کے بارے میں علامہ ذہبیؒ نے میزان میں فرمایا ہے:

"ماانفرد به ففيه نكارة فإن في حفظه شيئًا".(۲٤/۳) (۱)

جس حدیث کو وہ تنہا روایت کرے، اس میں نکارت ہے (یعنی ضعف ہے)؛ کیوں کہ اس کے حفظ میں کچھ (کسر) ہے اور حافظ ابن حجر نے درایہ کتاب الحج میں فرمایا ہے:

"وابن إسحاق لايحتج بما ينفرد به من الأحكام فضلاً عمّا إذاخالفه من هو اثبت منه"اهـ. (۲)

ابن اسحٰق احادیث احکام میں جس حدیث کو تنہا بیان کرے، حجت نہیں، چہ جائیکہ اپنے سے مضبوط راوی کی مخالفت کرے (تو اس صورت میں اصلاً حجت نہیں) اور ظاہر ہے کہ اس حدیث کا صحیح حصہ وہی ہے جو بخاری ومسلم نے روایت کیا ہے، محمد بن اسحٰق نے جو زیادت اس میں کی ہے، وہ ثقات کی روایت کے خلاف ہے، صحیح یہ ہے کہ وہ حضرت عبادۃ بن الصامت کا قول ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد نہیں ہے؛ جیسا علامہ ابن تیمیہ نے اس کی تصریح کی

(۱) میزان الاعتدال، محمدبن اسحاق بن حرب اللؤلؤی: ۴۷۵/۳، دارالمعرفة. انیس

(۲) الدراية في تخريج الهداية، باب الإحرام: ۱۹/۲، دارالمعرفة بيروت. انیس

ہے، پھر امام بیہقی نے جزء القراءۃ میں اور امام طحاوی نے معانی الآثار میں اس حدیث کو یوسف بن عدی سے عبید اللہ بن عمرو (رقی) سے ایوب سے ابوقلابہ سے حضرت انس سے بایں الفاظ روایت کیا ہے:

" قال: صلّى رسول اللّه صلى اللّه عليه وسلّم ثم أقبل بوجهه فقال أتقرؤن والإمام يقرأ فسكتوا فسألهم ثلثًا فقالوا: إنا لنفعل، قال فلا تفعلوا ". (۱)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز پڑھائی پھر ہماری طرف متوجہ ہوکر پوچھا کیا تم امام کی قرأت کے ساتھ قرأت کرتے ہو؟ سب خاموش رہے، آپ نے تین بار سوال کیا، صحابہ نے کہا: بیشک ہم ایسا کرتے ہیں، فرمایا: ایسا مت کرو۔

اس میں یہ نہیں ہے کہ مگر سورۂ فاتحہ پڑھ لیا کرو۔ اس پر بیہقی کا یہ فرمانا کہ یوسف بن عدی نے وہم کیا ہے کہ (سورۂ فاتحہ کے) استثنا کو چھوڑ دیا، قابل تسلیم نہیں؛ کیوں کہ یوسف بن عدی امام بخاری کے استاذ اور صحیح کے راویوں میں سے ہیں، کسی نے بھی اس کو صاحب وہم نہیں کہا، وہ محمد بن اسحاق سے زیادہ صاحب حفظ واتقان ہے۔ علامہ ذہبی کا قول اوپر گزر چکا ہے کہ محمد بن اسحٰق کے حافظہ میں کمی ہے، پس محمد بن اسحاق کی طرف وہم کی نسبت کرنا زیادہ مناسب ہے، نہ کہ یوسف بن عدی کی طرف، امام الفن یحییٰ بن معین نے فرمایا ہے کہ (حدیث عبادہ) میں جملہ استثنائیہ (إلا بأم القرآن) کی سند ایسی (قابل اعتبار) نہیں۔ (الدلیل القوی) اور اس کو امام احمد اور ایک جماعت نے ضعیف کہا ہے۔ (زیلعی)

حدیث عبادہ میں فصاعدا کی زیادت اہل حدیث پر حجت ہے:

بڑی عجیب بات یہ ہے کہ اہل ظاہر حدیث عبادہ میں **إلابام القرآن** کی زیادت پر تو اتنا زور دیتے ہیں؛ حالانکہ محمد بن اسحٰق کے سوا اس کا کوئی راوی نہیں اور اس حدیث میں **فصاعدًا** کی زیادت کو نہیں مانتے؛ حالانکہ امام مسلم نے اپنی صحیح میں اس کو روایت کیا اور صحیح قرار دیا ہے اور ابوداؤد نے بھی اس کو صحیح سند سے روایت کیا ہے۔ حدیث کے پورے الفاظ یہ ہیں:

عن عبادة بن الصامت رضى اللّه عنه أن رسول اللّه صلّى اللّه عليه وسلّم قال: لا صلاة لمن لم يقرأبأم القراٰن فصاعداً. (۲)

عبادۃ بن الصامت کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جو شخص سورہ فاتحہ اور کچھ زیادہ نہ پڑھے، اس کی نماز نہیں۔

اب اگر اس سے مقتدی کے ذمہ فاتحہ پڑھنے کو واجب کہا جائے گا تو کچھ زیادہ پڑھنے کو بھی واجب کہنا پڑے گا

(۱) كتاب الصلاة، باب القراءة خلف الإمام: ۱/ ۲۱۸ (ح: ۱۳۰۲) عالم الكتب، انيس

(۲) سنن أبى داؤد، كتاب الصلاة، باب من ترك القراءة فى صلاته ففاتحة الكتاب: ۱۰۸/۱ (ح: ۸۲۲) بيت الأفكار، انيس

کیوں کہ حدیث میں زیادہ پڑھنے کا بھی حکم موجود ہے؛ حالانکہ اس کا کوئی قائل نہیں، اس پر بعض محدثین کا یہ کہنا کہ لفظ ”فصاعداً“ کو معمر نے تنہا زیادہ کیا ہے، درست نہیں؛ کیوں کہ ابوداؤد کی سند میں سفیان بن عیینہ نے بھی معمر کی موافقت کی ہے، وہ بھی زہری سے معمر کی طرح روایت کرتے اور فصاعداً بڑھاتے ہیں، پھر صالح بن کیسان اور امام اوزاعی اور عبدالرحمٰن بن اسحٰق وغیرہ جیسے ثقات نے بھی زہری سے اسی طرح روایت کیا ہے، جیسا معمر نے بیان کیا ہے اور اس کی تائید ابوسعید خدری کی حدیث بھی کر رہی ہے، جس کے الفاظ یہ ہیں:

”أمرنا رسول اللّٰه صلّى اللّٰه عليه وسلّم أن نقرأ بفاتحة الكتاب وما تيسّر“ وإسناده صحيح عند أبي داؤد.(۱)

”رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہم کو سورۂ فاتحہ پڑھنے اور (اس کے ساتھ) جو آسان ہے پڑھنے کا حکم دیا ہے“، اس کو ابوداؤد نے صحیح سند سے روایت کیا ہے۔

اور ترمذی و ابن ماجہ نے اسی حدیث کو اس طرح روایت کیا ہے:

”لا صلاة لمن لم يقرأ بالحمد وسورة“.(۲)

اس شخص کی نماز نہیں جو الحمد اور سورت نہ پڑھے۔

اس کی سند حسن ہے، پس یہ دعویٰ قابل تسلیم نہیں کہ معمر نے تنہا زیادتی کی ہے، پھر معمر کا درجہ حفظ و اتقان میں محمد بن اسحٰق سے بہت بلند ہے، یہ امر انصاف سے بعید ہے کہ ابن اسحٰق کی زیادت کو قبول کیا جائے اور معمر کی زیادت کو رد کیا جائے تو اب اہل ظاہر کو اس کا قائل ہونا چاہیے کہ امام کے ساتھ مقتدی کے ذمہ سورۂ فاتحہ یا ایک سورت یا دو تین آیتیں پڑھنا بھی واجب ہے؛ حالانکہ وہ اس کے قائل نہیں، پس ہمارا مدعا ثابت ہوگیا کہ حضرت عبادہ کی حدیث مقتدی کے بارے میں نہیں؛ بلکہ امام اور منفرد کے حق میں ہے کہ ان پر سورۂ فاتحہ اور ایک سورت یا دو تین آیتیں پڑھنا واجب ہے، مقتدی کے ذمہ امام کے ساتھ قرأت واجب نہیں اور اگر کسی لفظ سے وجوب کا شبہ بھی ہوتا تھا تو حدیث عبادہ میں ابوداؤد کے اس لفظ سے ہر شبہ دور ہوگیا:

”إن كنتم لابد فاعلين فلا تفعلوا إلا بأم القرآن“. (فیض الباری:۲۷۳/۲)(۳)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اگر تم ضرور ہی امام کے پیچھے قرأت کرنا چاہتے ہو تو سورۂ فاتحہ کے سوا نہ پڑھو۔

اس سے ہر شخص خود ہی فیصلہ کرسکتا ہے کہ یہ عنوان وجوب کا ہے یا محض جواز کا، پھر جواز کو بھی سکتۂ امام کے ساتھ مقید کرنا ضروری ہے؛ کیوں کہ جہری نماز میں ساتھ ساتھ قرأت کرنا نص قرآن اور حدیث انصات کے خلاف ہوگا۔

(۱) سنن أبي داؤد، كتاب الصلاة، باب من ترك القراءة في صلاته بفاتحة الكتاب: ۱۰۸/۱(ح:۸۱۸) بيت الأفكار، انيس

(۲) سنن الترمذي، باب ماجاء في تحريم الصلاة وتحليلها (ح:۲۳۸) : ۳۱۷/۱، دار الغرب بيروت. انيس

(۳) فيض الباري على صحيح البخاري، باب وجوب القراءة للإمام والمأموم: ۳۴۲/۲، انيس

تیسری دلیل:

عن أبی هريرة عن النبی صلّی اللّٰه عليه وسلّم قال: من صلّی صلاة لم يقرأ فيها بأمّ القراٰن فهی خداج، ثلاثاً، غير تمام، فقيل لأبی هريرة: إنا نكون وراء الإمام، فقال إقرأبها فی نفسک. (مسلم)(۱)

یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جو کوئی ایسی نماز پڑھے جس میں سورۂ فاتحہ نہ پڑھے، وہ نماز ناقص ہے (تین بار فرمایا) کامل نہیں۔ ابو ہریرہ کے شاگرد نے کہا: ہم (کبھی) امام کے پیچھے ہوتے ہیں تو ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے جواب دیا کہ (ایسی حالت میں) سورۂ فاتحہ اپنے دل میں پڑھ لیا کرو۔

اس کے بعد مؤلف نے لفظ خداج اور تمام کے معنی میں بحث کی ہے، مگر ہر سمجھدار آدمی سمجھ سکتا ہے کہ حدیث کا جتنا حصہ مرفوع ہے، اس میں مقتدی کا کوئی ذکر نہیں اور حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کے شاگرد کا سوال بتلاتا ہے کہ مقتدی کے ذمہ قرأت کا واجب ہونا، اس کے نزدیک بھی حدیث سے مفہوم نہیں ہوا اور نہ قرأت خلف الامام اس کے نزدیک معروف تھی، اسی لیے تو سوال کی ضرورت ہوئی، پھر حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کے جواب کو مؤلف نے اس پر محمول کیا ہے کہ امام کے پیچھے آہستہ سورۂ فاتحہ پڑھ لی جائے، مگر "**إقرأ بها فی نفسک**" اس مفہوم میں صریح نہیں، ہمارے نزدیک مطلب یہ ہے کہ دل دل میں پڑھ لیا کرو اور ہم بتلا چکے ہیں کہ عرفاً قرأت قلبی کو بھی قرأت کہا جاتا ہے۔ اس حدیث سے سورۂ فاتحہ کی رکنیت ثابت کرنا اور مقتدی کے ذمہ امام کے پیچھے اس کو واجب کرنا زبردستی ہے۔

شاہ ولی اللہ کے قول کا جواب:

غنیۃ وغیرہ کی عبارتیں پیش کرنا اور شاہ ولی اللہ (۲) کے قول سے استدلال کرنا ظاہریہ کو زیب نہیں دیتا، اگر ان

(۱) كتاب الصلاة، باب وجوب قراءة الفاتحة فی كل ركعة: ۱۶۹/۱ (ح: ۳۹۵) بيت الأفكار، انيس

(۲) حجۃ اللہ البالغہ کا مطالعہ کرنے والا خوب جانتا ہے کہ شاہ صاحب فرض اور واجب دونوں کو رکن کہہ دیتے ہیں، ملاحظہ ہو!: ۹۵/۱، جس میں ضم سورت کو بھی رکن قرار دیا ہے؛ حالانکہ ضم سورت کسی کے نزدیک بھی فرض نہیں، صرف حنفیہ کے نزدیک واجب ہے۔ شاہ صاحب نے حجۃ اللہ البالغہ: ۷/۲ (أذكار الصلاة، وهيأتها المندوب إليها، دار الجيل، انيس) میں فرمایا ہے:

"وإن كان مأموماً وجب عليه الإنصات والاستماع، فإن جهر الإمام لم يقرأ إلا عند الإسكات وإن خافت فله الخيرة، فإن قرأ فليقرأ الفاتحة قراءة لا يشوش على الإمام وهٰذا أولى الأقوال عندی وبه يجمع بين أحاديث الباب، والسر فيه ما نص عليه من أن القراءة مع الإمام تشوش عليه وتفوت التدبر وتخالف تعظيم القرآن، ولم يلزم عليهم أن يقرؤوا سراً لأن العامّة متى أرادوا أن يصححوا الحروف بأجمعهم كانت لهم لجبة مشوشة، اهـ.

ترجمہ: اگر نمازی مقتدی ہو تو اس پر خاموش رہنا اور سننا واجب ہے اگر امام (قرأت) جہر (سے) کر رہا ہے تو مقتدی قرأت نہ کرے مگر سکتہ کے وقت اور اگر قرأت سری کر رہا ہے تو مقتدی کو اختیار ہے اگر قرأت کرنا چاہے تو سورۂ فاتحہ اس طرح پڑھے کہ اس کی قرأت سے امام کو تشویش نہ ہو۔ میرے نزدیک سب اقوال میں یہ بہتر ہے کہ جہری نماز میں مقتدی سکتہ امام میں قرأت کرے، ==

حضرات کے اقوال حجت ہیں تو دوسرے علما کے اقوال بھی حجت ہونے چاہئیں، جو فرماتے ہیں کہ اس سے صرف یہ معلوم ہوتا ہے کہ بغیر فاتحہ کے نماز ناقص ہوتی ہے، فاتحہ کی رکنیت پر کوئی دلالت نہیں، بغیر فاتحہ کے نماز کو باطل کہنا حدیث کے خلاف ہے، اس سے صرف فاتحہ کا وجوب ثابت ہوتا ہے اور حنفیہ قرأت فاتحہ کو امام اور منفرد پر واجب کہتے ہیں اور مقتدی کے لیے امام کی قرأت کافی ہے، وہ امام کی قرأت کے ذریعہ سے حکماً قاری ہے، جیسا مفصل گزر چکا ہے۔ حدیث مسلم و ابوداؤد میں صراحۃً مقتدی کو خاموش رہنے کا حکم ہے: **إذا قرأ فانصتوا.** (۱) یہی قرآن میں حکم ہے: ﴿**وإذا قرئ القرآن فاستمعوا له وأنصتوا**﴾ (۲) پس جواب ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کا یہ مطلب نہیں کہ امام کے ساتھ قرأت کرو؛ بلکہ مطلب یہ ہے کہ دل دل میں پڑھتے رہو، یا امام سے پہلے اور اس کے سکتات میں تنہا پڑھ لو، ساتھ ساتھ نہ پڑھو اور "**في نفسک**" کے معنی تنہا کے بھی آتے ہیں، جیسا حدیث (۳) صحیح قدسی میں وارد ہے:

فإن ذكرني في نفسه ذكرته في نفسي وإن ذكر في ملأ ذكرته في ملأ خير منه. (۴)

جو مجھے تنہا یاد کرے، میں اسے تنہا یاد کرتا ہوں اور جو مجھے جماعت میں یاد کرے، میں اس کو اس کی جماعت سے بہتر جماعت میں یاد کرتا ہوں۔

اس حدیث میں فی نفسہ کے معنی ہیں تنہا میں جیسا جماعت کے مقابلہ سے واضح ہے، پس ابو ہریرہ کے جواب کا بھی یہ مطلب ہوسکتا ہے کہ امام (۵) کے پیچھے تم سورۂ فاتحہ پڑھ لیا کرو، اس کے ساتھ ساتھ نہ پڑھو اور اس کو کوئی منع نہیں کرتا

== اور سری میں تشویش سے بچ کر قرأت کرے، اسی طرح اس باب کی تمام حدیثوں کو جمع کیا جاسکتا ہے اور اس میں راز یہ ہے کہ جس کی تصریح بھی حدیث میں ہے کہ امام کے ساتھ قرأت کرنا اس کو مشوش کرتا ہے اور اس سے تدبر فی القرآن فوت ہوتا ہے اور یہ صورت تعظیم قرآن کے بھی خلاف ہے اور سری نماز میں بھی مقتدیوں پر قرأت لازم نہیں کی گئی کیوں کہ عوام جب سب مل کر صحیح طور سے حروف کو ادا کرتے ہیں تو اس سے بھی ایک تشویشناک گونج پیدا ہوتی ہے۔

یہ ہے شاہ ولی اللہ صاحب کا مسلک قرأت خلف الامام کے بارے میں اگر ان کا قول حجت ہے تو صاحب تکمیل کو آگے کچھ بولنے کا حق نہیں۔ ظ

(۱) **الصحيح لمسلم، باب التشهد في الصلاة (ح: ٤٠٤)/ سنن أبي داؤد (ح: ٦٠٤) انيس**

(۲) **سورة الأعراف: ٢٠٤، انيس**

(۳) اسی طرح قولہ تعالیٰ ﴿**وقل لهم في أنفسهم قولاً بليغاً**﴾ میں ﴿**في أنفسهم**﴾ کی تفسیر "**وحداناً**" سے بھی کی گئی ہے۔ رشید احمد

(۴) **الصحيح للبخاري، باب قول الله تعالى ﴿ويحذركم الله نفسه﴾ (ح: ٧٤٠٥)/ الصحيح لمسلم، باب فضل الذكر والدعاء والتقرب إلى الله (ح: ٢٦٧٥) انيس**

(۵) زیادہ ظاہر مطلب یہ ہے کہ منفرداً نماز پڑھنے کی حالت میں پڑھ لیا کرو، جب قرأت سے منع کیا گیا تو دل شکنی کا مظنہ تھا، اس کے تدارک کی غرض سے فرمایا کہ یہ آرزو حالت انفراد میں پوری کرلیا کرو، اس کی نظیر یہ ہے کہ امام کو نماز میں تخفیف کا حکم فرمایا، اس سے یوں دل شکنی کا احتمال تھا کہ شاید کسی کو طویل نماز کی آرزو ہو، اس کے تدارک کے لیے فرمایا کہ حالت انفراد میں جتنی تطویل چاہو کرلو، ==

اور اس تاویل کی تائید اس روایت سے ہوتی ہے کہ جس کو امام بیہقی نے جزء القراءۃ :۵۴ میں اور حاکم نے مستدرک:۲/۲۳۸ میں حضرت ابو ہریرہ ہی سے بایں الفاظ روایت کیا ہے:

"من صلّٰی صلوۃ مکتوبۃ مع الإمام فلیقرأفاتحۃ الکتاب فی سکتاتہ" آہ.(۱)

اور جب کوئی نماز امام کے ساتھ پڑھے وہ اس کے سکتات میں سورۂ فاتحہ پڑھ لے۔

بیہقی نے تسلیم کیا ہے کہ مرفوعاً یہ حدیث صحیح نہیں، موقوفاً صحیح ہے؛ یعنی یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد نہیں؛ بلکہ حضرت ابو ہریرہ کا قول ہے، جس سے یہ امر واضح ہوگیا کہ حضرت ابو ہریرہ امام کے ساتھ قرأت مقتدی کو جائز نہیں سمجھتے، سکتات میں جائز کہتے ہیں، یہی ہمارا قول ہے۔

مولانا احمد علی صاحب محدث سہارنپوری پر اعتراض اور اس کا جواب:

مؤلف تکمیل البرہان نے حدیث ابو ہریرہ کی بحث میں بلا وجہ حدیث عبادہ کے متعلق ایک بحث چھیڑ دی ہے کہ مولانا احمد علی صاحب حنفی (محدث) سہارنپوری نے حدیث عبادہ کی سند میں نافع بن محمود کی وجہ سے کلام کیا ہے کہ وہ مستور الحال ہے؛ حالانکہ مستور کی روایت امام ابو حنیفہ کے نزدیک مقبول ہے، پھر عبادہ کی روایت کو امام ابوداؤد چار طرق سے لائے ہیں، ان چاروں میں سے صرف ایک سند میں نافع بن محمود ہے، پھر نافع بن محمود کو امام ذہبی نے کاشف (۲) میں ثقہ کہا ہے اور دار قطنی نے اس کی سند کو حسن اور راویوں کو ثقہ کہا ہے (جس سے نافع کا ثقہ ہونا بھی لازم آ گیا) اور ابن حبان نے بھی اس کو ثقات میں ذکر کیا ہے۔

اس طویل کلام کا جواب یہ ہے کہ مولانا احمد علی صاحب نے وہی کہا ہے، جو موفق ابن قدامہ حنبلی نے کتاب المغنی میں فرمایا ہے کہ حدیث عبادہ میں یہ زیادت کہ "مگر امام کے پیچھے فاتحہ پڑھ لیا کرو" الخ، صرف ابن اسحٰق روایت کرتا ہے اور ابوداؤد نے اس کو نافع بن محمود سے بھی روایت کیا ہے اور وہ ابن اسحٰق سے بھی ادنیٰ ہے؛ کیوں کہ اہل حدیث کے نزدیک غیر معروف ہے؛ جیسا ہم تفصیل سے بیان کر چکے ہیں، پھر امام احمد اور یحییٰ بن معین نے بھی اس زیادت کو ضعیف کہا ہے

== اسی طرح قرآن کریم میں جب ﴿وإذا قرئ القرآن فاستمعوا له وانصتوا﴾ فرمایا تو ممکن تھا کہ تلاوت سے ممانعت کی وجہ سے دل ٹوٹ جائیں، اس لیے یوں تسلی دی گئی: ﴿واذکر ربّک فی نفسک تضرّعاً وخیفة ودون الجهر من القول بالغدو والأصال ولا تکن من الغفلین﴾ (سورة الأعراف: ۲۰۵، انیس) یعنی اوقات میں کوئی کمی نہیں ہر وقت پڑھ سکتے ہیں، صرف حالت اقتداء میں امام کی رعایت کی وجہ سے نہ پڑھیں، یہاں بھی "فی نفسک" کی تفسیر ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے "وحدک" منقول ہے اور یہ تفسیر ذکر سراً کی تفسیر سے اس لیے بہتر ہے کہ دون الجہر من القول سراً کو شامل ہے۔ رشید احمد

(۱) کتاب الصلاۃ، باب التأمین: ۳۵۲/۱ (ح: ۸۷۱) دار الحرمین للطباعة والنشر، انیس

(۲) الکاشف، حرف النون: ۳۱۵/۲، مؤسسة علوم القرآن جدة. انیس

اور ابن حبان نے اگر چہ نافع کو کتاب الثقات میں داخل کیا ہے، مگر اس کی حدیث کو معلل کہا ہے اور اس ایک حدیث کے سوا نافع سے اور کوئی روایت نہیں، ان حضرات کے سامنے دار قطنی کی توثیق وتحسین کا جو درجہ ہے، اہل علم خود سمجھ سکتے ہیں، علامہ ابن تیمیہ نے بھی اس کو ضعیف کہہ کر فیصلہ کر دیا ہے کہ یہ حضرت عبادہ کا قول ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد نہیں، پھر ہم بتلا چکے ہیں کہ اس حدیث کے تمام طرق کو دیکھنے سے صاف ظاہر ہو جاتا ہے کہ اس کی سند میں بہت اضطراب ہے اور حدیث مضطرب بغیر رفع اضطراب کسی کے نزدیک بھی حجت نہیں بن سکتی اور علت اضطراب کے رفع کرنے کی وہی صورت ہے، جو امام بخاری ومسلم نے اختیار کی ہے کہ اس حدیث کا وہی حصہ صحیح میں داخل کیا، جس کو ثقات نے روایت کیا ہے، جس میں امام اور مقتدی کا کوئی ذکر نہیں اور جس حصہ کے راوی محمد بن اسحٰق اور نافع بن محمود جیسے ہیں، اس کو صحیح میں شامل نہیں کیا اور اصول حدیث میں طے ہو چکا ہے کہ جب حدیث مضطرب کے چند طرق میں سے ایک طریق رائج ہو جائے، وہی مقبول ہوگا، بقیہ طریق مردود ہوں گے، پس مولانا احمد علی صاحب حنفی محدث سہارنپوری نے کوئی مغالطہ نہیں دیا، خود صاحب تکمیل البرہان ہی جاہلوں کو دھوکہ دے رہے ہیں۔

چوتھی دلیل:

چوتھی دلیل صاحب تکمیل کی وہ ہے جسے ہم مجمع الزوائد کے حوالہ سے اوپر بیان کر چکے ہیں کہ ایک صحابی سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ سے فرمایا: شاید تم امام کے ساتھ قرأت کرتے ہو؟ تین بار دریافت فرمایا، صحابہ نے کہا: بیشک ہم ایسا کرتے ہیں، فرمایا: ایسا نہ کرو، مگر یہ کہ کوئی سورہ فاتحہ اپنے دل میں پڑھ لے، الخ۔

جاہلوں کو دھوکہ دینے کے لیے صاحب تکمیل نے اس حدیث کو اپنی دلیلوں میں شامل کر لیا؛ حالانکہ یہ حنفیہ کی دلیل ہے؛ کیوں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا صحابہ سے یہ دریافت کرنا: کیا تم امام کے ساتھ قرأت کرتے ہو؟ خود بتلا رہا ہے کہ امام کے ساتھ مقتدی کا پڑھنا حضور کو گوارا نہ تھا اور صحابہ کا بحالت اقتدا قرأت کرنا حضور کی اجازت سے نہ تھا، جبھی تو سوال کی نوبت آئی، اس پر بعض اہل حدیث کا یہ کہنا کہ ''سوال قرأت فاتحہ سے نہ تھا؛ بلکہ سورۂ فاتحہ سے زیادہ قرأت کے متعلق تھا''۔ غلط ہے؛ کیوں کہ دار قطنی کے الفاظ ہیں: **هل منكم من أحد يقرأ شيئا من القرآن، وحسنه.** (فيض الباري: ۲/۲۷۴)(۱) ''کیا تم میں سے کسی نے قرآن میں سے کچھ پڑھا ہے؟ دار قطنی نے اس کی سند کو حسن کہا ہے'' اور اس لفظ کا فاتحہ وغیر فاتحہ کو عام ہونا ظاہر ہے، اس کے بعد آپ کا ارشاد: ''**إلا أن يقرأ أحدكم بفاتحة الكتاب في نفسه**''(۲) بھی ہماری دلیل ہے کیوں کہ اس میں فی نفسہ کی قید موجود ہے کہ سورۂ فاتحہ دل دل

(۱) سنن الدارقطني، باب وجوب قراءة أم الكتاب في الصلاة، الخ (ح: ۱۲۲۰): ۲/۱۰۱، مؤسسة الرسالة. انيس

(۲) سنن الدارقطني، باب ذكر نسخ التطبيق والأمر بالأخذ بالركب (ح: ۱۲۸۸): ۲/۱۴۰، مؤسسة الرسالة. انيس

میں پڑھ لیا کرو، یا اس کے معنی منفرد کے ہیں؛ یعنی امام کے ساتھ نہ پڑھو۔ اس (۱) سے پہلے یا اس کے سکتہ میں پڑھ لیا کرو اور ہم حدیث قدسی سے فی نفسہ کا بمعنی منفرد آنا بتلا چکے ہیں۔ مؤلف تکمیل کا یہ دعویٰ کہ فی نفسہ کے معنی آہستہ پڑھنے کے ہیں، قابل قبول نہیں، علماء مالکیہ میں سے بعض اجلہ علماء نے حدیث ابو ہریرہ **"اقرأ بها في نفسك"** کی تفسیر میں یہی کہا ہے کہ سورۂ فاتحہ دل دل میں پڑھ لیا کرو۔ (شرح مسلم للنووی وفتح الملهم) (۲) پھر ہم بتلا چکے ہیں کہ نہی کے بعد استثناء وجوب کے لیے نہیں ہوتا، صرف اباحت کے لیے ہوتا ہے تو اس حدیث سے مقتدی کے لیے قرأت فاتحہ کا صرف جواز ثابت ہوگا، نہ کہ وجوب اور یہ صاحب تکمیل کے لیے مضر ہے؛ کیوں کہ وہ تو فرضیت اور رکنیت کے مدعی ہیں اور اس حدیث سے مقتدی کے حق میں رکنیت تو کجا، وجوب بھی ثابت نہیں ہوتا۔

پانچویں دلیل:

حضرت انس کی حدیث؛ جس کا مضمون وہی ہے، جو اس سے پہلی حدیث میں صحابی مجہول کی حدیث کا ہے، اس میں بھی وہی فی نفسہ کا لفظ ہے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا تین بار دریافت فرمانا بھی: کیا تم نماز میں امام کے ساتھ ساتھ قرأت کرتے ہو؟ ہم بتلا چکے ہیں کہ یہ حدیث اصل میں حنفیہ کی دلیل ہے، جس کو بطور مغالطہ کے اہل ظاہر اپنی دلیل بنانا چاہتے ہیں، پھر ابن حبان نے کتاب الضعفاء میں ابن سالم کے واسطہ سے حضرت انس سے روایت کیا ہے:

"قال رسول الله صلّى الله عليه وسلّم: من كان له إمام فقرأة الإمام له قراءة". (۳)

"رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جس کے لیے کوئی امام ہو (اور یہ اس کا مقتدی ہو) تو امام کی قرأت اس کے لیے بھی قرأت ہے"۔

ابن حبان نے ابن سالم میں کلام کیا ہے، مگر تقریب میں اس کو ثقہ کہا ہے اور تہذیب التہذیب میں ہے: **قال أبو حاتم : لا بأس به.** (۱۷۷/۹) (۴) ابو حاتم نے کہا اس میں کوئی بات نہیں ہے اور یہ لفظ توثیق کے لئے مستعمل ہے، اگر نافع بن محمود کو ذہبی کے قول سے ثقہ کہا جاسکتا ہے تو ابن سالم کو ابو حاتم کے قول سے بدرجہ اولیٰ ثقہ کہا جائے گا، پس دونوں حدیثوں کو ملانے سے ہمارے قول کی تائید ہوتی ہے کہ اس حدیث سے مقتدی کے لیے صرف جواز قرأت ثابت ہوتا ہے، وجوب ثابت نہیں ہوتا اور جواز بھی اس طرح کہ دل دل میں پڑھے، امام سے پہلے یا سکتہ امام میں پڑھے ساتھ ساتھ نہ پڑھے۔

---

(۱) گزشتہ حاشیہ میں ہم بیان کر چکے ہیں کہ اس کے ظاہر معنی یہ ہیں کہ انفراداً نماز پڑھنے کی حالت میں پڑھو۔ رشید احمد

(۲) شرح النووي على مسلم، باب وجوب قراءة الفاتحة في كل ركعة: ۱۰۳/٤، دار إحياء التراث العربي. انيس

(۳) كتاب المجروحين لابن حبان، باب الغين: ۲۰۲/۲، دار الوعي حلب. انيس

(۴) تهذيب التهذيب، محمد مع السين في الآباء: ۱۷۷/۹، دائرة المعارف النظامية. انيس

چھٹی دلیل:

چھٹی حدیث صاحب تکمیل نے عمرو بن شعیب عن ابیہ عن جدہ کی سند سے بیان کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تم میرے پیچھے قرأت کرتے ہو؟ صحابہ نے کہا: ہاں ہم جلدی جلدی پڑھتے جاتے ہیں، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ایسا نہ کرو، مگر سورۂ فاتحہ (پڑھ لیا کرو) پھر عون المعبود سے نقل کر دیا کہ عمرو بن شعیب عن ابیہ عن جدہ کی سند امام بخاری وغیرہ کے نزدیک حجت ہے، مغالطہ اور دھوکہ دینا اسی کا نام ہے، ان کو عمرو بن شعیب عن ابیہ عن جدہ کا حجت ہونا بعد میں ثابت کرنا تھا، پہلے یہ بتلانا ضروری تھا کہ امام بخاری یا بیہقی سے عمرو بن شعیب تک راویوں کا کیا حال ہے؟ اگر جزء القرأۃ بخاری اور بیہقی کو اچھی طرح دیکھ لیا جاتا تو معلوم ہو جاتا کہ عمرو بن شعیب سے روایت کرنے والا ضعیف ہے۔

"قال البيهقي ومحمّد بن عبيد الله بن عميروإن كان غيرمحتج به وكذٰلك بعض من تقدم ممّن رواه عن عمرو بن شعيب فلقراءة المأموم فاتحة الكتاب في سكتة الإمام شواهد صحيحة عن عمرو بن شعيب عن أبيه عن جده خبراً عن فعلهم وعن أبي هريرة وغيره من فتواهم". (ص: ٥٤)

امام بیہقی فرماتے ہیں کہ اگر چہ محمد بن عبید اللہ بن عمیر سے حجت نہیں قائم ہو سکتی، (کیوں کہ وہ ضعیف متروک ہے) بعض محدثین نے اس کو کاذب بھی کہا ہے۔ (لسان: ۲۱۶/۵)(۱) اسی طرح بعض اور لوگ بھی جو اس کو عمرو بن شعیب سے روایت کرتے ہیں (ان سے بھی حجت قائم نہیں ہو سکتی)، مگر امام کے سکتہ میں مقتدی کی قرأت فاتحہ کے لیے عبداللہ بن عمرو اور حضرت ابو ہریرہ وغیرہ سے صحیح روایات میں ان کے فعل اور فتویٰ کا بیان موجود ہے۔

اس میں امام بیہقی نے فیصلہ فرما دیا کہ عبداللہ بن عمرو اور حضرت ابو ہریرہ وغیرہ سے اس باب میں حدیث مرفوع ثابت نہیں، صرف ان کا فعل اور فتویٰ ثابت ہے اور وہ بھی مطلقاً نہیں؛ بلکہ امام کے سکتہ میں مقتدی کی قرأت کو جائز فرماتے ہیں اور اس سے حنفیہ بھی منع نہیں کرتے، وجوب پر کوئی دلیل نہیں؛ جیسا مفصل بیان گزر چکا ہے، پس یہ بھی ہماری دلیل ہے۔

ساتویں دلیل:

اس دلیل میں عبادۃ بن الصامت کی حدیث ہی کو پھر بیان کر دیا ہے، حالانکہ حدیث پڑھنے پڑھانے والے جانتے ہیں کہ جب صحابی ایک ہے تو حدیث ایک ہوگی، اس کو چند احادیث قرار دینا صحیح نہیں۔

ہم بتلا چکے ہیں کہ حدیث عبادہ مضطرب ہے، اس کے طرق میں سے اگر کسی طریق کو ترجیح نہ ہوتی تو وہ قابل قبول ہی نہ ہوتی، مگر جب ایک طریق کو ترجیح دے دی گئی تو یہی طریق حجت ہے، بقیہ طرق حجت نہیں ہو سکتے اور ان طرق

(۱)　لسان الميزان، من اسمه محمد، مؤسسة الأعلمي للمطبوعات بيروت. انيس

میں سے وہی طریق راجح ہے جس کو امام مسلم و بخاری نے صحیح میں اختیار کیا ہے اور اس میں مقتدی یا امام کا کچھ ذکر نہیں، صرف اتنا مضمون ہے کہ جو سورۂ فاتحہ نہ پڑھے، اس کی نماز نہیں اور اس سے کسی کو انکار نہیں، امام اور منفرد پر ہمارے نزدیک بھی قرأت فاتحہ واجب ہے اور اس معنی پر اس حدیث کو امام احمد بن حنبل اور سفیان بن عیینہ اور امام زہری جیسے ائمہ حدیث نے محمول کیا ہے۔ حضرت جابر بن عبداللہ صحابی اور دوسرے صحابہ نے بھی اس کا یہی مطلب سمجھا ہے۔ اس طریق صحیح کے علاوہ حدیث عبادہ کے جتنے بھی طرق ہیں، سب مرجوح اور نا قابل قبول ہیں، پھر جس کتاب سے حدیث کے یہ الفاظ تکمیل البرہان میں نقل کئے گئے ہیں، وہاں سے تصحیح اور تضعیف کچھ نقل نہیں کی گئی اور جس کتاب سے حدیث کی توثیق کی گئی ہے، اس سے حدیث کے الفاظ نہیں لئے گئے؛ کیوں کہ اس کے الفاظ مؤلف تکمیل کے خلاف اور حنفیہ کے لیے مفید تھے۔ مجمع الزوائد کے الفاظ یہ ہیں:

"**من قرأ خلف الإمام فليقرأ بفاتحة الكتاب**". (۱۸۶/۱)(۱)

یعنی جو شخص امام کے پیچھے قرأت کرے وہ سورۂ فاتحہ پڑھ لے۔

اس سے صاف ظاہر ہے کہ امام کے پیچھے قرأت فاتحہ لازم نہیں، جو پڑھنا چاہے، وہ پڑھ سکتا ہے اور ہم حضرت ابو ہریرہ اور عبداللہ بن عمرو بن العاص کی روایتوں سے ثابت کر چکے ہیں کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ مقتدی اپنے دل میں سورۂ فاتحہ پڑھ لیا کرے، یا امام کے سکتہ میں پڑھ لے اور اس کو کوئی بھی منع نہیں کرتا۔

آٹھویں دلیل:

آٹھویں حدیث حضرت عائشہ کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جو شخص نماز میں سورۂ فاتحہ نہ پڑھے، اس کی نماز ناقص ہے، (مؤلف تکمیل نے اس کے ترجمہ میں بے کار کا لفظ اپنی طرف سے اضافہ کر دیا ہے) اس کے متعلق عرض ہے کہ اس حدیث کا حاصل وہی ہے جو حضرت ابو ہریرہ کی حدیث کا حاصل ہے، اس سے مقتدی کے ذمہ قرأت فاتحہ کو لازم کرنا زبردستی ہے؛ کیوں کہ مقتدی کو امام کی قرأت کافی ہے، جس کا ثبوت ہم احادیث صحیحہ سے دے چکے ہیں، مقتدی کے علاوہ امام اور منفرد کی نماز کو ہم بھی بغیر فاتحہ کے ناقص سمجھتے ہیں؛ کیوں کہ سورۂ فاتحہ کا پڑھنا ان پر واجب ہے، مقتدی کے لیے قرآن اور صحیح حدیث میں انصات (خاموش رہنے کا) حکم ہے، وہ امام کی قرأت کی وجہ سے حکماً قرأت کر رہا ہے۔ حدیث صحیح میں صاف حکم ہے: "**إنما جعل الإمام ليؤتم به**" (۲) "امام اس لیے بنایا گیا ہے کہ اس

---

(۱) باب القراءة في الصلاة (ح: ۲۶۵۱): ۱۱۱/۲، مكتبة القدسي القاهرة. انيس

(۲) موطأ الإمام مالك رواية أبو مصعب الزهري، باب في صلاة الإمام وهو جالس (ح: ۳۳۹) مؤسسة الرسالة/ موطأ الإمام محمد، باب صلاة القاعد (ح: ۱۵۷) المكتبة العلمية، انيس

کا اتباع کیا جائے‘‘ اور ساتھ ساتھ قرأت کرنا اتباع نہیں ہے؛ بلکہ اتباع امام یہ ہے کہ مقتدی خاموش رہے اور اس کی قرأت کو سنے، امام کے ساتھ مقتدی کا قرأت کرنا بقول شاہ ولی اللہ رحمہ اللہ علیہ تعظیم قرآن کے خلاف ہے۔

نویں اور دسویں دلیل:

اس کے بعد نویں اور دسویں حدیث بھی حضرت عبادہ ہی کی حدیث ہے اور دونوں جزء القراۃ بیہقی سے نقل کی گئی ہیں۔

میں بتلا چکا ہوں کہ حدیث عبادہ حدیث مضطرب ہے اور حدیث مضطرب کے جس طریق کو ترجیح ہو جائے، وہی مقبول، باقی سب نا قابل قبول ہیں اور یہ بھی معلوم ہو چکا ہے کہ اس حدیث کا وہی طریق راجح ہے، جس کو امام مسلم و بخاری نے اختیار کیا ہے، پھر صاحب تکمیل نے اس حدیث کو جزء القرأۃ بیہقی سے نقل تو کر دیا، مگر یہ نہ دیکھا کہ جس وقت محمد بن سلیمان بن فارس نے اس حدیث کو ان الفاظ سے بیان کیا ہے: ’’**لا صلاة لمن لم يقرأ بفاتحة الكتاب خلف الإمام**‘‘ اسی وقت ابوالطیب محمد بن احمد ذہلی نے ان کو ٹوکا، **فإن قلت لمحمّد بن سليمان خلف الإمام؟ قال خلف الإمام**. (ص: ٤٧) ’’کیا اس حدیث میں خلف الامام بھی ہے؟ کہا ہاں‘‘ اور محمد بن احمد ذہلی ثقہ ہے، اس کا اس لفظ پر انکار کرنا خود بتلاتا ہے کہ اس کے نزدیک یہ زیادت منکر ہے، جس کا قرینہ یہ ہے کہ اس حدیث کی سند میں امام زہری بھی ہیں اور زہری کا مذہب موطأ امام مالک وغیرہ سے معلوم ہو چکا ہے کہ ان کے نزدیک جہری نماز میں مقتدی کو امام کے ساتھ قرأت جائز نہیں۔ تفسیر طبری میں بھی بروایت ثقات زہری کا یہ قول مروی ہے کہ جس نماز میں امام جہر کرتا ہے، مقتدی قرأت نہ کرے، اگر چہ امام کی قرأت نہ سنے، ہاں! جس نماز میں امام جہر نہ کرے، مقتدی اپنے دل میں آہستہ قرأت کرے، جس نماز میں امام جہر کرے، اس میں کسی کو قرأت جائز نہیں، نہ زور سے نہ آہستہ۔ (۱/۱۱۱)(۱) اگر اس حدیث میں انہوں نے لفظ خلف الامام روایت کیا ہوتا تو جہری نماز میں امام کے پیچھے قرأت کرنے سے کیوں منع کرتے؟ پس یا تو یہ زیادت شاذ ہے، جیسا ابوالطیب ذہلی کے سوال سے مفہوم ہو رہا ہے، یا یہ حدیث مسبوق کے متعلق ہے، جو امام کے بعد اپنی بقیہ رکعتیں پوری کرتا ہے، مطلب یہ ہے کہ اگر مسبوق امام کے بعد بقیہ رکعتیں ادا کرتے ہوئے سورۂ فاتحہ نہ پڑھے گا تو اس کی نماز نہ ہوگی اور مسبوق پر ہم بھی سورۂ فاتحہ کی قرأت کو واجب کہتے ہیں اور لفظ خلف کا معنی بعد میں مستعمل ہونا قرآن سے ثابت ہے، ملاحظہ ہو! تفسیر آیت: ﴿**فَجَعَلْنٰهَا نَكَالاً لِمَا بَيْنَ يَدَيْهَا وَمَا خَلْفَهَا**﴾ ’’ہم نے اس واقعہ کو عبرت بنا دیا، ان لوگوں کے لیے، جو اس کے سامنے تھے اور ان لوگوں کے لیے جو اس کے بعد آنے والے تھے‘‘۔ (تفسیر طبری: ۱/۲۶۵)(۲)

---

(۱)　موطأ الإمام مالك برواية أبی مصعب الزهری، العمل فی القراءة فيما لم يجهر فيه (ح: ۲٤۷)/ تفسير الطبری، القول فی تأويل قوله تعالیٰ ﴿وإذا قرئ القرآن فانصتوا﴾: ۱۰/٦٦٤، دار هجر. انيس

(۲)　سورة البقرة: ٦٦/ تفسير الطبری: ۲/۷۱، دار هجر. انيس

رہا امام بیہقی کا یہ فرمانا کہ اس کی سند صحیح ہے تو اس سے حدیث کا صحیح ہونا لازم نہیں آتا؛ کیوں کہ حدیث شاذ وہی ہے جس کے راوی سب ثقہ ہوں، مگر کسی ثقہ نے جماعت ثقات کے خلاف کیا ہو، پھر امام بیہقی کا یہ فرمانا کہ اس حدیث میں خلف الامام کی زیادتی ویسی ہی ہے، جیسی مکحول کی روایت میں (لا تقرؤا إلا بأم القرآن) کی زیادتی ہے تو مکحول کی اس زیادت کا حال ہم بتلا چکے ہیں کہ امام احمد اور یحیٰ بن معین وغیرہ ائمہ حدیث نے اس کو ضعیف کہا ہے، پھر یہ فرمانا کہ یہ حضرت عبادہ سے بوجوہ چند صحیح مشہور ہے تو یہ وہی بات ہے جو علامہ ابن تیمیہ نے فرمائی ہے کہ صحیح یہ ہے کہ یہ حضرت عبادہ کا قول ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا قول نہیں۔ سو اس کا ہم نے کب انکار کیا ہے کہ بعض صحابہ قرأت خلف الامام کے قائل تھے، مگر چونکہ ان کا قول خلاف نص قرآن اور خلاف حدیث صحیح ہے، اس میں تاویل کی جائے گی کہ وہ دل دل میں سورۂ فاتحہ پڑھتے ہوں گے، یا سکتہ امام میں اور ترجیح ان صحابہ کے قول کو دی جائے گی، جو نص قرآن اور حدیث صحیح کے موافق ہے اور دسویں حدیث عبادہ میں بھی امام اور غیر امام کی زیادت صحیح نہیں، جس کا مطلب یہ ہے کہ ''اس شخص کی نماز صحیح نہیں جو سورۂ فاتحہ نہ پڑھے، خواہ امام ہو، یا غیر امام ہو''؛ کیوں کہ اس کی سند میں احمد بن عمیر دمشقی معروف بابن جوصا ہے، جس کی بابت حافظ ابن مندہ نے حمزہ کتانی سے نقل کیا ہے کہ انہوں نے اس سے روایت کرنا چھوڑ دیا تھا اور فرمایا کہ میرے پاس ابن جوصا کی روایت کے دو سو جزء ہیں، کاش وہ سفید ہی ہوتے اور حاکم نے زبیر بن عبدالواحد اسدی سے نقل کیا ہے کہ میں نے ابوعلی کی کوئی لغزش نہیں دیکھی بجز اس کے کہ وہ عبداللہ (۱) ابن وہب دینوری اور ابن جوصا سے روایت کرتے ہیں، اھ۔ اس کی سند میں محمد بن ابی السری بھی ہے، جو غالبًا عسقلانی ہے، وہ باوجود حفظ کے بہت غلطی کرتا ہے اور منکرات روایت کرتا ہے۔ ذہبی نے میزان میں اس کی ایک حدیث منکر بیان کر کے فرمایا ہے کہ اس کی اور بھی منکر احادیث ہیں، پس اس روایت میں امام اور غیر امام کا لفظ یا ابن ابی السری کے مناکیر میں سے ہے، یا ابن جوصا کے غرائب میں سے ہے، اس سے حجت قائم نہیں ہوسکتی، پھر اس میں مقتدی کا ذکر نہیں، صرف امام اور غیر امام کا ذکر ہے تو غیر امام سے مراد منفرد ہے، مقتدی مراد نہیں؛ کیوں کہ مقتدی کے بارے میں صحیح حدیث ''إذا قرأ الإمام فانصتوا'' ''جب امام قرأت کرے، خاموش رہو'' میں خاموش رہنے کا صریح حکم وارد ہو چکا ہے اور یہی قرآن میں حکم ہے: ﴿وإذا قرئ القرآن فاستمعوا له وأنصتوا﴾ (۲) اور ہم بتلا چکے ہیں کہ بالاتفاق یہ آیت قرأت خلف الامام کے بارے میں نازل ہوئی ہے۔ اب صاحب تکمیل البرہان اپنے گریبان میں منہ ڈال کر دیکھیں کہ حکم خداوندی اور صحیح حدیث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو کون رد کر رہا ہے وہ یا ہم؟ پھر اس پہ یہ

---

(۱) یہ شخص متہم بالوضع ہے، یعنی حدیثیں گھڑا کرتا تھا۔ ظ

(۲) سورۃ الأعراف: ۲۰۴، انیس

لن ترانیاں کہ اپنے کو محقق و مبصر اور شریعت محمدیہ کا محکوم و فرمانبردار قرار دے کر حنفیہ کے عوام و خاص کو مذہب پرست فرقہ بند اور استخوان فروش کہتے ہوئے نہیں شرماتے، مسائل اختلافیہ میں جب کہ ہر فریق کے پاس دلائل موجود ہیں، یہ دریدہ دہنی اور خلاف تہذیب باتیں لکھنا آپ ہی کو مبارک ہو، ہم کسی کو برا نہیں کہتے، صرف اپنے مسلک کی تائید وتقویت پر اکتفاء کرتے ہیں۔

یہ دس حدیثیں بیان کر کے صاحب تکمیل نے **تلک عشرة کاملة** کا تاج سر پر رکھ کر بڑے فخر سے فرمایا ہے کہ ''الحمد للہ قرأت فاتحہ خلف الامام کا مسئلہ نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کی ان دس حدیثوں سے باحسن وجوہ حل ہوگیا'' گویا حنفیہ کے پاس نہ قرآن سے کوئی دلیل ہے، نہ حدیث سے۔ صاحب علم کو ایسی باتیں کرتے ہوئے شرمانا چاہیے، کیا ان کو معلوم نہیں کہ حنفیہ بھی اس مسئلہ میں قرآن وحدیث ہی سے استدلال کرتے ہیں۔

اس کے بعد صاحب تکمیل البرہان نے صحابہ کے آثار بیان کئے ہیں، میں بتلا چکا ہوں کہ جن احادیث سے انہوں نے استدلال کیا ہے، وہ یا تو صحیح نہیں اور اگر صحیح ہیں تو قرأت خلف الامام میں صریح نہیں، اب آثار دیکھئے۔

حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا اثر:

پہلا اثر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا ہے کہ ان سے یزید بن شریک نے قرأت خلف الامام کا مسئلہ دریافت کیا تو آپ نے فرمایا: سورۂ فاتحہ پڑھ لیا کرو، میں نے کہا کہ اگر چہ آپ (امام) ہوں؟ فرمایا: اگر چہ میں (امام) ہوں، میں نے کہا: اگر چہ آپ جہر کر رہے ہوں؟ تو فرمایا: اگر چہ میں جہر کر رہا ہوں۔ اس کو دارقطنی نے روایت کیا اور کہا کہ اس کے راوی ثقہ ہیں اور دوسری سند سے روایت کر کے کہا کہ یہ سند صحیح ہے اور طحاوی (۱) نے اس کو روایت کیا ہے۔ (۲)

جواب یہ ہے کہ حضرت عمر سے روایتیں مختلف ہیں، عبد الرزاق نے اپنی مصنف میں موسیٰ بن عقبہ امام المغازی والسیر سے روایت کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور صدیق اکبر اور حضرت عمر رضی اللہ عنہما قرأت خلف الامام سے منع فرماتے تھے اور یہ حدیث مرسلاً صحیح ہے اور امام محمد نے اپنی موطأ میں داؤد بن قیس فراء سے محمد بن عجلان سے روایت کیا ہے کہ حضرت عمر نے فرمایا: کاش اس شخص کے منہ میں پتھر پڑ جائیں، جو امام کے پیچھے قرأت کرتا ہے، (۳)

(۱) معلوم ہوتا ہے کہ صاحب تکمیل کے سامنے طحاوی بھی ہے اور ممکن ہے موطا محمد اور نصب الرایہ زیلعی بھی ہو اور عمدۃ القاری شرح بخاری للعینی بھی ہو تو کیا ان کو حنفیہ کے دلائل حدیثوں میں نظر نہیں آئے، اگر نظر نہیں آئے؟ تو معلوم ہوتا ہے وہ عربی نہیں سمجھتے اور اگر نظر آئے تو پھر کس منہ سے حنفیہ کے مسلک کو حدیث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف بتلاتے ہیں۔ ظ

(۲) سنن الدارقطنی، باب وجوب قراءة أم الکتاب فی الصلاة خلف الإمام (ح: ۱۲۱۰-۱۲۱۱)/شرح معانی الآثار، باب القراءة خلف الإمام (ح: ۱۳۰۳)

(۳) عن عمر بن الخطاب قال: لیت فی فم الذی یقرأ خلف الإمام حجراً. (موطأ الإمام محمد، باب افتتاح الصلاة (ح: ۱۲۶) انیس)

اس کے سب راوی ثقہ ہیں،مگر روایت مرسل ہے؛ کیوں کہ غالباً محمد بن عجلان کا سماع حضرت عمر سے نہیں ہے،مگر مرسل اور منقطع ہمارے یہاں حجت ہے اور علامہ عینی نے عمدۃ القاری میں تصریح کی ہے کہ دو مرسل صحیح اگر ایک حدیث صحیح کے معارض ہوں تو دو مرسل پر عمل کرنا اولیٰ ہے۔(ص:۸۸۵)(۱)اور شاہ ولی اللہ صاحب نے ازالۃ الخفاء میں ایک مستقل باب تدوین مذہب عمر بن الخطاب کے لیے منعقد کیا ہے،اس میں فرماتے ہیں:"**قلت روی أھل الکوفة من أصحاب عمر الکوفیین أن المأموم لایقرأشیئًا** "اھ۔"حضرت عمر کے جو اصحاب کوفی ہیں،ان کی روایت یہ ہے کہ(حضرت عمر کے نزدیک) مقتدی کچھ قرأت نہیں کرے گا"۔اس صورت میں اصول ترجیح کے موافق روایت تحریم کی ترجیح ہوگی۔"**فقد ثبت فی الأصول ترجیح المحرم علی المبیح إذا تعارضا**""کیوں کہ اصول میں دلائل سے ثابت ہو چکا ہے کہ جب محرم اور مبیح میں تعارض ہو تو محرم کو ترجیح دی جائے گی"،خصوصاً جب کہ روایت تحریم نص قرآن وحدیث صحیح کے موافق ہے،یا دونوں روایتوں کو اس طرح جمع کیا جائے کہ ممانعت کی روایت اس صورت پر محمول ہے جب امام کے ساتھ ساتھ قرأت کرے اور قرأت کا امر یا اجازت اس صورت میں ہے،جب امام سے پہلے،یا اس کے سکتہ میں یا سری نماز میں قرأت کرے،جیسا حضرت ابو ہریرہ اور عبداللہ بن عمرو اور حضرت عبادہ سے بروایت بیہقی ہم اس کا ثبوت دے چکے ہیں کہ امام کے ذمہ سکتہ واجب ہونے کی کوئی دلیل نہیں،پس امر کو وجوب پر محمول نہیں کر سکتے،جواز ہی پر محمول کیا جائے گا۔

اثر علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ:

دوسرا اثر حضرت علی کرم اللہ وجہہ کا ہے،وہ فرماتے تھے:"پڑھو امام کے پیچھے ظہر وعصر کی پہلی دو رکعتوں میں سورہ فاتحہ اور ایک سورت"۔دارقطنی نے فرمایا کہ اس کی سند صحیح ہے۔(۲)

میں کہتا ہوں تو کیا صاحب تکمیل مقتدی کے ذمہ سورۂ فاتحہ کے علاوہ ایک اور سورت پڑھنا بھی واجب کریں گے؟ اگر جواب اثبات میں ہے تو یہ خلاف اجماع ہے،جو لوگ قرأت خلف الامام کے قائل ہیں،ان میں کوئی بھی مقتدی کے ذمہ فاتحہ کے علاوہ کوئی سورت پڑھنے کو واجب نہیں کہتا،خود اہل حدیث بھی اس کے قائل نہیں اور اگر جواب نفی میں ہے تو حضرت علی کے اثر کا جواب دیں؛ کیوں کہ اس میں فاتحہ اور سورت دونوں کے پڑھنے کا مقتدی کو حکم ہے اور ہمارا جواب یہ ہے کہ حضرت علی سے بھی مختلف روایات ہیں،عبدالرزاق اور ابو بکر بن ابی شیبہ نے اپنی مصنف میں حضرت علی سے یوں روایت کیا ہے:"**قال:من قرأ خلف الإمام فقد أخطأ الفطرة**".(۳)"جو امام کے پیچھے قرأت کرے،

(۱) عمدۃالقاری،باب ترک النبی صلی اللہ علیہ وسلم:۱۲۶/۳،دارإحیاء التراث العربی بیروت.انیس

(۲) سنن الدارقطنی،باب وجوب قراء ۃ أم الکتاب فی الصلاۃ وخلف الإمام (ح:۱۲۳۲)انیس

(۳) المصنف عبد الرزاق،باب القراء ۃ خلف الإمام:۱۳۷/۲(ح:۲۸۰۱) المجلس العلمی الھند،انیس

وہ فطرت (یعنی سنت) کے خلاف عمل کرتا ہے''۔ دار قطنی نے بھی اس کو اپنی سنن میں روایت کیا ہے، جس کو مرسل شعبی کے ساتھ ہم بیان کر چکے ہیں اور اس کی سند میں کلام کیا ہے کہ قیس اور محمد بن سالم ضعیف ہیں، مگر ان دونوں کو دوسروں نے ثقہ کہا ہے، اس لیے روایت کو رد نہیں کیا جا سکتا اور ابن ابی شیبہ کی سند میں یہ ضعیف راوی نہیں ہیں، اس کی سند شرط صحیح کے موافق ہے، بجز محمد بن الاصبہانی کے، مگر اس کو علامہ ذہبی اور ابن حبان نے ثقہ کہا ہے اور ظاہر ہے کہ حضرت علی کے فتاویٰ اور قضایا کو اہل کوفہ دوسروں سے زیادہ جانتے ہیں؛ کیوں کہ ان کا زمانہ خلافت زیادہ تر کوفہ میں گزرا ہے، اس لیے ان کی روایت کو ترجیح دی جائے گی۔ خصوصاً جب کہ یہ روایت کتاب اللہ اور حدیث صحیح کے موافق بھی ہے اور امام عبداللہ بن یعقوب سند مونی نے اپنی کتاب کشف الاسرار میں عبداللہ بن زید بن اسلم سے روایت کیا ہے، وہ اپنے والد (زید بن اسلم مولی عمر بن الخطاب) سے روایت کرتے ہیں کہ صحابہ میں سے دس حضرات قرأت خلف الامام سے بہت سختی کے ساتھ منع کرتے تھے۔ حضرت ابوبکر صدیق اور حضرت عمر بن الخطاب اور حضرت عثمان بن عفان اور حضرت علی بن ابی طالب اور حضرت عبدالرحمٰن بن عوف اور حضرت سعد بن ابی وقاص اور حضرت عبداللہ بن مسعود اور حضرت زید بن ثابت اور حضرت عبداللہ بن عمر اور حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہم اجمعین، (عمدۃ القاری)(۱) جتنی سند مذکور ہے، اس کے سب راوی ثقہ ہیں، عبداللہ بن زید کو امام بخاری اور امام احمد نے ثقہ کہا ہے اور محدثین سند کا جو حصہ حذف کرتے ہیں، اس میں کلام نہیں ہوا کرتا۔

پس اثر عمر رضی اللہ عنہ کی طرح اثر علی رضی اللہ عنہ میں بھی محرم کو مبیح پر ترجیح دی جائے گی، یا ممانعت کو جہری نماز پر اور اجازت کو سری نماز پر محمول کیا جائے گا، جس کی تائید جزء القراءۃ بیہقی کے اس اثر سے ہوتی ہے۔

''عن علی قال من السنّة أن يقرأ الإمام فی الركعتين الأوليين من صلاة الظهر بأم الكتاب و سورة سرًا فی نفسه وينصتون من خلفه ويقرؤن فی أنفسهم''.

''حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا نماز کی سنت یہ ہے کہ امام ظہر کی پہلی دو رکعتوں میں سورۂ فاتحہ اور ایک سورۃ آہستہ پڑھے اور اس کے پیچھے والے خاموش رہیں دل دل میں پڑھیں''۔

امام بیہقی نے اس سے احتجاج کیا ہے اور اس میں صاف تصریح ہے کہ مقتدی خاموش رہیں، پھر اس سے سورہ فاتحہ کے بعد سورت ملانے کا وجوب بھی ثابت ہے جس کے اہل حدیث قائل نہیں حنفیہ قائل ہیں۔

اثر عبداللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ:

تیسرا اثر: ابوالعالیہ کہتے ہیں کہ میں نے مکہ میں عبداللہ بن عمر سے دریافت کیا کہ میں نماز میں پڑھوں؟ فرمایا کہ اس

(۱) عمدة القاری، باب ترک النبی صلی اللہ علیہ وسلم: ۱۳/۶، دار إحیاء التراث العربی بیروت. انیس

گھر کے (بیت اللہ کے) رب سے مجھے شرم آتی ہے کہ میں نماز پڑھوں اور اس میں قرأت نہ کروں، اگرچہ سورۂ فاتحہ ہی ہو، اس کو امام بخاری رحمہ اللہ تعالیٰ نے جزء القراءۃ میں روایت کیا ہے۔(۱)

میں کہتا ہوں کہ اس میں قرأت خلف الامام کا ذکر نہیں؛ بلکہ مطلق قرأت کا ذکر ہے کہ نماز میں قرأت ضرور ہونا چاہیے، اگرچہ سورۂ فاتحہ ہی ہو۔ اس کو غیر مقتدی پر محمول کیا جائے گا؛ کیوں کہ ابوالعالیہ نے ہی مرسلاً روایت کیا ہے کہ لوگ امام کے پیچھے قرأت کرتے تھے تو آیت: ﴿وإذا قرئ القرآن فاستمعوا له وأنصتوا﴾ (۲) نازل ہوئی، **فسكت القوم وقرأ النبی صلّى الله عليه وسلّم** ''پھر لوگ خاموش رہتے اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم قرأت کرتے تھے'' اور مؤطا مالک سے اصح الاسانید کے ساتھ عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کا مذہب مذکور ہو چکا ہے کہ جب ان سے سوال کیا جاتا، کیا امام کے پیچھے قرأت کی جائے؟ تو فرماتے کہ امام کے پیچھے جو شخص نماز پڑھے، اس کو امام کی قرأت کافی ہے اور جب تنہا نماز پڑھے تو قرأت کرنا چاہیے، اس کے بعد نافع نے کہا کہ عبداللہ بن عمر امام کے پیچھے قرأت نہ کرتے تھے اور بیہقی نے بھی جزء القراءۃ میں سند صحیح کے ساتھ قاسم بن محمد سے یہی روایت کیا ہے کہ عبداللہ بن عمر امام کے پیچھے قرأت نہ کرتے تھے، خواہ وہ جہر کرتا، یا نہ کرتا۔

پس ابوالعالیہ کی یہ روایت ان کے معارض نہیں ہوسکتی، اس کو امام اور منفرد پر محمول کرنا ضروری ہے، پھر اس کا یہ لفظ کہ اگرچہ سورۂ فاتحہ ہی ہو، بتلا رہا ہے کہ عبداللہ بن عمر کے نزدیک قرأت کے لیے سورۂ فاتحہ متعین نہیں اور یہ صاحب تکمیل البرہان کو مضر ہے؛ کیوں کہ وہ تعیین فاتحہ اور اس کی رکنیت کے قائل ہیں، اس کے بعد کنز العمال سے جو اثر عبداللہ ابن عمر کا نقل کیا ہے، اس میں کاتب نے غلطی کی ہے، وہ دراصل عبداللہ بن عمرو بن العاص کا اثر ہے۔ ملاحظہ ہو! **جزء القرأة للامام البیهقی**، ص: ٤٥، اور اس کی سند میں مثنی بن صباح ضعیف ہے۔ (تقریب: ۲۰۱) (۳) پھر اس میں امام کے پیچھے قرأت کا مطلقاً ذکر نہیں؛ بلکہ امام سے پہلے یا سکتہ کی حالت میں پڑھنے کا ذکر ہے اور اس سے کسی کو بھی انکار نہیں، نیز اس میں یہ لفظ بھی ہے: **"من صلّى مكتوبة أو سبحة فليقرأ بأم القرآن وقرآنا معها"**. (۴) ''جو شخص فرض نماز پڑھے، یا نفل وہ سورۂ فاتحہ بھی پڑھے اور اس کے ساتھ کچھ اور بھی قرآن سے پڑھے''۔ جس سے فاتحہ کے ساتھ ضم سورت کا وجوب صاف معلوم ہو رہا ہے، مگر اہل حدیث اس کے قائل نہیں، اگر اس اثر سے مقتدی کے ذمہ سورۂ فاتحہ کا پڑھنا واجب کیا جائے گا تو ایک سورت یا چند آیات کا پڑھنا بھی واجب ہوگا اور اس کا کوئی بھی قائل نہیں پس یہ اثر اتفاقاً متروک العمل ہے۔

---

(۱) القراءة خلف الإمام للبخاری، باب وجوب القراءة للإمام والمأموم، الخ (ح: ۱۹) المكتبة السلفية. انيس

(۲) سورة الأعراف: ٢٠٤، انيس

(۳) تقريب التهذيب، ذكر بقية حرف الميم على الترتيب: ۵۱۹/۱، دار الرشيد سوريا. انيس

(۴) مصنف عبد الرزاق، باب القراءة خلف الإمام: ۱۳۳/۲ (ح: ۲۷۸) من منشورات العلمی، انيس

اثر ابی بن کعب رضی اللہ تعالیٰ عنہ:

چوتھا اثر حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ کا ہے کہ وہ امام کے پیچھے قرأت کرتے تھے،(۱) مگر ظاہر یہ ہے کہ وہ امام سے پہلے یا اس کے سکتات میں قرأت کرتے تھے اور اس کو ہم بھی منع نہیں کرتے، جیسا آئندہ اثر میں اس کی صاف تصریح ہے۔

اثر عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ تعالیٰ عنہ:

پانچواں اثر عبداللہ بن عمرو بن العاص کا ہے، وہ قرأت خلف الامام کرتے تھے۔

مگر صاحب تکمیل نے خود ہی کنز العمال کے حوالہ سے اس کی تشریح بھی نقل کر دی ہے کہ وہ فرماتے تھے: ''جب تو امام کے ساتھ ہو تو سورۂ فاتحہ اس سے پہلے یا اس کے سکتات میں پڑھ لیا کر'' (۲) اور اس کو ہم بھی جائز کہتے ہیں اور وجوب کی کوئی دلیل نہیں؛ کیوں کہ امام کے ذمہ کسی دلیل سے بھی سکوت واجب نہیں۔

اثر ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ:

چھٹا اثر حضرت ابو ہریرہ کا ہے کہ جس نماز میں فاتحہ نہ پڑھی جائے، وہ خداج ہے، (ناقص ہے) تو ابو السائب نے کہا کہ جب میں امام کے ساتھ ہوں اور وہ جہر کے ساتھ قرأت کر رہا ہو تو کیا کروں؟ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے جواب میں فرمایا ''**ویلک یا فارسی! إقرأبها فی نفسک**'' إلخ. (۳)

اس کا ترجمہ صاحب تکمیل نے یوں کیا ہے کہ ''سورۂ فاتحہ آہستہ پڑھ لیا کرو' اور ہمارے نزدیک اس کا ترجمہ یہ ہے کہ ''دل دل میں پڑھ لیا کرو' کیوں کہ ابوداؤد و نسائی وغیرہ میں بسند صحیح ابو ہریرہ ہی سے روایت ہے: ''**إذا قرأ الإمام فانصتوا**'' کہ جب امام قرأت کرے تو خاموش رہو اور قرأت قلبی کا قرأت ہونا لغۃً و عرفاً ثابت ہے؛ جیسا کہ ہم پہلے بتلا چکے ہیں، پس دونوں روایتوں پر عمل کی صورت یہی ہے کہ حضرت ابو ہریرہ مقتدی کے لیے وجوب انصات کے بھی قائل ہیں کہ مقتدی کو امام کے پیچھے خاموش رہنا واجب ہے اور دل دل میں قرأت کو جائز سمجھتے ہیں، یہی ہمارا مذہب ہے۔

اثر عبداللہ بن مغفل رضی اللہ تعالیٰ عنہ:

ساتواں اثر عبداللہ بن مغفل کا ہے کہ وہ امام کے پیچھے ظہر اور عصر کی پہلی دونوں رکعتوں میں سورۂ فاتحہ کے ساتھ دوسری سورت بھی پڑھا کرتے تھے اور پچھلی دونوں رکعتوں میں سورۂ فاتحہ پڑھتے تھے۔

میں کہتا ہوں کہ ابن مندہ نے اپنی تفسیر میں عبداللہ بن مغفل سے اس کے خلاف روایت کیا ہے کہ میں نے صحابہ

---

(۱) القراءة خلف الإمام للبخاری، باب وجوب القراءة للإمام والمأموم (ح: ۲۲) انیس

(۲) کنز العمال، الفصل الثانی فی الإمامة وما یتعلق بها: ۷/ ۶۱۶، مؤسسة الرسالة. انیس

(۳) القراءة خلف الإمام للبخاری، باب وجوب القراءة للإمام والمأموم (ح: ۴۷) انیس

میں سے ایک بزرگ سے سوال کیا (راوی کہتا ہے کہ میرا گمان یہ ہے کہ انہوں نے عبداللہ بن مغفل کا نام لیا تھا) کیا ہر شخص پر جو قرآن سنے، اس کا سننا اور خاموش رہنا واجب ہے؟ فرمایا یہ آیت: ﴿وإذا قرئ القرآن فاستمعوا له وأنصتوا﴾ (۱) (جب قرآن پڑھا جائے تو اس کو سنو اور خاموش رہو)، قرأت خلف الامام کے بارے میں نازل ہوئی ہے کہ جب امام قرأت کرے تو اس کو سنو اور خاموش رہو۔ (زیلعی: ۲۳۲/۳) پس اگر جزء القراءۃ بخاری کی روایت میں لفظ خلف الامام کی زیادتی شاذ و منکر نہیں ہے تو کہا جائے گا کہ عبداللہ بن مغفل امام کے ساتھ ساتھ قرأت نہ کرتے تھے، اس سے پہلے یا درمیانی سکتہ میں قرأت کرتے ہوں گے، پھر اس روایت میں سورۂ فاتحہ کے ساتھ دوسری سورت ملانے کا بھی ذکر ہے، کیا صاحب تکمیل اس کو امام یا مقتدی کے ذمہ واجب کہیں گے؟ اگر نہیں تو ایسا اثر بیان کرنے سے کیا فائدہ جس پر خود عمل نہیں کرتے۔

اثر ابوسعید رضی اللہ تعالیٰ عنہ:

آٹھواں اثر ابونضرہ کا ہے کہ میں نے ابوسعید خدری سے قرأت خلف الامام کے بارے میں سوال کیا، انہوں نے فرمایا: سورۂ فاتحہ (پڑھ لیا کرو)۔

میں کہتا ہوں! اس حدیث کو ابوداؤد نے ابونضرہ ہی سے روایت کیا ہے، جیسا خود صاحب تکمیل نے نقل کیا ہے، اس میں خلف الامام کا ذکر نہیں؛ بلکہ اس کے الفاظ یہ ہیں: ''قال أمرنا أن نقرأ بفاتحة الكتاب وماتيسّر''. (۲) ''ہم کو امر کیا گیا ہے کہ سورۂ فاتحہ پڑھیں اور جو آسان ہو'' اور اہل حدیث سورۂ فاتحہ کے بعد اور کچھ پڑھنے کو واجب نہیں کہتے۔ ترمذی و ابن ماجہ میں بھی حضرت ابوسعید خدری کی یہ روایت موجود ہے، اس میں بھی لفظ خلف الامام موجود نہیں۔ ابن عدی نے کامل میں اور ابن ابی شیبہ نے مصنف میں، اسحٰق بن راہویہ نے اپنی مسند میں اور طبرانی نے مسند اہل شام میں اسی حدیث کو روایت کیا ہے، ان حضرات کی روایتوں میں بھی خلف الامام کا نشان نہیں۔ طبرانی نے اس کو ابونضرہ سے ابوسعید سے بایں الفاظ روایت کیا ہے: ''لا صلاة إلا بأم القرآن ومعها غيرها'' ''نماز نہیں ہوتی مگر سورۂ فاتحہ سے اور اس کے ساتھ کچھ اور بھی ہو'' اور کامل کے الفاظ یہ ہیں: ''لا صلاة إلا بفاتحة الكتاب وسورة معها'' ''نماز نہیں ہوتی، مگر سورۂ فاتحہ سے اور اس کے ساتھ ایک اور سورت ہو''۔ ابن ماجہ کے الفاظ یہ ہیں: ''لا صلاة لمن لم يقرأ في كل ركعة بالحمد وسورة في فريضة وغيرها''. ''نماز نہیں ہے اس شخص کی، جو ہر رکعت میں الحمد اور ایک سورت نہ پڑھے فرض ہو یا نفل''۔ (اعلاء السنن: ۱۸۲/۲) اب اگر اس کو قرأت خلف الامام پر محمول کیا گیا تو صاحب تکمیل کو

(۱) سورة الأعراف: ۲۰۴، انیس

(۲) سنن أبي داؤد، باب من ترك القراءة في صلاته بفاتحة الكتاب: ۱۰۸/۱ (ح: ۸۲۲) بيت الأفكار، انیس

قائل ہونا چاہیے کہ امام اور مقتدی کے ذمہ ہر رکعت میں سورۂ فاتحہ کے بعد ایک اور سورت بھی پڑھنا واجب ہے، حالانکہ وہ اس کے قائل نہیں، پھر ایسے آثار کے نقل کرنے سے کیا فائدہ، جن پر وہ خود عمل نہیں کرتے۔

اس کے بعد صاحب تکمیل نے حنفیہ کی طرف ایک مغالطہ منسوب کیا ہے کہ بوقت تعلیم نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے مسییء الصلاۃ (۱) کو "**فاقرأ ما تیسّر معک من القراٰن**" (۲) فرمایا تھا کہ قرآن سے جو تجھے آسان ہو، وہ پڑھ لیا کر (خاص سورۂ فاتحہ پڑھنے کا حکم نہیں دیا) اس سے معلوم ہوا کہ فرض قرأت ادا کرنے کے لیے فاتحہ کی خصوصیت نہیں، ایک دو آیت کسی سورت کی پڑھنے سے بھی فرض ادا ہو جائے گا، اس کے جواب میں صاحب تکمیل کہتے ہیں کہ "حافظ صاحب (یعنی حافظ ابن حجر عسقلانی) نے فرمایا ہے: اس کا مطلب یہ ہے "**أی بعد الفاتحة**" یعنی فاتحہ کے بعد جو سورت تجھے یاد ہو اور آسان ہو، وہ پڑھ لیا کر؛ جیسا کہ ابوداؤد میں رفاعۃ بن رافع کی حدیث میں "**ثم إقرأ بأم القراٰن**" صاف موجود ہے؛ یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے **مسییء الصلاۃ** کو فرمایا کہ سورۂ فاتحہ پڑھنے کے بعد جو سورت آسان ہو پڑھ لیا کرو"۔

میں کہتا ہوں کہ اس حدیث کو قرأت خلف الامام سے کوئی تعلق نہیں؛ بلکہ اس کا تعلق منفرد کی نماز سے ہے اور منفرد کے ذمہ ہمارے نزدیک بھی سورۂ فاتحہ اور ایک سورت یا دو تین آیتیں پڑھنا واجب ہے، مگر صاحب تکمیل کے نزدیک فاتحہ کے علاوہ اور کچھ پڑھنا واجب نہیں، اگر اس حدیث کو قرأت خلف الامام سے متعلق کہا جائے گا تو ان کو قائل ہونا چاہیے کہ امام اور مقتدی دونوں پر سورۂ فاتحہ کے بعد اور بھی کچھ پڑھنا واجب ہے۔ رہا حنفیہ کا یہ کہنا کہ حدیث مسییٔ الصلوٰۃ میں سورۂ فاتحہ کا ذکر نہیں، صرف اتنا ہے کہ قرآن میں سے جو تم کو آسان ہو پڑھو، یہ مغالطہ ہرگز نہیں؛ بلکہ واقعہ یہ ہے کہ اس حدیث کے راوی دو صحابی ہیں، ایک ابوہریرہ دوسرے رفاعۃ بن رافع۔ حضرت ابوہریرہ کی تمام روایتوں میں یہی ہے: "**ثم إقرأ ما تیسّر معک من القراٰن**" "پھر قرآن میں سے جو تم کو آسان ہو پڑھو" کسی روایت میں بھی ام القرآن یا سورۂ فاتحہ کا ذکر نہیں اور رفاعۃ بن رافع کی حدیث میں بھی اکثر راویوں نے یہی کہا ہے، صرف ایک راوی محمد بن عمرو نے "**ثم إقرأ بأم القرآن وبما شاء اللّٰه**" کہا ہے،" پھر سورۂ فاتحہ پڑھو اور اس کے بعد جو اللہ چاہے پڑھو" یہ ابوداؤد کے الفاظ ہیں، (۳) اور ایسے ہی محمد بن عمرو کی روایت میں امام احمد اور ابن حبان کے یہ الفاظ ہیں: "**ثم إقرأ بأم القراٰن وبما شئت**" (۴) "پھر سورۂ فاتحہ پڑھو اور جو تمہارا جی چاہے پڑھو"۔

(۱) یعنی نماز کو بری طرح پڑھنے والا یہ حدیث اسی عنوان سے بیان کی جاتی ہے۔ ظ

(۲) صحیح البخاری، باب وجوب القراءۃ للإمام والمأموم (ح:۷۵۷) انیس

(۳) سنن أبی داؤد، باب صلاۃ من لا یقیم صلبه فی الرکوع والسجود (ح:۸۵۹) انیس

(۴) صحیح ابن حبان، باب ذکر الخبر الدال علی أن قوله صلی اللّٰه علیه وسلم، الخ (ح:۱۷۸۷) انیس

خود حافظ ابن حجر نے (فتح الباری:۲/۲۳۱)(۱) میں اس کی تصریح کی ہے:

"قوله ثم اقرأ ما تيسر معک من القرآن لم تختلف الرواة في هٰذا عن أبی هريرة و أما رفاعة ففی رواية إسحٰق المذكورة يقرأ ما تيسر من القرآن ممّا علمه اللّٰه وفی رواية يحيٰی بن علی فإن كان معک قرآن فاقرأ وإلا فاحمد اللّٰه وكبره وهلله وفی رواية محمّد بن عمرو عند أبی داؤد ثم إقرأ بأم القرآن وبماشاء اللّٰه ولأحمد وابن حبان من هذا الوجه ثم إقرأ بأم القرآن ثم إقرأ بما شئت" اهـ.

پس محمد بن عمرو کی یہ زیادت شاذ ہے اور حدیث شاذ اصول حدیث پر صحیح نہیں ہو سکتی، خصوصاً جب کہ محمد بن عمرو ثقہ متفق علیہ بھی نہیں، یحییٰ بن معین اور جوز جانی اور یعقوب بن شیبہ اور ابن سعد نے اس کی تضعیف کی ہے اور جن لوگوں نے توثیق کی ہے، وہ بھی اس کو خطا اور قلت ضبط سے مجروح کرتے ہیں۔ (ملاحظہ ہو! تہذیب التذہب:۹/۳۷۶-۳۷۷) ایسے راوی کا تفرد محدثین کے اصول پر قابل قبول نہیں اور پھر یہ زیادت نص قرآن کے خلاف ہے۔ قرآن میں ﴿**فاقرؤا ما تيسّر من القرآن**﴾ وارد ہے کہ قرآن میں سے جو آسان ہو پڑھو، سورۂ فاتحہ کی قید نہیں، پس جو روایت نص قرآن کے موافق ہوگی، وہی راجح ہے اور جو نص قرآن پر زیادت کو ثابت کرے گی، اس کو نص قرآن کے برابر نہیں کیا جا سکتا ، اس لیے ہم کہتے ہیں کہ فرض تو اتنی ہی قرأت ہے، جو آسان ہو (یعنی کم از کم ایک آیت) اور خبر واحد میں جو زیادت مذکور ہے، وہ فرض نہیں؛ بلکہ واجب ہے، اس صورت میں نص قرآن پر عمل ہو گیا اور حدیث پر بھی اور قرأت فاتحہ کو فرض قرار دینے کی صورت میں نص کا ابطال لازم آئے گا اور یہ گوارا نہیں کیا جا سکتا کہ خبر واحد کو نص قرآن کے برابر کیا جائے۔ اب صاحب تکمیل البرہان اپنے گریبان میں منہ ڈال کر دیکھیں کہ مغالطہ دینے والا اور خبر واحد کی بناء پر نص قرآن کو باطل کرنے والا کون ہے، وہ یا ہم؟ رہا یہ دعویٰ کہ قرآن اور حدیث میں "**ما تيسر**" (جو آسان ہو) سے مراد فاتحہ ہے، زبردستی ہے۔ سورہ **والعصر** اور ﴿**انّا أعطيناک الكوثر**﴾ اور ﴿**قل هو اللّٰه أحد**﴾ سے زیادہ آسان سورۂ فاتحہ کیوں کر ہو سکتی ہے؟ جس میں دو جگہ لفظ ضاد ہے، جس کا صحیح پڑھنا عوام وخواص کو بھی دشوار ہے اور اس کی وجہ سے اب تک ہنگامہ برپا ہے کہ ضاد مشابہ ظاء ہے، یا مشابہ دال۔

فرض وواجب کا فرق:

علامہ شعرانی شافعیؒ میزان میں فرماتے ہیں:

"فرحم اللّٰه أباحنيفة حيث غيّر بين لفظ الفرض والواجب وبين معناهما فجعل ما فرضه اللّٰه تعالٰی أعلٰی ممّا فرضه رسول اللّٰه صلّی اللّٰه عليه وسلّم وإن كان لا ينطق عن الهوی أدباً مع اللّٰه

(۱) كتاب الأذان، باب أمر النبی صلی اللّٰه عليه وسلم لا يتم ركوعه بالإعادة (ح:۷۹۳) انيس

تعالٰی ونفس رسول اللّٰہ صلّی اللّٰہ علیه وسلّم یحمد أباحنیفة لأنّه یحب رفع رتبة تشریع ربّه علٰی تشریعه هو ولو کان ذٰلک بإذنه تعالٰی ولم ینظر إلٰی ذلک من جعل الفرض والواجب مترادفین وقال الخلف لفظیٌ والحق أنهما عند الإمام أبی حنیفة متفاضلان والخلف معنوی کما هو لفظی،اهـ .(فتح الملهم:۲/ ۱۹)

ترجمہ: اللہ تعالیٰ امام ابوحنیفہ پر اپنی رحمتیں نازل فرمائے کہ انہوں نے فرض اور واجب میں فرق کیا اور دونوں کے معنی الگ الگ بیان کردیئے کہ جس عمل کو اللہ تعالیٰ نے فرض کیا ہے، اس کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے فرض کئے ہوئے عمل سے اعلیٰ قرار دیا، اگرچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بھی اپنی خواہش سے کچھ نہیں فرماتے، امام ابوحنیفہ نے اللہ تعالیٰ کا ادب ملحوظ رکھا اور اس پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا دل بھی امام ابوحنیفہ کی تعریف کرتا ہے؛ کیوں کہ آپ کو بھی یہی پسند ہے کہ اللہ تعالیٰ کی تشریع کو آپ کی تشریع سے بلند رتبہ میں رکھا جائے، اگرچہ آپ کی تشریع بھی اللہ تعالیٰ کی اجازت سے ہے، اس نکتہ کی طرف ان لوگوں کی نظر نہیں پہنچی، جو فرض وواجب کو برابر سمجھتے ہیں، حق یہ ہے کہ امام ابوحنیفہ کے نزدیک فرض وواجب کا درجہ ایک دوسرے سے کم ہے، دونوں میں لفظی فرق کے ساتھ معنوی فرق بھی ہے۔

صاحب تکمیل البرہان نے علامہ شعرانی کا ایک قول نقل کیا ہے، اس کے ساتھ اس قول کو بھی ملا کر دیکھیں تو حقیقت واضح ہوجائے گی کہ قرآن وحدیث کے احکام کو برابر کرنا صحیح نہیں، جو حکم قرآن سے ثابت ہو، اس کو فرض اور جو حدیث سے ثابت ہو، اسے واجب کہنا چاہیے۔

اثر عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا:

نواں اثر حضرت عائشہؓ کا ہے کہ وہ امام کے پیچھے قرأت کا امر کرتی تھیں۔(۱)

اس میں سورۂ فاتحہ کا ذکر نہیں، نہ یہ تصریح ہے کہ امام کے ساتھ ساتھ نماز جہری میں قرأت کا امر کرتی تھیں، یا نماز سری میں اور جہری نماز میں امام کے سکتات میں، پس اس میں اہل حدیث کے لیے کوئی حجت نہیں۔ ہم بتلا چکے ہیں کہ دس صحابہ جن میں خلفاء اربعہ بھی شامل ہیں، قرأت خلف الامام سے بہت سختی سے منع فرماتے تھے، ان صحابہ کا قول نص قرآن: ﴿**وإذا قرئ القراٰن فاستمعوا له وأنصتوا**﴾ (۲) اور حدیث صحیح "**إذا قرأ الإمام فانصتوا**"، کے موافق ہے کہ جب قرآن پڑھا جائے، اس کو سنو اور خاموش رہو اور جب امام قرأت کرے، تم خاموش رہو، پس ترجیح اسی کو ہوگی۔ حضرت عائشہ کے قول مجمل سے قرآن وحدیث صحیح کو ترک نہیں کیا جائے گا، اس میں تاویل کی جائے گی کہ سری نماز میں یا جہری کے سکتات میں قرأت کا امر کرتی ہوں گی۔

(۱) القراء ة خلف الإمام للبخاری،باب وجوب القراء ة للإمام والمأموم: ۱/ ۱۰،المکتبة السلفیة.انیس
(۲) سورة الأعراف: ۲۰٤،انیس

اثر جابر رضی اللہ تعالیٰ عنہ:

دسواں اثر حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ کا ہے کہ ہم امام کے پیچھے ظہر وعصر کی پہلی دو رکعتوں میں سورۂ فاتحہ اور ایک سورت پڑھتے تھے اور پچھلی دو رکعتوں میں صرف سورۂ فاتحہ۔(۱)

تو کیا صاحب تکمیل اس کے قائل ہیں کہ مقتدی کے ذمہ سورۂ فاتحہ کے علاوہ بھی ایک سورت پڑھنا واجب ہے، اگر وہ اس کے قائل نہیں تو ایسا اثر خود ان پر حجت ہے، جس پر وہ عمل نہیں کرتے، پھر یہ حدیث مضطرب ہے؛ کیوں کہ ابن ماجہ نے اس کو یزید فقیر کے واسطہ سے حضرت جابر سے روایت کیا ہے،(۲) اور بیہقی نے جزء القراءۃ میں یزید فقیر ہی کے واسطہ سے اس کو روایت کیا ہے، مگر اس میں خلف الامام کا ذکر نہیں، صرف اتنا ہے کہ وہ پہلی دو رکعتوں میں سورۂ فاتحہ اور اس کے ساتھ کچھ پڑھتے تھے اور پچھلی دو رکعتوں میں صرف فاتحہ پڑھتے تھے۔(۳) پھر بیہقی نے عبیداللہ بن مقسم سے حضرت جابر سے روایت کیا، اس میں بھی خلف الامام کا ذکر نہیں۔(۴) اس کا مضمون یہ ہے کہ نماز میں قرأت کی سنت یہ ہے کہ پہلی دو رکعتوں میں سورۂ فاتحہ اور ایک سورت پڑھے اور پچھلی دونوں رکعتوں میں صرف فاتحہ، پھر اعمش کے واسطہ سے یزید فقیر سے حضرت جابر سے ان لفظوں کے ساتھ روایت کیا: **"إقرأ في الأوليين بالحمد وسورة وفي الأخريين بالحمد"** (۵) کہ پہلی دونوں رکعتوں میں الحمد اور ایک سورت پڑھو اور پچھلی دو میں الحمد پڑھو، پس ایسی مضطرب روایت سے اس حدیث کا معارضہ نہیں ہوسکتا، جس کو امام مالک نے موطأ میں بسند صحیح اور امام ترمذی نے جامع میں بسند حسن صحیح روایت کیا ہے کہ حضرت جابر فرماتے ہیں کہ جس نے کسی نماز میں سورۂ فاتحہ نہ پڑھی تو اس نے نماز نہیں پڑھی،(۶) مگر یہ کہ امام کے پیچھے ہو (تو اس کی نماز بغیر قرأت کے درست ہے) اور حافظ ابن حجر نے اس کو مشہور بتلایا ہے، پھر ابن ماجہ کی روایت سے صرف اتنا معلوم ہوا کہ وہ سری نمازوں میں امام کے پیچھے قرأت کرتے تھے اور اس کو ہم بھی جائز کہتے ہیں، یہ کہاں معلوم ہوا کہ وہ جہری نمازوں میں بھی امام کے ساتھ ساتھ قرأت کرتے تھے اور محل نزاع یہی صورت ہے۔

(۱) القراءة خلف الإمام للبخاري، باب وجوب القراءة للإمام والمأموم: ۶۷/۱، المكتبة السلفية. انيس

(۲) سنن ابن ماجة، باب القراءة خلف الإمام (ح: ۸۴۳) انيس

(۳) السنن الكبرىٰ للبيهقي، باب من قال يقتصر في الأخريين على فاتحة الكتاب (ح: ۲۴۷۶) انيس

(۴) كذا في مصنف عبدالرزاق، باب كيف القراءة في الصلاة (ح: ۲۶۶۱) انيس

(۵) كذا في كنز العمال، فصل في أذكار التحريمة وما يتعلق بها (ح: ۲۲۱۵۹) انيس

(۶) موطأ الإمام مالك، ت: الأعظمي، ماجاء في أم القرآن (ح: ۲۷۶) / سنن الترمذي، باب ماجاء في ترك القراءة خلف الإمام (ح: ۳۱۳) انيس

اثر عبادہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ:

گیارہواں اثر حضرت عبادہ بن الصامت رضی اللہ عنہ کا ہے، جس کو ابوداؤد نے نافع بن محمود سے روایت کیا ہے کہ حضرت عبادہ نے صبح کی نماز میں دیر کی تو ابونعیم نے نماز پڑھائی، اتنے میں عبادہ آ گئے اور میں ان کے ساتھ تھا، ہم ابونعیم کے پیچھے صف میں کھڑے ہو گئے، ابونعیم اس وقت جہر سے قرأت کر رہے تھے، عبادہ نے سورۂ فاتحہ پڑھنی شروع کر دی، نماز سے فارغ ہو کر میں نے کہا کہ میں نے آپ کو سورۂ فاتحہ پڑھتے ہوئے سنا، حالانکہ ابونعیم جہر سے قرأت کر رہے تھے، حضرت عبادہ نے کہا: ہاں! ہم کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز پڑھائی، الخ، پھر اس کو تمہید ابن عبدالبر اور مستدرک حاکم سے نقل کیا گیا ہے، اس میں محمود بن ربیع کی طرف اس سوال و جواب کو منسوب کیا گیا ہے۔(۱)

میں کہہ چکا ہوں کہ یہ حدیث مضطرب ہے اور اس کے اضطراب کی تفصیل بھی بیان کر چکا ہوں اور یہ کہ اس کے تمام طرق میں راجح وہی طریق ہے، جس کو امام بخاری و مسلم نے اختیار کیا ہے، اس میں صرف اتنا مضمون ہے کہ بغیر سورۂ فاتحہ کے نماز نہیں ہے، امام یا مقتدی کا اس میں اصلاً ذکر نہیں ہے اور سفیان بن عیینہ اور زہری اور امام احمد نے اس کو منفرد پر محمول کیا ہے اور جس طریق میں نافع یا محمود کا سوال و جواب مذکور ہے، اس کو امام احمد اور یحییٰ بن معین اور ایک جماعت ائمہ حدیث نے ضعیف قرار دیا ہے، پھر صاحب تکمیل البرہان کو یہ بھی سوچنا چاہیے کہ محمود بن ربیع صحابی صغیر ہے اور نافع تابعی متوسط ہے، (كما في التقريب مستور من الثالثة) ان دونوں کا حضرت عبادہ کی قرأت خلف الامام پر انکار کرنا کیا بتلاتا ہے؟ اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ ان دونوں نے حضرت عبادہ کے سوا کسی صحابی کو قرأت خلف الامام کرتے ہوئے نہیں دیکھا تھا اور نہ ان دونوں کے نزدیک مقتدی کو قرأت خلف الامام جائز تھی اور نہ وہ اب تک قرأت خلف الامام کے عادی تھے، جبھی تو حضرت عبادہ کی قرأت پر انکار کیا تو اگر ایک صحابی سے قرأت خلف الامام کا ثبوت ہو بھی گیا تو اس سے اہل حدیث کا مدعی کیوں کر ثابت ہو سکتا ہے، جب کہ اسی اثر سے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ اس صحابی کے سوا دوسرے صحابہ قرأت خلف الامام کے قائل نہ تھے۔

اثر ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما:

بارہواں اثر عبداللہ بن عباس کا ہے کہ انہوں نے فرمایا کہ امام کے پیچھے سورۂ فاتحہ پڑھ لیا کرو، پھر اسی کو عیزار بن حریث کے واسطہ سے نقل کیا گیا ہے۔(۲)

(۱) المستدرک للحاکم، رقم الحديث: ۸۷۱، المجلد الأول: ۳٦٤، دار الكتب العلمية بيروت/التمهيد لما في الموطأ من المعاني والأسانيد، الحديث التاسع والثلاثون: ۳۹/۱۱، وزارة عموم الأوقاف المغرب. انیس

(۲) مصنف عبدالرزاق الصنعاني، باب قراءة أم القرآن (ح: ۲٦۲۸) انیس

اس کی سند میں ابو بحر بربہاری ہے، جس پر دارقطنی اور محمد بن ابی الفوارس نے جرح کی ہے اور ابوالبرقانی اور ابن السرخسی نے کذاب کہا ہے، ابوالحسن بن الفرات نے اس کو مخلط کہا ہے؛ یعنی روایت میں گڑبڑ کرتا ہے، اس پر غفلت غالب تھی،(۱) ہم ابو جمرہ کے واسطہ سے عبداللہ بن عباس کی روایت نقل کر چکے ہیں کہ ان سے سوال کیا گیا، جب امام میرے آگے ہو تو میں بھی قرأت کر لیا کروں؟ فرمایا نہیں، اس کی سند حسن ہے۔ نیز ابن عباس ہی نے یہ بھی روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تم کو امام کی قرأت کافی ہے، خواہ وہ آہستہ پڑھے، یا جہر کرے اور اس کی سند بھی حسن ہے۔ پس یا تو ایک روایت کو رد کیا جائے اور دوسری کو قبول کیا جائے، جو نص قرآن: ﴿**إذا قرئ القرآن فاستمعوا له وأنصتوا**﴾ (۲) اور حدیث صحیح "**إذا قرأ الإمام فانصتوا**" کے موافق ہے یا دونوں کو اس طرح جمع کیا جائے کہ عبداللہ ابن عباس مقتدی کے حق میں قرأت کو فرض نہیں سمجھتے تھے اور نماز جہری میں امام سے پہلے یا سکتہ کے وقت قرأت کو مستحب جانتے تھے، اسی طرح نماز سری میں بھی اور اس سے حنفیہ بھی منع نہیں کرتے؛ جیسا مفصل بار بار گزر چکا ہے۔

اثر ابن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ:

تیرہواں اثر عبداللہ بن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا ہے، ابو مریم کہتے ہیں کہ میں نے عبداللہ ابن مسعود کو امام کے پیچھے پڑھتے ہوئے سنا۔(۳)

صاحب تکمیل کو یہ اثر نقل کرتے ہوئے شرمانا چاہیے؛ کیوں کہ اس میں نہ سورۂ فاتحہ کا ذکر ہے، نہ کسی اور سورت کا۔ ممکن ہے، وہ ثنا؛ یعنی "**سبحانک اللّٰھمَّ وبحمدک**" إلخ، اور ﴿**إنّی وجهت وجهی للذی فطر السمٰوات والأرض حنفیاً وماأنا من الشرکین**﴾ پڑھ رہے ہوں، جو مقتدی امام کی قرأت سے پہلے پڑھا کرتا ہے، اس میں یہ کہاں ہے کہ وہ امام کی قرأت کے ساتھ کچھ پڑھتے تھے، عبداللہ بن مسعود اور ان کے اصحاب کا مذہب مشہور ہے کہ وہ قرأت خلف الامام سے بہت سختی سے منع کرتے تھے، چنانچہ ہم پہلے اچھی طرح واضح کر چکے ہیں۔ ہاں! اگر امام لحان (غلط خوان جاہل) ہے تو اس کے پیچھے مقتدی کو قرأت کی اجازت دیتے تھے اور اس کے بعض فقہاء حنفیہ بھی قائل ہیں۔

"روی الطبرانی فی الکبیر بسند رجاله ثقات عن ابن مسعود أنه قال: یافلان لا تقرأ خلف الإمام إلاّ أن یکون إماماً لایقرأ. (مجمع الزوائد) أی إلاأن یکون الإمام لحاناً فحینئذ یجوز للمقتدی أن یقرأخلفه وهٰذا وجه ذهب إلیه بعض أصحابنا. (عمدة القاری)(۴)

(۱) میزان الإعتدال،محمدبن الحسن بن کوثر أبو بحر البربهاری:۵۱۹/۳،دارالمعرفة.انیس

(۲) سورة الأعراف:۲۰۴،انیس

(۳) القراءة خلف الإمام للبخاری،باب وجوب القراءة للإمام والمأموم :۱۰/۱،المکتبةالسلفیة.انیس

(۴) المعجم الکبیر: ۲٦٤/۹ (ح:۹۳۱۲)/مجمع الزوائد،باب القراءة فی الصلاة:۱۱۰/۲، مکتبة القدسی/ عمدة القاری،باب وجوب القراءة للإمام والمأموم:۱۵/٦،دارإحیاء التراث العربی .انیس

''طبرانی نے بروایت ثقات عبداللہ بن مسعود سے روایت کیا ہے، انہوں نے فرمایا: اے فلاں امام کے پیچھے قرأت نہ کرنا، مگر یہ کہ امام قاری نہ ہو (امی ہو تو قرأت کرلیا کرو)۔ (مجمع الزوائد) یعنی اگر امام غلط خواں جاہل ہو تو مقتدی کے لیے جائز ہے کہ اس کے پیچھے قرأت کرے، ہمارے بعض اصحاب اس کے قائل ہیں''۔ (عمدۃ القاری)

اس کے بعد صاحب تکمیل نے ترمذی کی ایک عبارت نقل کردی ہے کہ حدیث عبادہ حدیث حسن صحیح ہے اور اصحاب رسول صلی اللہ علیہ وسلم وغیرہ اکثر اہل علم کا اسی پر عمل ہے، ان ہی میں سے حضرت عمر فاروق و جابر بن عبداللہ و عمران بن حصین رضی اللہ عنہم اجمعین ہیں، ان سب کا قول اور فتویٰ یہی ہے کہ بغیر سورۂ فاتحہ کے نماز کام (۱) ہی کی نہیں بالکل بے کار ہے، اھ، مگر حدیث عبادہ کے الفاظ نقل نہیں کیے، اس کے الفاظ یہ ہیں:

''**لا صلاة لمن لم يقرأ بفاتحة الكتاب**''. (۲)

''اس شخص کی نماز نہیں جو سورۂ فاتحہ نہ پڑھے''۔

تو اس سے کس کو انکار ہے، حنفیہ بھی کہتے ہیں کہ سورۂ فاتحہ کا پڑھنا واجب ہے، گفتگو قرأت خلف الامام میں ہے کہ مقتدی پر بھی قرأت فاتحہ واجب ہے یا نہیں؟ حدیث عبادہ میں اس کا ذکر نہیں اور دوسری احادیث صحیحہ سے ہم بتلا چکے ہیں کہ مقتدی کے لیے امام کی قرأت کافی ہے، مقتدی کو خاموش رہنے کا حکم ہے اور جس جگہ امام ترمذی نے قرأت خلف الامام کا ذکر کیا ہے، وہاں محمد بن اسحٰق کے واسطہ سے محمود بن ربیع کی حدیث حضرت عبادہ سے نقل کرکے جس میں ''**لا تفعلوا إلا بأم القرآن**'' آیا ہے ''امام کے پیچھے نہ پڑھو، مگر سورۂ فاتحہ'' یہ تصریح بھی کردی ہے کہ اس حدیث کو زہری نے محمود بن ربیع سے حضرت عبادہ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے یوں روایت کیا ہے: ''**لا صلاة لمن لم يقرأ بفاتحة الكتاب وقال هذا أصح**''. (۳) ''اس شخص کی نماز نہیں جو سورۂ فاتحہ نہ پڑھے اور یہی زیادہ صحیح ہے''۔ جس میں اشارہ کردیا کہ محمد بن اسحٰق کا ''**إلا بأم القرآن**'' زیادہ کرنا صحیح نہیں، پس گفتگو قرأت فاتحہ میں نہیں ہے کہ اس کا وجوب امام و منفرد پر متفق علیہ ہے؛ بلکہ قرأت خلف الامام میں گفتگو ہے اور ہم بتلا چکے ہیں کہ حدیث عبادہ سے مقتدی پر قرأت خلف الامام کا وجوب ثابت نہیں ہوتا، امام ترمذی نے ''**باب ترک القراءة خلف الامام**'' منعقد کرکے امام احمد بن حنبل کا یہ قول نقل فرمایا ہے:

''**وأما الإمام أحمد بن حنبل فقال: معنى قول النبي صلّى الله عليه وسلّم لا صلاة لمن لم يقرأ بفاتحة الكتاب إذا كان وحده واحتج بحديث جابر بن عبد الله حيث قال من صلّى ركعة لم**

(۱) ''لا تجزئ صلوٰة'' کا یہ ترجمہ ایجاد بندہ ہے اس کا صحیح ترجمہ یہ ہے کہ بغیر فاتحہ کے نماز کافی نہیں۔ ظ

(۲) صحيح البخاري، باب وجوب القراءة للإمام والمأموم في الصلاة (ح: ۷۵۶) انيس

(۳) سنن الترمذي، كتاب الصلاة، باب ماجاء في القراءة خلف الإمام: ۷۲/۱ (ح: ۳۱۱) بيت الأفكار، انيس

یقرأ فیها بأم القراٰن فلم یصل إلا أن یکون وراء الإمام. قال أحمد بن حنبل: فهٰذا رجل من أصحاب النبی صلّی اللّٰه علیه وسلّم تأول قول النبی صلّی اللّٰه علیه وسلّم لاصلاة لمن لم یقرأ بفاتحة الکتاب إن هٰذا إذا کان وحده،اهـ .(ص:٤٢)(۱)

''لیکن احمد بن حنبل فرماتے ہیں کہ حدیث عبادہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد کہ اس شخص کی نماز نہیں، جو سورۂ فاتحہ نہ پڑھے، اس شخص کے لیے جو تنہا نماز پڑھے اور حضرت جابر کی حدیث سے استدلال کیا، وہ فرماتے ہیں کہ جو شخص نماز کی کسی رکعت میں سورۂ فاتحہ نہ پڑھے، اس کی نماز نہیں، مگر یہ کہ امام کے پیچھے ہو۔ امام احمد نے فرمایا کہ دیکھو! رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس صحابی نے یہی مطلب بیان کیا ہے کہ جو شخص تنہا نماز پڑھے، اس کی نماز بغیر قرأت فاتحہ کے نہیں ہوتی''۔

مقتدی کے لیے اس کو عام نہیں سمجھا تو یہ کہاں کا انصاف ہے کہ بیہقی وغیرہ کا قول تو حجت ہو اور امام احمد کا قول حجت نہ ہو۔

اثر عمران بن حصین رضی اللہ تعالیٰ عنہ:

اس کے بعد صاحب تکمیل البرہان نے جزء القراءۃ بیہقی سے حضرت عمران بن حصین کا قول نقل کیا ہے کہ کسی مسلمان کی نماز بغیر وضو اور بغیر رکوع اور بغیر سجود اور بغیر فاتحہ کے پاک نہیں ہوتی، امام کے پیچھے ہو یا اکیلا۔(۲)

اس اثر کے جملہ اجزاء متفق علیہ ہیں، بجز وراء الامام وغیر الامام کہ جس سے امام کے پیچھے قرأت فاتحہ کا ثبوت دیا گیا ہے۔ صاحب تکمیل کو لازم تھا کہ اس جز کی صحت کو ثابت کرتے؛ کیوں کہ اس کی سند میں زیاد بن ابی زیاد الجصاص ہے جس کو امام احمد اور یحییٰ بن معین اور علی بن مدینی اور ابوزرعہ اور ابوحاتم اور نسائی اور فضل غلابی اور دارقطنی اور ابن عدی نے ضعیف متروک، مذموم، منکر الحدیث کہا ہے،(۳) اور اس کے معارض وہ حدیث ہے، جو امام بیہقی ہی نے سلمہ بن فضل سے حجاج بن ارطاۃ سے قتادہ سے زرارۃ بن اوفی سے حضرت عمران بن حصین سے روایت کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لوگوں کو نماز پڑھا رہے تھے اور ایک شخص آپ کے پیچھے قرأت کر رہا تھا، جب آپ فارغ ہوئے تو فرمایا: مجھ سے میری سورت میں کون منازعت کر رہا تھا؟ پھر آپ نے امام کے پیچھے قرأت کرنے سے منع کر دیا۔

امام بیہقی نے اس میں یہ کلام کیا ہے کہ ''**نهی عن القرأة خلف الإمام**''. ''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے بعد قرأت خلف الامام سے منع فرما دیا''۔ تنہا حجاج بن ارطاۃ نے اس حدیث میں زیادہ کہا ہے۔

---

(۱) کتاب الصلاة (ح:٣١٢) انیس

(۲) کذا فی القراء ة خلف الإمام للبخاری،باب وجوب القراء ة للإمام والمأموم : ١٦/١،المکتبةالسلفية.انیس

(۳) الموضوعات لابن الجوزی، کتاب معاشرةالناس:٨٠/٣،المکتبةالسلفية/سؤالات أبی عبید الآجری أبا داؤد السجستانی، ذکرأهل البصرة: ٢٤٧/١،عمادة البحث العلمی بالجامعة الإسلامية المدينة المنورة/تهذيب التهذيب، من اسمه زياد:٣٦٨/٣،المطبعة النظامية.انیس

میں کہتا ہوں کہ حجاج بن ارطاۃ محمد بن اسحٰق سے زیادہ قوی ہے، جس کی روایت کو بیہقی اور اہل حدیث بار بار حجت میں پیش کرتے ہیں، حجاج بن ارطاۃ سے امام مسلم نے مفرداً روایت کی ہے، امام بخاری نے تعلیقاً اس سے استشہاد کیا ہے، شعبہ اس کی بہت تعریف کرتے تھے، اسی طرح حماد بن زید اور سفیان بن عیینہ اور سفیان ثوری نے اس کے تیقظ اور حفظ حدیث کی تعریف کی ہے اور جملہ ائمہ حدیث اس سے روایت کرتے ہیں، ترمذی نے اس کی بعض احادیث کی تصحیح کی ہے اور اکثر کی تحسین کی ہے اور اس سے روایت کرنے والا سلمہ بن الفضل بھی ثقہ ہے، یحییٰ بن معین نے اس کی توثیق کی، اسی طرح ابوداؤد اور ابن سعد اور امام احمد نے اس کو ثقہ کہا ہے،(۱) پس بصاص کی روایت سے احتجاج کرنا اور حجاج بن ارطاۃ کی روایت سے اعراض کرنا انصاف سے بعید ہے اور اپنے مذہب کی حمایت کے سوا کچھ نہیں۔

اس کے بعد صاحب تکمیل نے تابعین کے فتاویٰ بھی نقل کئے ہیں، گو اہل ظاہر کو تابعین کے اقوال سے احتجاج کرنا زیب نہیں دیتا، جن کے نزدیک حدیث مرفوع کے سوا قول صحابی بھی حجت نہیں ہے۔

اثر سعید بن جبیر رحمۃ اللہ علیہ:

سب سے پہلے حضرت سعید بن جبیر رحمہ اللہ تعالیٰ کا فتویٰ نقل کیا گیا ہے، مگر ترجمہ نہیں کیا؛ کیوں کہ وہ مؤلف کے خلاف تھا، حاصل اس کا یہ ہے کہ ان سے عبداللہ بن عثمان بن خثیم نے سوال کیا کہ کیا میں امام کے پیچھے قرأت کروں؟ فرمایا: ہاں! اگرچہ اس کی قرأت کو سنتے بھی ہو، لوگوں نے آج کل نیا طریقہ نکالا ہے، جو سلف نہیں کرتے تھے، سلف کا یہ طریقہ تھا کہ جب کوئی امام بنتا تھا تو وہ تکبیر (تحریمہ) کہہ کر خاموش رہتا تھا، یہاں تک کہ اس کے خیال میں مقتدی اس کے پیچھے سورۂ فاتحہ پڑھ چکے ہوں، پھر وہ قرأت کرتا اور لوگ خاموش رہتے۔(۲)

میں کہتا ہوں اس اثر میں سلف کا جو طریقہ بیان کیا ہے، اس میں تصریح ہے کہ وہ امام کے ساتھ قرأت نہ کرتے تھے؛ بلکہ سکتہ امام میں قرأت کرتے تھے اور امام کی قرأت کے وقت خاموش رہتے تھے اور اس صورت میں کوئی اختلاف نہیں، سکتہ امام میں قرأت کو ہم بھی جائز کہتے ہیں اور وجوب کی کوئی دلیل نہیں؛ کیوں کہ امام پر سکتۂ طویلہ کا واجب ہونا، کسی دلیل سے ثابت نہیں، علامہ ابن تیمیہ کے حوالہ سے اس کا ذکر گزر چکا ہے اور خود سعید بن جبیر کا جو قول بیان کیا گیا ہے، اس کے خلاف مصنف ابن ابی شیبہ میں بواسطہ ہشیم کے سعید بن جبیر کا یہ فتویٰ مذکور ہے کہ ان سے قرأت خلف الامام کی بابت سوال کیا گیا تو فرمایا: امام کے پیچھے قرأت نہیں ہے اور اس کے سب راوی ثقہ ہیں، جن

(۱) میزان الاعتدال، حجاج بن أرطاة: ۴۵۸/۱-۴۶۰، دارالمعرفة/تهذيب التهذيب، من اسمه حجاج: ۱۹۶/۲-۱۹۷، المطبعة النظامية. انيس

(۲) القراءة خلف الإمام للبخاری، باب من قرأ فی سكتات الإمام، الخ: ۶۴/۱، المكتبةالسلفية. انيس

(۳) مصنف ابن أبی شيبة، من كره القراءة خلف الإمام (ح: ۳۷۹۲) انيس

سے اصحاب صحاح نے احتجاج کیا ہے، پس ان کا جو فتویٰ نص قرآن اور حدیث صحیح ''إذا قرأ الإمام فانصتوا'' کے موافق ہوگا، وہی راجح اور صحیح ہوگا۔

فتویٰ حماد بن ابی سلیمان رحمہ اللہ تعالیٰ:

اس کے بعد امام ابوحنیفہ کے استاد حماد بن ابی سلیمان کا فتویٰ نقل کیا گیا ہے کہ ان سے نماز ظہر اور عصر میں (صاحب تکمیل نے یہ جملہ حذف کر دیا ہے، مغالطہ دینا اس کو کہتے ہیں) قرأت خلف الامام کے متعلق دریافت کیا گیا تو فرمایا: سعید بن جبیر پڑھتے تھے، میں نے کہا آپ کا فتویٰ کیا ہے؟ فرمایا: میں بھی اس کو پسند کرتا ہوں کہ قرأت کرو۔

اس سے بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ سعید بن جبیر صرف ظہر و عصر میں قرأت خلف الامام کے قائل تھے، اسی کو حماد نے پسند کیا اور ایک روایت میں جس کو صاحب ہدایہ نے امام محمد سے نقل کیا ہے، امام ابوحنیفہ نے بھی اس کو پسند کیا ہے، گفتگو صرف اس صورت میں ہے کہ امام قرأت جہر سے کر رہا ہو، اس سے متعلق صاحب تکمیل کے پاس کوئی دلیل نہیں کہ اس حالت میں بھی مقتدی پر قرأت واجب ہے۔

فتویٰ مکحول رحمہ اللہ تعالیٰ:

اس کے بعد مکحول شامی کا فتویٰ نقل کیا گیا ہے، مگر ظاہر ہے کہ مکحول نے صرف دو تین صحابہ کو دیکھا ہے، ان کے فتویٰ کی محمد بن سیرین کے فتویٰ کے سامنے کوئی حیثیت نہیں، جو فرماتے ہیں کہ میں امام کے پیچھے قرأت کرنے کو سنت نہیں سمجھتا؛ جیسا بسند صحیح ابن ابی شیبہ کے حوالہ سے ہم بیان کر چکے ہیں۔(۱)

رہا امام بخاری کا جزء القراءۃ میں یہ فرمانا کہ ''تابعین میں سے فلاں فلاں (گیارہ حضرات) قرأت خلف الامام کے قائل و عامل تھے''۔(۲) اس کے متعلق سند اور الفاظ کا سامنے ہونا ضروری ہے؛ کیوں کہ ممکن ہے کہ وہ حضرات نماز سری میں یا جہری کے سکتات میں قرأت کے قائل ہوں اور اس کو ہم بھی منع نہیں کرتے، امام بخاری نے بہت سے صحابہ اور تابعین کا نام قرأت خلف الامام کے قائلین میں شمار کر دیا ہے؛ حالانکہ تحقیق کے بعد معلوم ہوا کہ وہ مطلقاً اس کے قائل نہ تھے، بلکہ نماز سری میں یا جہری کے سکتات میں قرأت خلف الامام کے قائل تھے اور ہم بار بار بتلا چکے ہیں کہ اس صورت میں نزاع نہیں، چنانچہ صاحب تکمیل نے حضرت سعید بن جبیر او رابوسلمہ اور حسن بصری کا فتویٰ اپنی تائید میں نقل کر دیا، حالانکہ اول و دوم سکتہ امام میں قرأت کے قائل ہیں اور امام حسن بصری ''في نفسک''(۳) کی قید بڑھاتے

(۱) مصنف ابن أبی شیبة،من کره القراءة خلف الإمام (ح:٣٧٩٤)انیس
(۲) القراءة خلف الإمام للبخاری،باب وجوب القراءة للإمام والمأموم: ١٠/١،المکتبةالسلفیة.انیس
(۳) مصنف ابن أبی شیبة،من رخص فی القراءة خلف الإمام (ح:٣٧٦٢)انیس

ہیں کہ امام کے پیچھے سورہ فاتحہ اپنے دل میں پڑھ لیا کرو اور اس کو کوئی منع نہیں کرتا۔ صاحب تکمیل کا یہ ترجمہ کہ ''آہستہ پڑھ لیا کرو''، ہم پر حجت نہیں۔ پھر جزء القراءۃ امام بخاری کے حوالہ سے یہ بھی لکھ دیا کہ حسن بصری وسعید بن جبیر اور میمون بن مہران وغیرہ بے شمار تابعین نے امام کے پیچھے قرأت کرنے کو کہا ہے، حالانکہ حسن بصری اور سعید بن جبیر کے الفاظ سے سکتہ امام کے وقت یا دل میں پڑھنے کی قید صاف مذکور ہے۔

اثر عطاء رحمہ اللہ تعالیٰ:

عطاء بن ابی رباح کا فتویٰ حنفیہ کے موافق ہے، اہل حدیث کے موافق نہیں، وہ فرماتے ہیں کہ جب امام جہر سے قرأت کرے تو مقتدی جلدی کرے اور امام کے سکوت میں سورۂ فاتحہ پڑھ لے اور جب امام قرأت کرے تو خاموش رہے، جیسا اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے۔(۱) اس سے صاف ظاہر ہے کہ عطا بن ابی رباح کے نزدیک آیت: ﴿وإذا قرئ القرآن فاستمعوا له وأنصتوا﴾ (۲) قرأت خلف الامام کے متعلق نازل ہوئی ہے اور مقتدی پر امام کی قرأت کے وقت خاموش رہنا واجب ہے۔

اثر مجاہد رحمہ اللہ تعالیٰ:

رہا مجاہد کا فتویٰ کہ جو شخص امام کے پیچھے قرأت نہ کرے، اس کو نماز کا اعادہ کرنا چاہیے، اسی طرح عبداللہ بن زبیر نے فرمایا ہے۔(۳) اس میں سورۂ فاتحہ کا ذکر نہیں، نہ اس کا ذکر ہے کہ امام کے ساتھ قرأت کرے، یا اس کے سکوت کے وقت؛ اس لیے اس سے حجت قائم نہیں ہوسکتی۔ ہم نے گذشتہ اوراق میں امام احمد کا قول کتاب المغنی سے نقل کردیا ہے کہ مقتدی کے ذمہ امام کے پیچھے قرأت کا واجب نہ ہونا اجماعی مسئلہ ہے۔ امام احمد فرماتے ہیں کہ ہم نے اہل اسلام میں سے کسی کو یہ کہتے ہوئے نہیں سنا کہ جب امام قرأت جہراً کرے اور اس کے پیچھے مقتدی قرأت نہ کرے تو اس کی نماز صحیح نہ ہوگی، فرمایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ وتابعین اور اہل حجاز میں امام مالک اور اہل عراق میں سفیان ثوری اور اہل شام میں اوزاعی اور اہل مصر میں لیث (بن سعد) ان میں سے کوئی نہیں کہتا کہ جس نے امام کے پیچھے قرأت نہ کی ہو اور امام نے قرأت کی ہو تو نماز باطل ہے، اھ۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ امام احمد کے نزدیک یا تو مجاہد اور عبداللہ بن زبیر کا فتویٰ مذکورہ بسند صحیح ثابت نہیں، یا اس کا وہ مطلب صحیح نہیں، جو اہل حدیث نے سمجھا ہے۔

فتویٰ امام اوزاعی ولیث بن سعد:

اسی طرح صاحب تکمیل نے تمہید ابن عبدالبر سے امام اوزاعی اور لیث بن سعد کا جو فتویٰ نقل کیا ہے کہ وہ مقتدی کے ذمہ

(۱) مصنف عبدالرزاق الصنعانی، باب القراءة خلف الإمام (ح: ۲۷۸۸) انیس
(۲) سورة الأعراف: ۲۰۴، انیس
(۱) القراءة خلف الإمام للبخاری، باب وجوب القراءة للإمام والمأموم: ۱/۰۱-۱۱، المکتبة السلفیة، انیس

قرأت خلف الامام کو ضروری سمجھتے تھے۔(۱) قابل قبول نہیں؛ کیوں کہ امام احمد بن حنبل اقوال علما کو ان سے زیادہ جانتے ہیں۔
امام لیث بن سعد مصری کے متعلق تاریخ ابن خلکان میں ہے کہ وہ حنفی تھے، معانی الآثار طحاوی میں **باب القراءة خلف الإمام** میں لیث بن سعد کی روایت امام ابو یوسف سے امام ابوحنیفہ سے موسیٰ بن ابی عائشہ سے عبداللہ بن شداد سے حضرت جابر بن عبداللہ سے موجود ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: **"من كان له إمام فقراءة الإمام له قرأة"** (۲) جو شخص امام کے ساتھ (نماز پڑھتا) ہو تو امام کی قرأت اس کے لیے قرأت ہے۔
لیث بن سعد فرماتے ہیں کہ میں امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کا نام سنتا تھا اور ان سے ملنے کا مشتاق تھا، پھر میں نے مکہ میں ان کو اس حالت میں پایا کہ لوگ ان پر ہجوم کئے ہوئے تھے اور (مسائل شرعیہ میں) فتویٰ طلب کر رہے تھے، اسی حالت میں ایک شخص نے اپنی کسی خاص حاجت میں فتویٰ پوچھا تو مجھے ان کے فی البدیہہ جواب سے بڑا تعجب ہوا۔ (فیض الباری: ۱/۱۷۸) اس سے بھی ان کا حنفی ہونا ثابت ہوتا ہے تو ممکن ہے کہ امام ابوحنیفہ کی روایت کردہ حدیث سننے سے پہلے وہ قرأت خلف الامام کے قائل ہوں، جب یہ حدیث سنی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ جو شخص امام کے ساتھ نماز پڑھے، اس کے لیے امام کی قرأت کافی ہے، اس کے بعد قرأت خلف الامام کے قائل نہیں رہے۔

فتویٰ عبداللہ بن المبارک:

ترمذی سے عبداللہ بن مبارک کا جو قول نقل کیا گیا ہے کہ ''میں امام کے پیچھے قرأت کرتا ہوں اور لوگ بھی قرأت کرتے ہیں، مگر کوفہ والوں میں سے ایک قوم۔'' تو یہ بھی عبداللہ بن المبارک کا ارشاد دلائل اہل عراق سننے سے پہلے ہوگا؛ کیوں کہ بعد میں ان کا حنفی مذہب اختیار کرنا دنیا کو معلوم ہے۔ مؤرخین اور اصحاب طبقات نے ان کو حنفیہ میں شمار کیا ہے، بعض لوگوں نے صرف اس لیے کہ امام مالک سے روایت کرتے ہیں، مالکیہ میں شمار کر دیا ہے، مگر ان کی فقہی کتابیں اقوال ابوحنیفہ سے مزین و مملو ہیں، امام مالک کا قول شاذ و نادر ہی بیان کرتے ہیں، ان کے اس قول سے **"إلاّ قوم من الكوفيين"** (مگر کوفہ والوں میں سے ایک قوم) یہ سمجھنا کہ کوفہ والوں میں سے صرف ایک جماعت قرأت خلف الامام نہیں کرتی تھی، باقی سب کرتے تھے، صاحب تکمیل کی خوش فہمی ہے، اہل کوفہ عبداللہ بن مسعود اور ان کے اصحاب اور اصحاب علی کے مسلک پر تھے اور ان حضرات کا مذہب ترک قرأت خلف الامام مشہور و معروف ہے۔

علامہ ابن تیمیہ کی تحقیق:

صاحب تکمیل کو علامہ ابن تیمیہ کا قول پھر یاد کر لینا چاہیے، جو ہم پہلے لکھ چکے ہیں ''جو لوگ امام کے ساتھ قرأت

(۱) التمهيد لما في الموطأ من المعاني والأسانيد، الحديث التاسع والثلاثون: ۱۱/٤۱، المغرب، انیس
(۲) موطأ الإمام محمد، باب افتتاح الصلاة (ح: ۱۱۷) انیس

سے (مقتدی کو) منع کرتے ہیں، ان کے ساتھ جمہور سلف وخلف ہیں اور ان کی تائید میں کتاب اللہ اور سنت صحیحہ بھی ہے اور جو لوگ مقتدی پر امام کے ساتھ قرأت کو واجب کہتے ہیں، ان کی حدیث کو ائمہ (حدیث) نے ضعیف قرار دیا ہے اور حدیث ابوموسیٰ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد "إذا قرأ فانصتوا" (جب امام) قرأت کرے تو خاموش رہو، امام احمد واسحٰق (بن راہویہ) اور امام مسلم وغیرہ کے نزدیک صحیح ہے، بخلاف اس کے کہ (جس سے فاتحہ خلف الامام کا وجوب ثابت کیا جاتا ہے) اس کو صحیح میں شامل نہیں کیا گیا اور چند وجوہ سے اس کا ضعیف ہونا ثابت ہو چکا ہے اور وہ صرف عبادۃ بن الصامت کا قول ہے، اھ، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد نہیں۔

اس کے بعد صاحب تکمیل نے قرأت خلف الامام کا ثبوت ائمہ کرام کے اقوال سے دینا چاہا ہے، جن میں امام مالک اور امام احمد کو بھی شامل کرلیا ہے؛ حالانکہ کتاب المغنی کے حوالہ سے ہم بتلا چکے ہیں کہ امام احمد کا قول وجوب قرأت فاتحہ خلف الامام ہرگز نہیں، وہ تو اس بات پر اجماع نقل کرتے ہیں کہ مقتدی کے ذمہ قرأت فاتحہ کسی کے نزدیک بھی واجب نہیں اور جہری نماز میں تو امام مالک اور احمد بن حنبل امام کے پیچھے قرأت کو ناجائز کہتے اور مقتدی کو خاموش رہنے کا حکم دیتے ہیں، البتہ سری نماز میں قرأت خلف الامام کی اجازت دیتے ہیں، بقیہ ائمہ کرام کا مذہب بھی آپ نے ایسا ہی نقل کیا ہوگا، جیسا امام احمد اور مالک کا مذہب نقل کیا ہے۔ اس لیے جب تک ان کے الفاظ سامنے نہ ہوں، اس وقت تک فیصلہ نہیں ہوسکتا؛ کیوں کہ صاحب تکمیل نے امام زہری کا نام بھی اسی فہرست میں شائع کردیا ہے، حالانکہ ہم موطا مالک اور جزء القرأت بیہقی کے حوالہ سے دکھلا چکے ہیں کہ زہری نماز جہری میں قرأت خلف الامام کو سختی سے منع کرتے تھے۔(۱) امام مسلم کا اپنی جامع صحیح میں "إذا قرأ الإمام فانصتوا" کی روایت کو داخل کرنا اور حدیث ابی موسیٰ وابی ہریرہ میں اس زیادت کو صحیح قرار دینا، بتلا رہا ہے کہ امام مسلم کے نزدیک قرأت خلف الامام نہیں ہے؛ بلکہ مقتدی کو خاموش رہنا ضروری ہے۔ اس کے خلاف جب تک ان کے صحیح صاف الفاظ نہ ہوں، اس وقت تک ان کو قرأت خلف الامام کرنے والوں میں شمار نہیں کیا جاسکتا۔

امام نووی رحمہ اللہ تعالیٰ:

امام نووی کی جو عبارت صاحب تکمیل نے نقل کی ہے کہ جمہور علماء سلف وخلف کے نزدیک ہر رکعت میں فاتحہ پڑھنا واجب ہے،(۲) اس میں قرأت خلف الامام کا ذکر نہیں، صرف قرأت فاتحہ کا ذکر ہے اور اس کو ہم بھی امام اور منفرد کے حق میں واجب کہتے ہیں۔

---

(۱) عن ابن شهاب أنه كان يقرأ خلف الإمام فيما لم يجهر فيه الإمام بالقراءة.(موطأ الإمام مالك رواية أبي مصعب الزهري، العمل في القراءة فيما لم يجهر فيه (ح:٢٤٧)انيس

(٢) شرح النووي لمسلم، باب وجوب قراءة الفاتحة في كل ركعة: ١٠٣/٤، دار إحياء التراث العربي بيروت، انيس

شاہ ولی اللہ رحمہ اللہ تعالیٰ:

شاہ ولی اللہ صاحب کا مسلک حجۃ اللہ البالغہ سے ہم نقل کر چکے ہیں کہ نماز جہری میں ان کے نزدیک مقتدی کو خاموش رہنا واجب ہے، وہ صرف سری نمازوں میں یا جہری کے سکتات میں قرأت خلف الامام کی اجازت دیتے ہیں،(۱) اور اس میں کسی کو اختلاف نہیں۔

اسی طرح تفسیر خازن سے جو عبارت نقل کی گئی ہے، اس میں بھی قرأت خلف الامام کا ذکر نہیں، صرف قرأت فاتحہ کا وجوب مذکور ہے اور اس میں گفتگو نہیں محل نزاع قرأت فاتحہ خلف الامام ہے۔ غرض امام نووی ہوں یا بغوی ان سب نے فقط سورۂ فاتحہ کا واجب ہونا بیان کیا ہے، اس کو حنفیہ بھی مانتے ہیں، گفتگو اس میں ہے کہ امام کی قرأت سے یہ واجب مقتدی کے ذمہ سے ادا ہوتا ہے یا نہیں؟ سو امام احمد کے قول سے معلوم ہو چکا ہے کہ اہل اسلام میں سے کوئی بھی اس کا قائل نہیں کہ امام کے ساتھ اگر مقتدی قرأت نہ کرے تو اس کی نماز باطل ہے۔ پس صاحب تکمیل کا وجوب فاتحہ کے اقوال سے قرأت فاتحہ پر استدلال کرنا محض مغالطہ ہے۔

امام رازی رحمہ اللہ تعالیٰ:

امام رازی کا حدیث "**قسمت الصلاة بيني بين عبدي**" سے رکنیت فاتحہ پر استدلال کرنا جو وزن رکھتا ہے،(۲) اہل علم اس کو اچھی طرح جانتے ہیں؛ کیوں کہ خبر واحد سے رکنیت ثابت کرنا ان ہی لوگوں کا کام ہے، جو رکن اور واجب کے فرق سے ناواقف ہیں، پھر اس حدیث سے یہ بھی تو ثابت ہے کہ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم سورۂ فاتحہ کا جز نہیں، امام رازی اور جملہ اہل حدیث کے خلاف ہے، جو جواب وہ اس کا دیں گے، وہی ہماری طرف سے جواب ہوگا۔

عمل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم او تعامل خلفا رضی اللہ تعالیٰ عنہم:

رہا یہ کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اور خلفاء راشدین نے نماز میں قرأت فاتحہ پر مواظبت اور مداومت کی ہے، سو اس سے صرف امام اور منفرد پر قرأت فاتحہ کا وجوب ثابت ہوتا ہے اور حنفیہ اس کے قائل ہیں، قرأت فاتحہ خلف الامام کا وجوب اس سے کیوں کر معلوم ہوا؟ جب کہ حدیث صحیح میں مقتدی کو امام کے پیچھے خاموش رہنے کا حکم ہے "**إذا قرأ الإمام فانصتوا**". اور نص قرآن سے بھی مقتدی پر استماع وانصات کا وجوب ثابت ہے۔ ﴿**وإذا قرئ القرآن فاستمعوا له وأنصتوا**﴾ (۳) اور ہم بار بار بتلا چکے ہیں کہ بالاجماع یہ آیت قرأت خلف الامام سے منع

(۱) حجة الله البالغة،أذكار الصلاة وهيئاتها المندوب إليها: ١٤/٢،دار الجيل بيروت.انيس

(۲) مفاتيح الغيب المعروف بالتفسير الكبير للرازی،الباب الرابع فی المسائل الفقهية المستنبطة: ١٦٩/١، دار إحياء التراث العربی بيروت.انيس

(۳) سورة الأعراف: ٢٠٤،انيس

کرنے میں نازل ہوئی ہے۔ نیز ہم نے کتاب کشف الاسرار کے حوالہ سے گزشتہ اوراق میں بتلا دیا ہے کہ حضرات صحابہ میں سے دس حضرات نے سختی کے ساتھ قرأت خلف الامام سے منع کیا ہے، جن میں خلفا اربعہ بھی شامل ہیں۔

مشائخ صوفیا رحمہم اللہ تعالیٰ:

اس کے بعد صاحب تکمیل نے قرأت خلف الامام کا ثبوت مشائخ کرام وصوفیہ عظام کے اقوال سے دینا چاہا ہے، مگر یہاں بھی وہی مغالطہ دیا ہے کہ بعض حضرات نے قرأت سورۂ فاتحہ کو ضروری فرمایا تھا، آپ نے اس سے قرأت خلف الامام پر دلیل قائم کردی، حالانکہ قرأت فاتحہ کے واجب ہونے میں کسی کو کلام نہیں، گفتگو قرأت خلف الامام میں ہے۔ سیدنا شیخ عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ کے قول سے، اسی طرح خواجہ بہاؤالدین نقشبندی اور خواجہ معین الدین چشتی اور خواجہ شہاب الدین سہروردی کے اقوال سے صرف قرأت فاتحہ کا وجوب ثابت ہوتا ہے، نہ کہ قرأت خلف الامام کا۔ سلطان نظام الدین اولیاء کے تذکرہ سے نقل کیا گیا ہے:

"لكنه يجوز القراءة بالفاتحة خلف الإمام في الصلاة وكان يقرأها في نفسه".

''وہ حنفی تھے؛ لیکن قرأت خلف الامام کو جائز کہتے تھے اور فی نفسہ قرأت کرتے تھے''۔

صاحب تکمیل کے نزدیک اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ آہستہ پڑھتے تھے، ہمارے نزدیک اس کے معنی یہ ہیں کہ دل میں پڑھتے یا امام کی قرأت سے پہلے، یا اس کے سکتہ میں تنہا قرأت فرماتے تھے، ساتھ ساتھ قرأت نہ کرتے تھے، اگر وہ نماز جہری میں امام کے ساتھ قرأت کرتے تھے تو اس کا واضح ثبوت پیش کرنا چاہیے اور یہ بھی بتلانا چاہیے کہ حضرات صحابہ وتابعین وائمہ مجتہدین اور جمہور سلف وخلف کے مقابلہ میں ان حضرات کی رائے کیا وزن رکھتی ہے۔ (اس سلسلہ میں سب سے پہلے یہ امر غور طلب ہے کہ صاحب تذکرہ کا ثقاہت میں کیا مقام ہے؟ اور ان سے لے کر نظام الدین رحمہ اللہ تعالیٰ تک سند کا کیا حال ہے؟ (رشید احمد)

امام ابوحنیفہ اور امام محمد رحمہما اللہ تعالیٰ:

اس کے بعد صاحب تکمیل نے قرأت خلف الامام کا ثبوت امام ابوحنیفہ اور علماء احناف کے اقوال سے دینا چاہا ہے، سب سے پہلے علامہ شعرانی کی میزان کبریٰ کے حوالہ سے یہ لکھا ہے کہ قرأت فاتحہ خلف الامام کے بارے میں امام ابوحنیفہ اور امام محمد کے دو قول ہیں: ایک یہ کہ مقتدی کو الحمد پڑھنا نہ واجب ہے نہ سنت، یہ ان کا پرانا قول ہے اور یہی مشہور ہوگیا۔ دوسرا قول یہ ہے کہ بر سبیل احتیاط سری نماز میں قرأت فاتحہ مستحسن ہے، مکروہ نہیں۔

اس پر صاحب تکمیل کا یہ حاشیہ کہ! ''یار لوگوں نے اس رجوع کو (یعنی دوسرے قول کو) مشہور نہ ہونے دیا، جس کے باعث مسلمانوں میں فرقہ بازی دھڑا بندی قائم ہوگئی''۔

سراسر لغو ہے؛ کیوں کہ اول تو دونوں قولوں میں کچھ تعارض نہیں، پچھلے قول میں وجوب اور سنیت کی نفی تھی، دوسرے میں استحباب کا ذکر ہے، کوئی بتلائے کہ ان میں تعارض کیا ہوا؟ پھر ہدایہ میں جو فقہ حنفی کی مشہور کتاب اور داخل درس ہے، یہ دوسرا قول مذکور ہے کہ امام محمد نے احتیاطاً سری نمازوں میں قرأت فاتحہ کو مستحسن قرار دیا ہے،(۱) ہدایہ سے زیادہ کونسی کتاب فقہ حنفی میں مشہور ہے؟ تو یہ کہنا غلط ہے کہ یارلوگوں نے دوسرے قول کو مشہور نہ ہونے دیا۔

پھر شاہ ولی اللہ صاحب نے حجۃ اللہ البالغہ میں اور حضرت فقیہ الامت رشید الملت قطب الارشاد مولانا رشید احمد گنگوہی رحمۃ اللہ نے اپنی کتاب سبیل الرشاد میں اس کی تصریح کی ہے کہ جہری کے سکتات میں قرأت فاتحہ خلف الامام جائز ہے، امام کے ساتھ ساتھ جہری نماز میں قرأت کرنا مقتدی کو منع ہے۔

صاحب تکمیل کا یہ کہنا کہ! ''جب امام صاحب اپنے ایک قول کو غلط سمجھ کر اس سے رجوع کر چکے، پھر ان کے ذمہ اس کو لگانا اور اس پر مباحثے اور مناظرے کر کے مسلمانوں میں پھوٹ ڈالنا، کہاں تک دیانت وانصاف ہے، الخ''۔

سراسر لغو ہے، امام صاحب نے اپنے پہلے قول سے رجوع نہیں فرمایا، نہ رجوع کی ضرورت تھی؛ کیوں کہ امام احمد بن حنبل کے قول سے ظاہر ہو چکا ہے کہ ''اہل اسلام میں کوئی بھی اس کا قائل نہیں کہ جب امام قرأت کر رہا ہو، اس وقت مقتدی کے ذمہ قرأت واجب ہے اور اگر وہ قرأت نہ کرے تو اس کی نماز فاسد ہے''۔

جماعت اہل حدیث فرقہ وارانہ فساد کی بانی ہے:

امام صاحب نے دوسرے قول سے صرف سری نمازوں میں احتیاطاً قرأت فاتحہ کو مستحسن اور مستحب فرمایا ہے، جیسا صاحب ہدایہ نے امام محمد سے نقل کیا ہے اور یہ پہلے قول کے معارض نہیں اور جملہ کتب شروح میں یہ قول مذکور ہے۔ رہا اس مسئلہ میں مناظرے اور مباحثے کرنا تو اس کی ابتدا جماعت اہل حدیث کی طرف سے ہوئی ہے، انہوں نے صاحب تکمیل البرہان کی طرح حنفیوں کی نمازوں کو فاسد، باطل، بے پکار کہہ کر آسمان سر پر اٹھالیا، محض اس لیے کہ وہ امام کے پیچھے سورۂ فاتحہ نہیں پڑھتے تو علماء احناف کو اس کا جواب دینے کی ضرورت پیش آئی؛ جیسا اس وقت اس ناچیز کو تکمیل البرہان کے جواب میں قلم اٹھانا پڑا، اگر جماعت اہل حدیث مسائل خلافیہ میں اس قدر شدت کے ساتھ نزاع نہ کرتی تو حنفیہ کو مناظرہ ومباحثہ کی اصلاً ضرورت نہ تھی، آخر مکہ ومدینہ میں بھی تو شافعیہ موجود ہیں، جو قرأت فاتحہ خلف الامام کو فرض جانتے ہیں، مگر حنفیہ کی نمازوں کو باطل اور فاسد نہیں کہتے، وہ جانتے ہیں کہ مسئلہ اختلافی ہے، حنفیہ کے پاس بھی قرآن وحدیث اور عمل سلف وخلف سے دلائل موجود ہیں؛ اس لیے کسی کو حق نہیں کہ ایک دوسرے کے مسلک کو باطل اور نمازوں کو فاسد قرار دے؛ اس لیے وہاں ان مسائل میں مناظرہ ومباحثہ کی کبھی نوبت نہ آئی، پاکستان یا ہندوستان میں اس کی نوبت جماعت اہل حدیث کی دریدہ دہنی کی وجہ سے پیش آئی۔ (والبادی أظلم)

(۱) الهداية، فصل فی القراءة: ۵٦/۱، دار إحياء التراث العربی بيروت. انيس

علامہ عینی رحمہ اللہ تعالیٰ:

غیث الغمام کے حوالہ سے علامہ عینی کا جو قول شرح بخاری سے نقل کیا گیا ہے، اس میں یہ لفظ تو ہے: "**علی أن بعض أصحابنا إستحسنوا ذٰلک علی سبیل الاحتیاط فی جمیع الصلوات ومنهم إستحسنها فی غیر الجهریة ومنهم من رأی ذٰلک إذا کان الإمام لحانًا**". (۱٤/۲:) "پھر ہمارے بعض اصحاب (حنفیہ) نے اس (قرأت خلف الامام) کو بر سبیل احتیاط تمام نمازوں میں اور بعض نے سری نمازوں میں اور بعض نے امام لحان (غلط خواں) کے پیچھے مستحسن سمجھا ہے" اھ۔ مگر واجب نہیں سمجھا اور جہری نمازوں میں امام کی قرأت کے ساتھ مقتدی کو قرأت کی اجازت نہیں دی؛ بلکہ اس کی قرأت سے پہلے یا پیچھے اجازت دی ہے؛ تاکہ فرض انصات فوت نہ ہو؛ کیوں کہ مقتدی کے ذمہ قرأت امام کے وقت سننا اور خاموش رہنا واجب ہے، جس کی علامہ عینی نے اسی مقام پر تصریح کردی ہے، مگر علامہ عینی کی عبارت میں اس جگہ لفظ "**علیه فقهاء الحجاز والشام**" نہیں ہے (کہ فقہاء حجاز وشام بھی اسی پر ہیں) اگر غیث الغمام میں اس جگہ یہ لفظ موجود ہے تو علامہ عینی کی طرف نسبت صحیح نہیں اور اگر اس میں بھی یہ لفظ نہیں ہے تو یہ صاحب تکمیل کی ایجاد ہے، علامہ عینی کی عبارت میں جس جگہ فقہاء حجاز وشام کا ذکر ہے، وہ صاحب تکمیل کے لیے مفید نہیں؛ بلکہ مضر ہے۔ ان کی عبارت ملاحظہ ہو:

"**وقال الثوری والأوزاعی فی روایة وأبو حنیفة أبو یوسف ومحمد وأحمد فی روایة وعبداللّٰه بن وهب والأشهب: لایقرأ المؤتم شیئًا من القرآن ولا بفاتحة الکتاب فی شئ من الصلاة وهو قول ابن المسیب وجماعة من التابعین وفقهاء الحجاز والشام علی أنه لایقرأ معه فیما یجهر به وإن لم یسمعه ویقرأ فیما یسر فیه الإمام، آه.** (۱۱/۲)(۱)

"امام سفیان ثوری رحمہ اللہ کا اور امام اوزاعی کا ایک روایت میں اور امام ابوحنیفہ وابو یوسف اور محمد کا اور امام احمد کا ایک روایت میں اور عبداللہ بن وہب اور اشہب کا قول یہ ہے کہ مقتدی امام کے پیچھے کچھ قرأت نہ کرے، سورۂ فاتحہ بھی کسی نماز میں نہ پڑھے اور یہی قول سعید بن المسیب اور تابعین کی ایک جماعت کا ہے اور فقہاء حجاز وشام کا مسلک یہ ہے کہ مقتدی جہری نمازوں میں (امام کے پیچھے) قرأت نہ کرے، اگرچہ اس کی قرأت کو سنتا بھی نہ ہو اور سری نمازوں میں قرأت کرے"۔

مولانا عبدالحی، شیخ التسلیم اور ملاجیون:

اس کے بعد مولانا عبدالحی لکھنوی اور شیخ التسلیم وغیرہ کے حوالہ سے جو کچھ لکھا گیا ہے، سب کے اقوال میں صرف سری نمازوں میں قرأت خلف الامام کا استحسان ہے، چناں چہ مولانا عبدالحی اور ملاجیون استاد عالمگیر کی عبارتوں میں

(۱) عمدة القاری، باب وجوب القراءة للإمام والمأموم، دار إحیاء التراث العربی بیروت. انیس

امام محمد کے قول کا حوالہ صراحۃً موجود ہے اور امام محمد کے قول میں سری نمازوں کی قید صراحۃً مذکور ہے اور اس میں کسی کو نزاع نہیں؛ بلکہ ہم تو جہری نمازں میں بھی امام کی قرأت سے پہلے یا پیچھے مقتدی کو قرأت فاتحہ کی اجازت دیتے ہیں، البتہ امام کے ساتھ ساتھ پڑھنے کو منع کرتے ہیں کہ اس صورت میں فرض انصات فوت ہوتا ہے، جس کی قرآن وحدیث میں تاکید ہے۔

امام رازی کا یہ قول کہ ''امام ابوحنیفہ نے اس امر میں ہماری موافقت کی ہے کہ امام کے پیچھے الحمد پڑھنے سے نماز باطل نہیں ہوتی'' اھ۔ صاحب تکمیل کے لیے مفید نہیں؛ کیوں کہ الحمد پڑھنے کی صورت میں نماز کے باطل نہ ہونے سے قرأت خلف الامام کا استحباب یا وجوب کچھ بھی ثابت نہیں ہوتا۔

اس کے بعد دفع دخل مقدر کے طور پر صاحب تکمیل نے ملا علی قاری اور امام ابن الہمام کے اقوال کو مولانا عبدالحی لکھنوی کی عبارت سے رد کیا ہے، اہل علم سمجھ سکتے ہیں کہ امام ابن الہمام اور ملا علی قاری کے سامنے مولانا عبدالحی کا کیا درجہ ہے؟ اس پر صاحب تکمیل کا خوش ہونا اور علماء حنفیہ کو الزام دینا بجز **الغریق تشبث بالحشیش** کے اور کیا ہے؟

صاحب تکمیل کی دریدہ دہنی:

اس کے بعد ان کا یہ کہنا کہ ''زیادہ افسوس تو ان علماء حنفیہ پر آتا ہے، جو احادیث صحاح ستہ پر متوجہ نہیں ہوتے، بلکہ حمیت مذہبی کی وجہ سے روایات موضوعہ ومکذوبہ وآثار مختلفہ وباطلہ کو اپنی تصنیفات وتحریرات وحواشی میں درج کرکے اپنے عوام وجہلاء کو فتنے میں ڈالتے ہیں'' اھ۔ یہ ہے وہ طرز کلام جو جماعت اہل حدیث کے اکثر افراد کا شیوہ ہے، یہی لوگ فروعی مسائل میں شدت کے ساتھ نزاع کرنے والے ہیں۔ کیا صاحب تکمیل کو نظر نہیں آیا کہ علماء حنفیہ قرأت خلف الامام سے منع کرنے کے لیے سب سے پہلے قرآن کریم کی آیت: ﴿**وإذا قرئ القرآن فاستمعوا له وأنصتوا**﴾ پیش کرتے ہیں اور ہم بتلا چکے ہیں کہ بالاجماع اور بالاتفاق یہ آیت قرأت خلف الامام کے بارے میں نازل ہوئی ہے، اس کے بعد حدیث صحیح ''**إنما جعل الإمام ليؤتم به فإذا كبر فكبروا وإذا قرأ فانصتوا**''.

(رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: امام اس لیے مقرر کیا گیا ہے کہ اس کا اتباع کیا جائے تو جب وہ تکبیر کہے تکبیر کہو اور جب قرأت کرے خاموش رہو۔) جس کو امام مسلم نے صحیح قرار دیا اور ابوداؤد نے سند صحیح سے روایت کیا ہے اور دلیل میں لاتے ہیں تو کیا مسلم اور ابوداؤد صحاح ستہ سے خارج ہیں؟ پھر وہ حدیث صحیح ''**من كان له إمام فقراءة الإمام له قراءة**'' سے استدلال کرتے ہیں۔ اس حدیث کو ابن ماجہ نے سنن میں، احمد بن منیع نے اپنی مسند میں، امام محمد نے اپنی موطا اور کتاب الآثار میں روایت کیا ہے، پھر موطا امام مالک اور ترمذی اور مصنف ابن ابی شیبہ ومصنف عبدالرزاق وغیرہ سے صحابہ وتابعین کے آثار بیان کرکے سلف وخلف کے تعامل سے اپنے مذہب کی تائید بیان کرتے ہیں تو کیا

صاحب تکمیل کے نزدیک موطا امام مالک اور ترمذی وغیرہ کی یہ حدیثیں موضوع ومکذوب اور باطل ہیں؟ کچھ تو خدا کا خوف اور شرم وحیا کا پاس کرکے بات کرنا چاہیے اور یہ ساری دلیری اور بے باکی اس برتہ پر ہے کہ خود صاحب تکمیل نے اپنے دلائل میں جزء القرأۃ بیہقی سے بہت سی احادیث وآثار ایسے نقل کئے ہیں، جن کی سند ضعیف اور واہی ہے، جیسا گزشتہ اوراق میں مفصل گزر چکا ہے۔

اس کے بعد مولانا عبدالحی لکھنوی کا یہ قول نقل کرکے کہ ''بعض فقہاء نے جو یہ کہا(۱) ہے کہ قرأت خلف الامام سے مقتدی کی نماز باطل ہوجاتی ہے، یہ قول شاذ ومردود ہے۔ امام محمد سے مروی ہے کہ انہوں نے مقتدی کے لیے سری نمازوں میں قرأت فاتحہ کو مستحسن سمجھا ہے'' الخ، عوام کو یہ دھوکہ دیا گیا ہے کہ مولانا عبدالحی اور امام محمد مقتدی کے ذمہ قرأت فاتحہ کو واجب سمجھتے ہیں، حالانکہ مولانا عبدالحی کی عبارت میں سری نمازوں کی تصریح موجود ہے اور جہری نمازوں میں سکتات امام کی بھی قید مذکور ہے؛ تاکہ استماع وانصات میں خلل واقع نہ ہو۔

اس کے بعد جن علماء احناف سے قرأت خلف الامام کا جواز نقل کیا گیا ہے، وہ سب سرّی نمازوں میں اور جہری نمازوں میں سکتات امام کے ساتھ مقید ہے، علماء حنفیہ میں امام کے ساتھ ساتھ فرض انصات کو ترک کرکے جواز قرأت کا کوئی بھی قائل نہیں۔

صاحب تکمیل کی دلائل حنفیہ پر تنقید:

اس کے بعد صاحب تکمیل نے مانعین قرأت فاتحہ خلف الامام کے دلائل سے بھی تعرض کیا ہے اور سب سے پہلے آیت قرآن ﴿وإذا قرئ القران فاستمعوا له وأنصتوا﴾ (۲) ''اور جب قرآن پڑھا جائے اس کو سنو اور خاموش رہو'' کو پیش کرکے اپنی طرف سے ایک جواب دیا ہے، مگر یہ کیا ضرور ہے کہ صاحب تکمیل کے جواب سے استدلال کرنے والے کی تشفی بھی ہوجائے۔ جواب تو ہر شخص ہر دلیل کا دے سکتا ہے، یہ کیا ضرور ہے کہ ہر جواب صحیح ہو؟ پھر ان لوگوں کو جو قرآن کریم کی اس آیت سے استدلال کررہے ہیں، دریدہ ذہنی کے ساتھ مذہب پرست استخوان فروش وغیرہ وغیرہ کلمات واہیہ سے یاد کرنا اور ان کے دلائل کو روایت موضوعہ ومکذوبہ پر مبنی کہنا کہاں کی تہذیب اور دیانت وانصاف ہے؟ ہم بتلا چکے ہیں کہ بالاتفاق یہ آیت قرأت خلف الامام سے منع کرنے کے متعلق نازل ہوئی ہے، امام احمد بن حنبل نے اس کی تصریح کی ہے اور تفسیر طبری وغیرہ سے بھی بہت آثار ہم نے گزشتہ اوراق میں بسند صحیح وحسن نقل کردیئے ہیں۔

(۱) تفوہ کا ترجمہ صاحب تکمیل نے سخت بکواس کیا ہے، یہ بے ادبی وگستاخی انہی کو مبارک ہو۔ لفظ تفوہ کے معنی تکلم اور نطق سے زیادہ نہیں۔ ظ

(۲) سورۃ الأعراف: ۲۰۴، انیس

جن سے یہ بات واضح ہے کہ لوگ پہلے قرأت کرتے تھے،اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔صاحب تکمیل کا یہ کہنا کہ ''برادران احناف فاتحہ خلف الامام پڑھنے کی احادیث کو آیت ہذا کا معارض سمجھ کر ان احادیث کو نہیں مانتے'' الخ۔ بالکل غلط ہے؛ بلکہ ہم ان احادیث کو امام یا منفرد پر محمول کرتے ہیں اور مقتدی کو امام کی قرأت کی وجہ سے قاری شمار کرتے ہیں،تارک قرأت نہیں مانتے؛ کیوں کہ مسلم اور ابوداؤد کی صحیح حدیث ''**إذا قرأ الإمام فانصتوا**'' صاف موجود ہے کہ ''جب امام قرأت کرے تم خاموش رہو'' اور ابن ماجہ وموطا محمد ومسند احمد بن منیع میں صحیح حدیث موجود ہے۔'' **من كان له إمام فقرأته له قراءة**'' ''جو شخص امام کے ساتھ ہو امام کی قرأت اس کے لیے قرأت ہے''۔حنفیہ حضرت عبادہ کی حدیث صحیح کو ہرگز نہیں چھوڑتے؛ بلکہ اس کو بھی مانتے ہیں اور قرآن کریم کی آیت اور حدیث صحیح ''**إذا قرأفانصتوا**'' اور ''**من كان له إمام فقرأته له قراءة**'' سب کو جمع کرکے یہ فرماتے ہیں کہ جہری نمازوں میں امام کی قرأت کے ساتھ قرأت کرنا منع ہے،اس سے پہلے یا پیچھے سکتہ امام میں اور سری نمازوں میں قرأت خلف الامام جائز یا مستحسن ہے،مگر صاحب تکمیل اور اس کی جماعت ہی تارک قرآن وحدیث ہے جو جہری نمازوں میں امام کے ساتھ ساتھ قرأت کو واجب کہتے اور حدیث صحیح ''**إذا قرأ فانصتوا**'' اور حکم خداوندی: ﴿**إذا قرئ القراٰن فاستمعوا له وأنصتوا**﴾(۱) کی صریح مخالفت کرتے ہیں۔

حنفیہ کی دلیل قرآنی پر تنقید:

حنفیہ کی اس دلیل کا ایک جواب تو آپ نے یہ دیا ہے کہ قرأت خلف الامام کی احادیث اس آیت کے معارض نہیں؛ بلکہ مخصص ہیں اور تخصیص الکتاب بالسنۃ جائز ہے،جبکہ حدیث متواتر ہو اور حدیث '' **لا صلاة لمن لم يقرأ بفاتحة الكتاب**'' یقیناً متواتر ہے،جیسا امام بخاری نے جزء القراءۃ میں فرمایا ہے:

''**وتواتر الخبر عن رسول الله صلّى الله عليه وسلّم لاصلاة إلابقرأة أم القراٰن**''.(۲)

''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ خبر متواتر ہے کہ نماز نہیں مگر سورۂ فاتحہ کی قرأت کے ساتھ''۔

سوال از آسمان جواب از ریسمان اسی کا نام ہے،گفتگو قرأت فاتحہ خلف الامام میں ہے اور تواتر قرأت فاتحہ کا بیان کیا جاتا ہے۔ہم بار بار کہہ چکے ہیں کہ قرأت سورۂ فاتحہ کے وجوب میں کسی کو نزاع نہیں،گفتگو اس میں سے کہ امام کے پیچھے مقتدی پر سورۂ فاتحہ پڑھنا واجب ہے یا نہیں؟ اور امام کی قرأت اس کے لئے کافی ہے،یا نہیں؟ ہم کہتے ہیں کہ قرأت فاتحہ نماز میں واجب ہے،مگر امام کی قرأت مقتدی کے لیے کافی ہے،وہ اس حالت میں تارک قرأت نہیں؛ بلکہ

---

(۱) سورة الأعراف: ۲۰٤،انیس

(۲) القراءة خلف الإمام للبخارى،باب وجوب القراءة للإمام والمأموم : ۷/۱،المكتبة السلفية.انيس

بمنزلہ قاری کے ہے اوران دونوں مقدمات کا ثبوت صحیح حدیث سے بار بار گزر چکا ہے۔پس اگر صاحب تکمیل کو ہمت ہے تو وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے قرأت فاتحہ خلف الامام کا تواتر ثابت کریں؟محض قرأت فاتحہ کا تواتر بیان کر کے عوام کو قرأت فاتحہ خلف الامام کا مغالطہ دینا محض دھوکہ ہے۔

پھر حنفیہ کے نزدیک مشہور ومتواتر وہ حدیث ہے،جس کو تابعین نے بالاتفاق قبول کیا ہو اور اس مسئلہ میں تابعین کا اختلاف ہے تو اس حدیث کو متواتر یا مشہور نہیں کہا جا سکتا۔علامہ عینی شرح بخاری میں فرماتے ہیں:

"فإن قلت:هٰذاالحديث مشهور فإن العلماء تلقته بالقبول فتجوز الزيادة بمثله؟قلت:لانسلم أنه مشهور لأن المشهور ما تلقاه التابعون بالقبول وقد اختلف التابعون فى هٰذه المسألة ولئن سلمنا أنه مشهور فالزيادة بالخبر المشهور إنما تجوز إذا كان محكمًا،أما إذا كان محتملاً فلا وهٰذا الحديث محتمل لأن مثله يستعمل لنفى الجواز ويستعمل لنفى الفضيلة كقوله صلّى اللّٰه عليه وسلّم لاصلاة لجار المسجد إلافى المسجد،والمراد نفى الفضيلة ... ولاصلاة بحضرة طعام"رواه مسلم،إلخ. (ج:٦/ص:١١)(١)

(ترجمہ)اگر تم کہو کہ یہ حدیث مشہور ہے،اس لیے کہ علماء نے اسے قبول کیا ہے اور اس سے زیادت کتاب اللہ پر جائز ہے تو میں کہوں گا:ہم اس کا مشہور ہونا تسلیم نہیں کرتے؛کیوں کہ مشہور وہ ہے،جس کو تابعین نے قبول کیا ہو اور اس مسئلہ میں تابعین کے درمیان اختلاف ہے اور اگر مان لیا جائے کہ یہ مشہور ہے تو حدیث مشہور سے کتاب اللہ پر زیادت اس وقت جائز ہے کہ وہ (اپنے مدلول ومفہوم میں)محکم ہو اور اگر محتمل ہو تو (اس سے زیادت کتاب اللہ پر جائز) نہیں۔اور یہ حدیث (لا صلاة إلا بقرء ة أم القرآن) محتمل ہے؛کیوں کہ اس قسم کا لفظ کبھی نفی جواز (وعدم صحت) کے لیے مستعمل ہوتا ہے اور کبھی نفی فضیلت کے لیے،جیسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ مسجد کے ہمسایہ کی نماز بغیر مسجد کے نہیں (اس کا مطلب بالاتفاق یہ ہے کہ بغیر مسجد میں ادا کئے اس کی نماز کامل نہ ہوگی یہ معنی نہیں کہ بالکل صحیح نہ ہوگی)،مراد اس سے نفی فضیلت ہے اور (نیز آپ کا ارشاد ہے) کہ کھانے کی موجودگی میں نماز نہیں،اس کو مسلم نے روایت کیا ہے" اھ۔

اس کا بھی بالاجماع یہی مطلب ہے کہ جب بھوکے کے سامنے کھانا آجائے اس وقت کھانا چھوڑ کر نماز پڑھے گا تو نماز کامل نہ ہوگی،یہ مراد ہرگز نہیں کہ نماز صحیح نہ ہوگی۔

پھر اس حدیث کو قرأت خلف الامام سے کوئی تعلق نہیں،اس میں صرف قرأت فاتحہ کا ذکر ہے اور اس کو ہم بھی واجب کہتے ہیں،مگر مقتدی پر واجب نہیں کہتے؛کیوں کہ آیت قرآن اور صحیح حدیثوں میں مقتدی کو خاموش رہنے کا صریح حکم ہے ،اس کی خلاف ورزی جائز نہیں۔اس تقریر سے صاحب تکمیل کی اس بات کا بھی جواب ہوگیا کہ!"یہ آیت مکی ہے اور

(١) باب وجوب القراء ة للإمام والمأموم،دار إحياء التراث العربى بيروت.انيس

قرأت فاتحہ کا حکم مقتدی کو نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام نے مدینہ طیبہ میں دیا ہے؛ پس کیا مقدم النزول آیت کسی مؤخر الافتراض کے لیے ناسخ ہوسکتی ہے''؟ ان سے کوئی پوچھے کہ مدینہ طیبہ میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے کونسی حدیث میں مقتدی کو قرأت فاتحہ کا حکم دیا ہے؟ اگر حضرت عبادہ کی حدیث ''**لا تفعلوا إلا بأم القرآن**'' مراد ہے تو ہم بتلا چکے ہیں کہ اس سے وجوب وہی ثابت کرسکتا ہے، جس کو اصول اور قواعد عربیہ سے واقفیت نہ ہو، ورنہ ہر سمجھدار فقیہ جانتا ہے کہ نہی کے بعد استثناء سے اباحت مستفاد ہوتی ہے، وجوب ثابت نہیں ہوتا، پھر اسی حدیث کے الفاظ ابوداؤد میں اس طرح پر ہیں:

﴿**إن كنتم لابدّ فاعلين فلا تفعلوا إلاّ بأمّ الكتاب**﴾. (۱)

''اگر تم امام کے پیچھے ضرور ہی قرأت کرنا چاہتے ہو تو سورۂ فاتحہ کے سوا نہ کیا کرو''۔

اس سے ہر عامی بھی اباحت ہی سمجھتا ہے، وجوب نہیں سمجھ سکتا۔

پھر تفسیر فتح البیان سے جو نقل کیا گیا ہے کہ ! ''صحیح بخاری و صحیح مسلم وغیرہ کی حدیثوں میں امام کے پیچھے سورۂ فاتحہ پڑھنے کا حکم موجود ہے'' الخ۔ (۲)

بڑی جرأت ہے، بخاری و مسلم کی کسی حدیث میں قرأت خلف الامام کا حکم نہیں ہے۔ صاحب تکمیل البرہان کو خدا کا خوف کرکے بات کرنا چاہیے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی ایک حدیث میں بھی ہرگز یہ نہیں فرمایا کہ مقتدیوں کو امام کے پیچھے قرأت کرنا چاہیے؛ بلکہ صحیح مسلم کی ایک حدیث میں یہ حکم دیا ہے:

''**إذا قرأ (الإمام) فانصتوا**''. (۳)

''جب امام قرأت کرے تو تم خاموش رہو''۔

اور اس حدیث کو امام احمد اور مسلم اور مفسر طبری اور علامہ ابن تیمیہؒ وغیرہم نے صحیح فرمایا ہے اور حدیث عبادہ میں: ''**لا تفعلوا إلا بأمّ القرآن**'' کی زیادت کو امام احمد اور یحییٰ بن معین اور ایک جماعت محدثین نے ضعیف قرار دیا ہے، جیسا کتاب المغنی اور علامہ ابن تیمیہ کے رسالہ تنوع العبادات کے حوالہ سے اوپر گزر چکا ہے اور حدیث عبادہ کا جو حصہ صحیح ہے، اس کو قرأت خلف الامام سے کچھ واسطہ نہیں، وہ منفرد اور امام کے متعلق ہے، جیسا خود راوی حدیث سفیان بن عیینہ نے فرمادیا ہے:

''**قال: هذا إذا كان وحده**'' (۴) ''یہ اس شخص کے بارے میں ہے، جو اکیلا نماز پڑھتا ہو''۔

---

(۱) مصنف ابن ابی شیبہ میں الفاظ اس طرح ہے: ''إن كنتم لا بد فاعلين فليقرأ أحدكم فاتحة الكتاب في نفسه''. (باب من رخص في القراءة خلف الإمام (ح: ۳۷۵۷) انیس)

(۲) تفسیر فتح البیان: ۱۲۱/۵، المكتبة العصرية صيدا بيروت. انیس

(۳) صحيح لمسلم، باب التشهد في الصلاة (ح: ۴۰۴) انیس

(۴) سنن الترمذی، باب ماجاء في ترك القراءة خلف الإمام: ۴۱۲/۱، دار الغرب الإسلامي بيروت. انیس

اس کے بعد صاحب تکمیل نے آیت ﴿وإذا قرئ القراٰن فاستمعوا له وأنصتوا﴾ (۱) اور آیت ''فاقرؤا ما تیسّر من القراٰن'' (۲) میں تعارض ثابت کر کے دونوں کو ساقط کرنا چاہا ہے اور نور الانوار و توضیح و تلویح کا حوالہ بھی دے دیا ہے، حالانکہ تعارض کے لیے اتحاد محل شرط ہے، جو یہاں مفقود ہے؛ کیوں کہ آیت: ﴿وإذا قرئ القراٰن فاستمعوا له وأنصتوا﴾ بالاتفاق قرأت خلف الامام کے متعلق ہے اور ''فاقرؤ ا ما تیسّر من القراٰن'' صلوٰۃ منفرد کے متعلق ہے؛ کیوں کہ یہ آیت قیام اللیل کے بارے میں نازل ہوئی ہے اور قیام اللیل جماعت سے نہیں ہوتا، منفرداً ہوتا ہے۔ طلبا کو تعارض کا مطلب سمجھانے کے لیے مثال کے طور پر نور الانوار وغیرہ میں ان آیتوں کو پیش کر دیا گیا کہ شان نزول کو نہ دیکھا جائے تو ظاہر میں تعارض معلوم ہوگا، ورنہ حقیقۃً تعارض ثابت کرنا مقصود نہیں، جیسا فقہا کے طرز عمل سے واضح ہے کہ وہ برابر دونوں آیتوں سے استدلال کرتے چلے آرہے ہیں۔ (ملاحظہ ہو! عینی شرح البخاری: ۱۱/۱)

پھر حنفیہ پر صاحب تکمیل نے یہ الزام قائم کیا ہے کہ ''اس آیت: ﴿وإذا قرئ القراٰن فاستمعوا له وأنصتوا﴾ سے حنفیہ نے خطبہ جمعہ کے وقت خاموش رہنے کو واجب کہا ہے؛ لیکن یہ بھی کہتے ہیں کہ جب خطیب آیت: ﴿یٰأیُّها الذین اٰمنوا صلّوا علیه وسلّموا تسلیماً﴾ پڑھے تو سننے والا آہستہ درود پڑھ لے تو فاتحہ خلف الامام کے آہستہ پڑھنے سے کیوں روکتے ہیں''؟

جواب یہ ہے کہ ہم بار بار کہہ چکے ہیں کہ آیت کا نزول بالاتفاق قرأت خلف الامام کے بارے میں ہے، خطبہ جمعہ کو نماز کے ساتھ بعد میں ملحق کر لیا گیا ہے، ورنہ مکہ میں جمعہ کی نماز اور خطبہ کہاں تھا؟ پس جس قدر استماع وانصات کی تاکید نماز میں ہے، خطبہ میں نہیں ہے؛ اس لیے بعض فقہا نے یہ سمجھ کر درود پڑھنے کی اجازت دے دی کہ خطبہ میں امام سے کسی ضرورت کے وقت بات کرنا یا دعا کی درخواست کرنا جائز ہے اور امام کو بھی مقتدیوں سے بات کرنا اور کوئی ضروری بات پوچھنا یا امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کرنا جائز ہے اور اس وقت مقتدی امام کی بات کا جواب بھی دے سکتا ہے، جیسا واقعہ سلیک غطفانی سے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے خطبہ کے وقت ان سے بات کی اور ایک دفعہ خطبہ میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے بارش کی دعا کو کہا گیا تھا اور حضرت عمر کے واقعہ سے کہ خطبہ میں حضرت عثمان کو دیر سے آنے پر تنبیہ کی تھی اور انہوں نے جواب میں اپنا عذر بیان کیا تھا، (بخاری) (۳) ظاہر ہے کہ اس کو خطبہ کے منافی نہیں سمجھا گیا۔ اسی طرح جب خطیب خطبہ کے اندر حکم کر رہا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر درود بھیجو تو اس حکم کی تعمیل بھی

(۱) سورة الأعراف: ٢٠٤، انیس

(۲) سورة المزمل: ٢٠. انیس

(۳) صحیح البخاری، باب إذا رأى الإمام رجلاً جاء وهو يخطب (ح: ٩٣٠)/باب فضل الغسل يوم الجمعة، الخ (ح: ٨٧٨) انیس

خطبہ کے منافی نہیں، آہستہ درود پڑھ سکتے ہیں، بلند آواز سے نہیں اور بعض فقہاء حنفیہ نے اس صورت میں بھی زبان سے درود پڑھنے کی اجازت نہیں دی ہے، صرف دل سے پڑھنے کی اجازت دی ہے۔ فلا اشکال

ایک الزام یہ دیا ہے کہ ''نماز فجر شروع ہونے کی حالت میں امام کی قرأت کے وقت صف کے پیچھے سنتیں پڑھنا حنفیہ کے نزدیک جائز ہے اور آیت: ﴿إذا قرئ القرآن﴾ سے اس کو ممنوع قرار نہیں دیتے تو اس آیت سے امام کے پیچھے سورۂ فاتحہ پڑھنا کیوں ممنوع ہے؟

جواب یہ ہے کہ عبداللہ بن عباس اور عبداللہ بن مغفل کی روایت اوپر گزر چکی ہے، جس میں تصریح ہے کہ یہ آیت صرف مقتدی کے حق میں ہے کہ وہ قرأت خلف الامام نہ کرے؛ بلکہ خاموش رہے، اس کے سوا دوسرے موقع پر قرآن پڑھا جائے تو سننا اور خاموش رہنا فرض نہیں۔ بعض فقہاء حنفیہ نے اسی قول کو اختیار کیا ہے، ان کے نزدیک نماز فجر کے وقت مسجد میں ایک طرف سنت فجر پڑھنا جائز ہے؛ کیوں کہ یہ شخص مقتدی نہیں ہے اور بعض فقہاء نے عموم لفظ کی بنا پر ایسی جگہ سنت فجر پڑھنے کو منع کیا ہے، جہاں امام کی قرأت سننے میں آتی ہو، وہ فرماتے ہیں کہ مسجد کے دروازہ پر یا مسجد سے باہر سنتیں پڑھ کر جماعت میں شریک ہونا چاہیے۔

رہا مقتدی کا ''سبحانک اللّٰھُمَّ'' پڑھنا، سو اس میں حنفیہ کا صحیح قول یہ ہے کہ جہری نماز میں امام کی قرأت کے وقت مقتدی کو ''سبحانک اللّٰھُمَّ'' پڑھنا جائز نہیں؛ بلکہ تکبیر تحریمہ کہہ کر خاموش رہے اور موقع ملے تو سکتات امام میں ''سبحانک اللّٰھم'' پڑھ لے اور سکتات امام میں سورۂ فاتحہ بھی پڑھ سکتا ہے، جیسا بار بار گزر چکا ہے۔

رہا یہ کہ جب امام جہر کر رہا ہو اس وقت اللہ اکبر کہہ کر نماز شروع بھی نہ کرنا چاہیے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ تکبیر تحریمہ شرط صلوٰۃ ہے، رکن صلوٰۃ نہیں تو تکبیر تحریمہ کے وقت یہ شخص مقتدی نہیں تکبیر کے بعد مقتدی بنے گا اور اسی وقت قرآن کا سننا اور خاموش رہنا واجب ہوگا، اس سے پہلے نہیں۔ دوسرے اس پر سب کا اجماع بھی ہے کہ امام کی قرأت سنتے ہوئے تکبیر تحریمہ کہہ کر نماز میں شریک ہونا درست ہے، پس صاحب تکمیل کو اپنی فہم و دانش کا ماتم کرنا چاہیے۔

اور امام بخاری کی جزء القراءۃ سے جو الزام نقل کیا گیا ہے کہ مدارس و مکاتب میں استاد ایک بچہ کو سبق دیتا ہے اور باقی بچے بھی قرأت کرتے ہیں، وہاں آیت: ﴿وإذا قرئ القرآن فاستمعوا له وأنصتوا﴾ کی بنا پر بچوں کو خاموش نہیں کیا جاتا، الخ۔

اس کا ایک جواب تو وہی ہے، جو اوپر گزر چکا ہے کہ آیت مقتدی کے حق میں ہے، غیر مقتدی کے حق میں نہیں ہے، دوسرے بچوں کو بڑوں پر قیاس کرنا ہی غلط ہے، بچے تو بے وضو بھی قرآن پڑھتے ہیں، ان کو مرفوع القلم قرار دیا گیا ہے۔

اس کے بعد دعویٰ کیا گیا ہے کہ انصات کے معنی مطلقاً چپ رہنے کے نہیں؛ بلکہ سکوت مع الاستماع کے ہیں تو اس

سے بھی حنفیہ کا مطلب حاصل نہیں ہوسکتا؛ کیوں کہ اس سے نماز جہری میں صرف امام کی قرأت کے وقت ممانعت ہوگی، سکتات امام میں قرأت کرنے کی ممانعت آیت ہذا سے ہرگز ثابت نہیں ہوتی؛ حالانکہ حنفیہ کا دعویٰ ہے کہ جہری نماز میں سکتات امام کے وقت بھی قرأت ناجائز وحرام ہے، الخ۔

یہ حنفیہ پر افترا ہے، جو لوگ سکتات امام کی رعایت کرکے سورۂ فاتحہ خلف الامام پڑھ سکیں، اس کو کسی نے ناجائز وحرام نہیں کہا، اسی طرح سری نمازوں میں بھی قرأت فاتحہ خلف الامام آہستہ آہستہ جائز ہے، جب کہ امام سے منازعت اور تشویش نہ ہو، جیسا بار بار ذکر ہو چکا ہے۔

اس کے بعد دعویٰ کیا گیا ہے کہ جب امام جہر سے قرأت کرے اور مقتدی آہستہ آہستہ انہی الفاظ کو پڑھتے جائیں تو اس میں بہت اچھی طرح استماع وانصات بھی پایا جاتا ہے، الخ۔

یہ محض دعویٰ ہے، جو قابل قبول نہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نزول وحی کے وقت اپنے لبوں کو حرکت دے کر ساتھ ساتھ پڑھتے تھے، جہر نہ کرتے تھے۔ حق تعالیٰ نے اس سے بھی منع فرمایا اور ارشاد ہوا:

﴿لَا تُحَرِّكْ بِهِ لِسَانَكَ لِتَعْجَلَ بِهِ إِنَّ عَلَيْنَا جَمْعَهُ وَقُرْآنَهُ فَإِذَا قَرَأْنَاهُ فَاتَّبِعْ قُرْآنَهُ﴾.

''قرآن کے ساتھ اپنی زبان کو حرکت نہ دیا کیجئے؛ تاکہ جلدی یاد ہوجائے، ہمارے ذمہ ہے اس کو (آپ کے دل میں) جما دینا اور پڑھوا دینا تو جب ہم (بواسطہ جبریل کے) اس کو پڑھیں تو اس کی قرأت کا اتباع کیجئے''۔

اس کی تفسیر میں عبداللہ بن عباس فرماتے ہیں: **فاستمع له وانصت** کہ ''جب وحی نازل ہو تو اس کو سنتے رہئے اور خاموش رہئے''۔(۱)

اس کے بعد آپ زبان کو حرکت نہ دیتے اور خاموش رہتے، ملاحظہ ہو! بخاری شریف: ۳/۱، معلوم ہوا کہ قرأت قرآن کے وقت زبان کو حرکت دینا اتباع نہیں ہے اور مقتدی کو امام کے اتباع کا امر کیا گیا ہے: ''**إنّما جعل الإمام ليؤتمّ به**'' کہ امام بنایا؛ اسی لیے گیا ہے کہ اس کا اتباع کیا جائے اور حدیث ابن عباس سے معلوم ہو گیا کہ اتباع قرأت یہ ہے کہ بالکل خاموش رہے، زبان کو حرکت نہ دے اور لغت میں بھی انصات کے معنی سکوت ہی کے ہیں، البتہ اگر ''**انصت له**'' بولا جائے تو اس کے دو معنی ہیں: ایک خاموش رہنا، دوسرے کان لگا کر سننا اور جب انصات مطلق ہو، اس کے معنی سکوت ہی کے ہیں، (ملاحظہ ہو! قاموس: ۹۸/۱) (۲) پس امام کے ساتھ ساتھ قرأت کرنا اتباع امام کے بھی خلاف ہے اور انصات کے بھی خلاف ہے۔

---

(۱) صحيح البخاری، باب كيف كان بدء الوحی إلى رسول الله صلى الله عليه وسلم (ح: ٥)/سنن النسائی، جامع ماجاء فی القرآن (ح: ٩٣٥) انیس

(۲) القاموس المحيط: ١٦١، فصل النون، مؤسسة الرسالة بيروت. انیس

اس کے بعد یہ الزام دیا گیا ہے کہ نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام سے نماز میں کئی سکتے ثابت ہیں، اگر مقتدی سکتات مذکورہ میں سورۂ فاتحہ پڑھ لے تو آیت: ﴿وإذا قرئ القرآن﴾ کا مخالف نہ ہوگا۔

جواب ظاہر ہے کہ اس صورت کو ناجائز کس نے کہا؟ اور یہ بھی ظاہر ہے کہ یہ سکتات امام پر واجب نہیں؛ کیوں کہ وجوب کی کوئی دلیل نہیں، اگر امام سکتہ نہ کرے تو مقتدی قرأت فاتحہ نہیں کر سکے گا، نہ وہ گنہگار ہوگا، نہ اس کی نماز باطل ہوگی۔

اس کے بعد دعویٰ کیا گیا ہے کہ یہ آیت امام کے پیچھے چلا کر پڑھنے کی ممانعت میں نازل ہوئی ہے اور امام رازی سے نقل کیا گیا ہے کہ یہی قول امام ابوحنیفہ اور ان کے اصحاب کا ہے۔

جواب یہ ہے کہ جیسے اس عبارت میں امام صاحب اور ان کے اصحاب کی طرف بلا سند ایک غلط قول کی نسبت کی گئی ہے، ایسے ہی یہ دعویٰ بھی غلط ہے کہ یہ آیت امام کے پیچھے چلا کر پڑھنے کی ممانعت میں نازل ہوئی ہے، بھلا صحابہ کے متعلق کون یہ گمان کر سکتا ہے کہ وہ نماز میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پیچھے چلا کر شور کریں گے، کیا ان کو نماز کی حقیقت اور اس میں خشوع وخضوع کی ضرورت کی بھی خبر نہ تھی۔

اہل حدیث جو اس قسم کی لغو باتیں کر کے صحیح حدیثوں کو رد کرتے رہیں اور آیت قرآنی میں غلط تاویلیں کرتے رہیں تو وہ عامل بالحدیث ہوں اور حنفیہ نصوص کے صحیح معنی بیان کریں اور صحیح طریقہ پر عمل کریں، وہ مذہب پرست اور استخواں فروش قرار پائیں، سبحان اللہ کیا انصاف ہے؟ ان حضرات سے کوئی پوچھے کہ اگر یہ آیت امام کے پیچھے چلا کر پڑھنے کی ممانعت میں نازل ہوئی ہے اور آہستہ قرأت جائز ہے تو خطبہ جمعہ میں بھی چلا کر بولنا ہی منع ہوگا، کسی قدر آواز سے بولنا باتیں کرنا، تسبیح وتکبیر وتہلیل کرنا ممنوع نہ ہونا چاہیے؛ کیوں کہ تمام علما نے اسی آیت سے خطبہ میں کلام کو منع کیا ہے اور خود صاحب تکمیل نے بھی اس آیت کا شان نزول خطبہ کو قرار دیا ہے تو کیا وہ اس کے قائل ہوں گے کہ خطبہ جمعہ میں امام کا خطبہ سنتے ہوئے لوگوں کو بغیر چلائے باتیں کرنا یا ذکر اللہ اور تکبیر وتسبیح وتہلیل کرنا جائز ہے، اگر جواب اثبات میں ہے تو خلاف اجماع ہے، اہل حدیث بھی اس کے قائل نہیں اور اگر نفی میں ہے تو کیا خطبہ کا درجہ نماز سے بھی زیادہ ہے؟ کہ نماز میں تو آہستہ آہستہ پڑھنا جائز اور خطبہ میں حرام ہے۔

اس کے بعد دعویٰ کیا گیا ہے کہ عدم فرضیت فاتحہ پر حنفیہ کا آیت ہٰذا سے استدلال کرنا تمام محدثین ومفسرین کے خلاف ہے، یہ وہی مغالطہ ہے، جو شروع سے آخر تک صاحب تکمیل کا شیوہ ہے، حنفیہ نے اس آیت سے عدم فرضیت فاتحہ پر کب استدلال کیا ہے؟ اس سے تو وہ قرأت خلف الامام کی عدم فرضیت پر استدلال کرتے ہیں اور اس میں جمہور سلف وخلف ان کے ساتھ ہیں؛ جیسا کہ علامہ ابن تیمیہ کے قول سے معلوم ہو چکا ہے عدم فرضیت فاتحہ پر تو وہ آیت: ﴿فاقرؤا ما تیسّر من القرآن﴾ سے استدلال کرتے ہیں اور حدیث اعرابی سے ان کے استدلال کی تائید ہوتی ہے، جیسا پہلے مفصل گزر چکا ہے۔

اس کے بعد دعویٰ کیا گیا ہے کہ یہ آیت نماز میں باتیں کرنے کی ممانعت میں نازل ہوئی ہے اور بعض تابعین کا قول نقل کیا گیا ہے کہ یہ آیت خطبہ کے بارے میں نازل ہوئی ہے، خطبہ کے وقت لوگوں کو استماع کا حکم دیا گیا ہے، الخ۔

اس کا جواب گزر چکا ہے کہ مکہ میں نہ جمعہ قائم ہوا تھا، نہ خطبہ تھا، اس لیے جن حضرات نے اس آیت کو خطبہ کے متعلق کہا ہے، ان کا مطلب یہ ہے کہ خطبہ کو بھی نماز کے ساتھ ملحق کیا گیا ہے، یہ مطلب نہیں کہ شان نزول فقط خطبہ جمعہ ہے، کیوں کہ یہ آیت بالاتفاق مکی ہے اور مکہ میں نہ جمعہ تھا، نہ خطبہ اور خطبہ میں آہستہ بات کرنا یا آہستہ ذکر و تسبیح پڑھنا بالاتفاق جائز نہیں تو نماز میں امام کے ساتھ آہستہ قرأت کس طرح جائز ہوگی؟ نماز میں باتیں کرنا ہجرت کے بعد بھی جائز تھا، جب سورۂ بقرہ کی آیت: ﴿وقوموا للّٰه قانتين﴾ نازل ہوئی تو باتیں کرنے سے منع کیا گیا۔ (صحیح مسلم)(۱) اور آیت: ﴿وإذا قرئ القرآن فاستمعوا له وأنصتوا﴾ (۲) بالاتفاق مکی ہے، اس کو نماز میں باتیں کرنے کی ممانت پر محمول کرنا صحیح نہیں؛ ورنہ لازم آئے گا کہ صحابہ ممانعت کے بعد بھی عام طور سے نماز میں باتیں کرتے تھے اور یہ ان کی شان سے بعید ہے اور قرأت خلف الامام مدینہ میں عام طور پر صحابہ نہ کرتے تھے، کسی ایک یا دو ناواقف نے ایسا کیا ہے، جیسا حدیث پڑھنے والوں پر مخفی نہیں ہے کہ جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے پوچھا: تم میں سے کس نے قرأت کی تو صرف ایک آدمی کہتا تھا: میں نے قرأت کی ہے، اس کو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے منع کر دیا۔

پھر امام رازی کا قول نقل کیا گیا ہے کہ اس آیت میں کفار کو خطاب ہے اور اگر آیت کو قرأت خلف الامام پر محمول کیا جائے تو قرآن کا سیاق وسباق ہی بگڑ جائے گا اور ترتیب مختل ہو جائے گی، الخ۔

میں کہتا ہوں کہ امام احمد بن حنبل کا قول گزر چکا ہے کہ بالاتفاق یہ آیت نماز کے متعلق (قرأت خلف الامام سے منع کرنے میں) نازل ہوئی ہے تو کیا احمد بن حنبل اور دوسرے علماءِ سلف سے بھی زیادہ کوئی قرآن کے سیاق وسباق کا سمجھنے والا ہو سکتا ہے؟ پھر اس آیت سے پہلے حق تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے: ﴿هذا بصائر من ربكم وهدى ورحمة لقوم يؤمنون﴾ (۳) ''یہ قرآن (بجائے خود) گویا بہت سی دلیلیں ہیں تمہارے رب کی طرف سے اور ہدایت ورحمت ہے ان لوگوں کے لیے جو اس پر ایمان رکھتے ہیں''۔ جس میں اہل ایمان کا اور قرآن کا ذکر ہے، اس کے بعد ﴿وإذا قرئ القرآن فاستمعوا له وأنصتوا لعلّكم ترحمون﴾ ہے۔ اس کے بعد ﴿واذكر ربّك في نفسك تضرعًا وخيفة ودون الجهر من القول بالغدوّ والآصال ولا تكن من الغافلين﴾ (۴) ہے، جس میں ہر

(۱) تحريم الكلام في الصلاة (ح:۵۳۹) انيس
(۲) سورة الأعراف: ۲۰۴، انيس
(۳) سورة الأعراف: ۲۰۳، انيس
(۴) سورة الأعراف: ۲۰۵، انيس

مسلمان کو ذکر کی تاکید اور غفلت سے ممانعت ہے، غرض آیت ﴿وإذا قرئ القراٰن﴾ سے پہلے بھی اہل ایمان کا ذکر ہے اور بعد میں بھی اہل ایمان کو خطاب ہے تو درمیان میں قرأت قرآن کے متعلق مسلمانوں کو خطاب کرنے سے قرآن کا سیاق وسباق کیسے مختل ہوگیا؟ اس آیت سے پہلے قرآن کی عظمت کا بیان ہے کہ وہ اہل ایمان کے لیے بصائر وہدایت ورحمت ہے، اس کے بعد یہ امر یقیناً اس کی عظمت کے مناسب ہے کہ جب قرآن (نماز میں) پڑھا جائے اس کو سنو اور خاموش رہو؛ تاکہ اچھی طرح بصیرت وہدایت ورحمت سے حصہ حاصل کرسکو، اس کے بعد حکم ہے کہ اپنے رب کو اپنے دل میں عاجزی اور خوف کے ساتھ یاد کیا کرو، صبح اور شام اور غافلوں میں شمار نہ ہونا۔

بتلایئے کون عقلمند کہہ سکتا ہے کہ اس صورت میں نظم قرآن مختل ہوگیا؛ بلکہ انصاف سے دیکھا جائے تو جہاں قرآن نے کفار کے شور وغل اور چلانے کا ذکر کیا ہے، وہاں رحمت کا ذکر نہیں کیا، وہاں ان کو سخت عذاب کی دھمکی دی ہے۔

﴿وقال الذين كفروا لا تسمعوا لِهٰذا القراٰن والغو فيه لعلّكم تغلبون فلنذيقنّ الّذين كفروا عذاباً شديداً ولنجزينّهم أسوأ الذى كانوا يعلمون﴾.(۱)

یعنی کافر لوگ کہتے ہیں کہ اس قرآن کو نہ سنو اور شور وغل مچاؤ، شاید اس طرح تم غالب آجاؤ، ہم ان کو سخت عذاب (کا مزہ) چکھائیں گے اور ان کی اس بری حرکت کی جو وہ کرتے ہیں، سزا دیں گے۔

پس آیت: **﴿وإذا قرئ القراٰن فاستمعوا له وأنصتوا لعلّكم ترحمون﴾** کا عنوان ہی بتلا رہا ہے کہ اس میں مسلمانوں کو خطاب ہے، وہی قرآن کو سننے اور خاموش رہنے پر رحمت کے امیدوار ہوسکتے ہیں، کفار تنہا اس پر رحمت کے امیدوار کیوں کر ہوسکتے ہیں، جب تک ایمان نہ لے آئیں؟ پس تفسیر فتح البیان کا یہ قول ہرگز صحیح نہیں کہ اس آیت میں صرف کفار کو خطاب ہے اور مسلمانوں کو خطاب ماننے سے قرآن کی آیات میں ارتباط نہ رہے گا؛(۲) بلکہ سیاق وسباق اور آیت کے عنوان سے صاف معلوم ہو رہا ہے کہ اس میں مسلمانوں ہی کو خطاب ہے، تمام علماء مفسرین نے اس کو قرأت خلف الامام سے ممانعت پر محمول کیا ہے، جیسا علامہ طبری کے حوالہ سے ہم نے تفصیل کے ساتھ شروع ہی میں لکھ دیا ہے، غالباً ناظرین نے اندازہ کرلیا ہوگا کہ صاحب تکمیل البرہان کس قدر ہٹ دھرمی اور عصبیت مذہبی سے حنفیہ کے دلائل پر تنقید کرتے ہیں کہ قرآن کریم کی جس آیت سے جمہور سلف وخلف نے قرأت خلف الامام کی ممانعت پر استدلال کیا تھا، اس کو تفسیر فتح البیان اور رازی کے قول سے رد کرنا چاہتے ہیں، "**الغريق يتشبث بالحشيش**" اسی کو کہتے ہیں ڈوبتے کو تنکے کا سہارا بھی بہت نظر آتا ہے۔

(۱) سورة فصلت: ٢٦، انيس

(۲) فتح البيان فى مقاصد القرآن: ١١٤/٥، المكتبة العصرية للطباعة والنشر صيدا بيروت/ مفاتيح الغيب، تفسير سورة الأعراف: ٤٤٠/١٥، دار إحياء التراث العربى بيروت. انيس

دلائل حدیثیہ پر تنقید:

اس کے بعد آپ نے حنفیہ کے دلائل حدیثیہ پر تنقید شروع کی ہے۔

پہلی دلیل یہ بیان فرمائی ہے کہ صحیح بخاری میں جو روایت ابوبکرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ انہوں نے حالت رکوع میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو پایا تو صف میں ملنے سے پہلے رکوع کرلیا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے ذکر کرنے پر آپ نے اس رکعت کو لوٹانے کا حکم نہیں فرمایا، اس سے حنفیہ قرأت فاتحہ خلف الامام کے فرض نہ ہونے پر دلیل لاتے ہیں کہ جب رکوع میں ملنے سے (بغیر فاتحہ کے) رکعت ہوگئی تو حالت قیام میں بھی سورۂ فاتحہ کے بغیر ہو جائے گی، الخ۔

اس کے متعلق عرض ہے کہ یہ صرف حنفیہ کی دلیل نہیں؛ بلکہ مالکیہ وحنابلہ نے بھی مسبوق کے اس مسئلہ سے مقتدی پر قرأت خلف الامام کے واجب نہ ہونے کے لیے استدلال کیا ہے، جیسا کتاب المغنی کے حوالہ سے گزر چکا ہے اور صرف حدیث ابی بکرہ ہی سے استدلال نہیں کیا گیا؛ بلکہ اجماع سے استدلال کیا گیا ہے، امام طحاوی نے تصریح کی ہے کہ اس میں فقہا کا اختلاف نہیں کہ مسبوق رکوع پالینے سے رکعت پالیتا ہے اور مغنی ابن قدامہ میں ہے:

"ولأنها قرأة لاتجب على المسبوق فلا تجب علىٰ غيره كقراء ةالسورة".(۱)

"پھر قرأت فاتحہ خلف الامام مسبوق پر واجب نہیں تو غیر مسبوق پر بھی واجب نہ ہوگی جیسے (ضم) سورت" اھ۔

اس دلیل کا جواب یہ دیا گیا ہے کہ قرأت کا وجوب حالت قیام میں ہے، جب حالت بدل گئی، حکم بھی بدل گیا۔

میں کہتا ہوں کہ اہل حدیث کی زبان وقلم سے ایسی باتیں نکلنا، جائے تعجب ہے؛ کیوں کہ یہ تو سراسر قیاس ہے، جس کے متعلق یہ لوگ بڑے زور سے "أول من قاس إبليس" (۲) کا نعرہ لگایا کرتے ہیں، ان کو کسی حدیث سے اس کا ثبوت دینا چاہیے کہ قرأت کا وجوب حالت قیام کے ساتھ مخصوص ہے۔ حضرت عبادہ کی حدیث: "لا صلاة لمن لم يقرأ بفاتحة الكتاب" میں تو قیام کی شرط مذکور نہیں، اگر اور کسی حدیث میں یہ قید مذکور ہے تو معلوم ہوا کہ آپ ایک حدیث سے دوسری حدیث کو مقید کرسکتے ہیں، پھر حنفیہ نے کیا جرم کیا، جو وہ دوسری حدیث: "من كان له إمام فقرأته له قراء ة" سے حدیث عبادہ کو منفرد اور امام کے ساتھ خاص کرتے ہیں؟ پھر یہ بھی خوب رہی کہ جب حالت بدل گئی حکم بھی بدل گیا۔ اول اس کو تو ثابت کیجئے کہ رکوع کرنے سے حالت کیا بدل گئی؟ کیا نماز ختم ہوگئی یا نمازی بدل گیا؟ آخر یہ مسئلہ کس حدیث

(۱) المغني، فصل ويكره أن يتطوع الإمام في موضع الصلاة المكتوبة، مسألة، قال: والمأموم إذا سمع قراء ة الإمام فلا يقرأ بالحمد: ۱۶۲/۲، دار عالم الكتب الرياض، انيس

(۲) کہ سب سے پہلے ابلیس نے قیاس کیا تھا، آگے یہ ان کی بلا جانے کہ قیاس ابلیس کس قسم کا تھا اور قیاس مجتہد کسے کہتے ہیں۔ ظ

سے آپ نے معلوم کیا کہ رکوع کرنے سے نماز یا نمازی کی حالت بدل جاتی ہے؟ حدیث ابوبکرہ اور ان جملہ احادیث سے جو رکوع پالینے سے رکعت پانے پر دلالت کرتی ہیں تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ شارع علیہ السلام کی نظر میں رکوع قیام کے حکم میں ہے، جبھی تو رکوع پالینے سے رکعت مل جاتی ہے، البتہ سجدہ قیام کے حکم میں نہیں ہے کہ سجدہ پانے سے رکعت نہیں ملتی اور جب رکوع بحکم قیام ہے تو رکوع سے حالت نہیں بدلی، پس رکوع پانے والے پر رکوع میں قرأت فاتحہ فرض ہونی چاہئے، چنانچہ بعض صحابہ اس طرف گئے بھی ہیں۔ ملاحظہ ہو! جزء القراءۃ بیہقی:۶۸:

''عن حسان بن عطية عن أبي الدرداء قال: لا تترك الفاتحة خلف الإمام ، زاد ابن أبي الحواری: ولو أن تقرأ وأنت راكع ، وفي رواية أخرىٰ عن أبي الدرداء قال: لو أدركت الإمام وهو راكع لأحببت إن اقرأ بفاتحة الكتاب''. (۱)

''حسان بن عطیہ حضرت ابوالدرداء سے روایت کرتے ہیں انہوں نے فرمایا کہ امام کے پیچھے سورہ فاتحہ نہ چھوڑو، چاہے رکوع میں ہی پڑھ لو۔ دوسری روایت میں ہے کہ ابوالدرداء رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ اگر میں امام کو رکوع میں پاؤں تو اس کو پسند کروں گا کہ سورہ فاتحہ (رکوع ہی میں) پڑھ لوں''۔

اس اثر سے صاحب تکمیل کی ساری نبی بنائی عمارت منہدم ہوگئی، معلوم ہوگیا کہ رکوع سے حالت کچھ نہیں بدلی؛ بلکہ رکوع میں بھی قیام کی طرح قرأت فاتحہ ہوسکتی ہے اور اس اثر کو ضعیف نہیں کہہ سکتے؛ کیوں کہ امام بیہقی نے بطور حجت کے اس کو پیش کیا ہے۔ پس صاحب تکمیل کا یہ نتیجہ نکالنا کہ ''جیسے شریعت کا یہ حکم ہے کہ کوئی رکعت بغیر فاتحہ کے نہیں ہوتی، ویسے ہی شریعت کا یہ بھی حکم ہے کہ رکوع میں ملنے سے (رکعت) ہوجاتی ہے''۔ حنفیہ وحنابلہ کے استدلال کے وزنی ہونے کا اقرار ہے، جب رکوع میں ملنے سے رکعت مل جاتی ہے اور رکوع میں سورۂ فاتحہ پڑھنا فرض نہیں، حالانکہ رکوع بحکم قیام ہے تو معلوم ہوا کہ حالت قیام میں بھی مقتدی پر فاتحہ پڑھنا فرض نہیں، امام کی قرأت کافی ہے۔ صاحب تکمیل کا یہ کہنا کہ حالت رکوع میں جانے سے حالت بدل گئی اور مثال میں مسافر ومقیم کا مسئلہ بیان کرنا ان کی جس بدحواسی کو ظاہر کررہا ہے، ناظرین نے اندازہ کرلیا ہوگا۔

حق بات یہ ہے کہ جو لوگ مقتدی کے ذمہ امام کے پیچھے سورۂ فاتحہ پڑھنے کو فرض کہتے ہیں، ان کو یا تو ظاہریہ کی طرح اس کا قائل ہونا چاہیے کہ رکوع پانے سے رکعت نہیں مل سکتی، یا پھر حضرت ابوالدرداء کی طرح اس کے قائل ہوجائیں کہ امام کو رکوع میں پائے تو رکوع ہی میں سورۂ فاتحہ پڑھ لے، اگر وہ جمہور کی طرح اس کے قائل ہوں گے کہ رکوع پانے سے رکعت مل جاتی ہے اور رکوع میں فاتحہ پڑھنا فرض نہیں تو پھر وہ کسی طرح بھی مقتدی پر قرأت فاتحہ کو فرض نہیں کہہ سکتے۔

(۱) كذا في السنن الكبرىٰ للبيهقي، باب من قال: يقرأ خلف الإمام فيما يجهر فيه (ح:۲۹۴۳) انيس

رہا یہ کہ حنفیہ کے نزدیک تکبیر تحریمہ میں قیام فرض ہے اور اس حالت میں ابوبکرہ صحابی کو قیام بھی نہیں ملا اور بغیر قیام کے ان کی وہ رکعت ہوگئی۔ پس معلوم ہوا کہ قیام بھی فرض نہ رہا، الخ۔ (۱)

اس سے صاحب تکمیل کی بدحواسی ظاہر ہے۔ میں پوچھتا ہوں کہ حضرت ابوبکرہ نے تکبیر تحریمہ بھی کہی تھی یا نہیں؟ اگر جواب اثبات میں ہے تو حدیث میں اس کا ذکر کہاں ہے؟ اگر کہا جائے کہ تکبیر کا ذکر کرنے کی ضرورت نہیں؛ کیوں کہ معلوم ہے کہ بغیر تکبیر تحریمہ کے نماز نہیں ہوسکتی تو ہم کہتے ہیں کہ قیام کے ذکر کی بھی ضرورت نہیں؛ کیوں کہ معلوم ہے کہ تکبیر تحریمہ بغیر قیام کے صحیح نہیں ہوتی علامہ شوکانی اور امام طحاوی نے اس پر اجماع نقل کیا ہے کہ تکبیر تحریمہ بغیر قیام کے صحیح نہیں ہوسکتی، اور اگر جواب نفی میں ہے تو یہ ساری امت کے خلاف ہے، تکبیر تحریمہ کے بغیر کسی کے نزدیک بھی نماز صحیح نہیں ہوسکتی۔

دوسری دلیل پر تنقید:

اس کے بعد دوسری دلیل حضرت ابوہریرہ کی حدیث ابوداؤد کے حوالہ سے مختصر نقل کی گئی ہے، ہم نے اس کو اپنے دلائل میں مفصل بیان کردیا ہے کہ حضرت ابوہریرہ فرماتے ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک نماز سے فارغ ہوکر جس میں جہر کیا تھا، فرمایا کہ تم میں سے کسی نے میرے ساتھ اس وقت قرأت کی ہے، ایک شخص نے کہا: ہاں، یا رسول اللہ! میں نے قرأت کی ہے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: میں بھی کہوں یہ کون مجھ سے قرآن چھین رہا ہے؟ جب لوگوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ بات سنی تو صحابہ اس نماز میں قرأت کرنے سے رک گئے، جس میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم جہر کے ساتھ قرأت کرتے تھے۔ اس کو امام مالک نے موطأ میں امام شافعی نے مسند میں ائمہ اربعہ نے سنن میں روایت کیا ہے اور ترمذی نے اس کی تحسین کی اور ابن حبان نے صحیح کہا ہے۔ (۲)

اس دلیل کا جواب صاحب تکمیل نے دیا ہے کہ ''صحابہ قرأت کرنے سے رک گئے، یہ لفظ مدرج (۳) ہے، مرفوع نہیں ہے، یہ زہری تابعی کا قول ہے۔

---

(۱) عن أبی بکرة أنه دخل المسجد ورسول اللّٰه صلی اللّٰه علیه وسلم یصلی وقد رکع فرکع ثم دخل الصف وهو راکع فلما انصرف النبی صلی اللّٰه علیه وسلم قال: أیکم دخل فی الصف وهو راکع؟فقال له أبوبکرة: أنا ؛ فقال زادک اللّٰه حرصا ولا تعد. (نیل الأوطار، باب ماجاء فی صلاة فذاومن رکع: ۲۲۱/۳. دارالحدیث مصر. انیس)

(۲) موطأ الإمام مالک روایة أبی مصعب الزهری، ماجاء فی ترک القراءة خلف الإمام (ح: ۲۵۰)/سنن ابن ماجة، باب إذا قرأ الإمام فأنصتوا (ح: ۸۴۸)/سنن أبی داؤد، باب من رأی القراءة إذا لم یجهر (ح: ۸۲۷)/سنن الترمذی، باب ماجاء فی ترک القراءة خلف الإمام (ح: ۳۱۲)/سنن النسائی، ترک القراءة خلف الإمام فیما جهر فیه (ح: ۹۱۹)/صحیح ابن حبان، ذکر الزجر عن رفع الصوت بالقراءة للمأموم (ح: ۱۸۴۳) انیس

(۳) یعنی راوی نے بڑھا دیا ہے، صحابی کا قول نہیں۔ ظ

میں پہلے بتلا چکا ہوں کہ ابوداؤد نے اس کو معمر کے واسطہ سے بھی روایت کیا ہے اور اس میں تصریح ہے کہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا:

''لوگ جہری نماز میں قرأت سے رک گئے''۔

اور معمر ثقہ متقن ہے، ان سے روایت کرنے والا احمد بن السرح بھی ثقہ ثبت ہے، پس یہ دعویٰ غلط ہے کہ یہ زہری کا قول ہے، پھر اگر زہری کا قول بھی ہو تو یہ زہری کا فتویٰ تو نہیں؛ بلکہ ایک واقعہ کی خبر ہے اور زہری مغازی وسیر واخبار رسول صلی اللہ علیہ وسلم میں امام وقت ہے، زمانۂ رسول کے واقعات بیان کرنے میں ان کا قول حجت ہے۔

صاحب تکمیل کا یہ کہنا کہ ''اس سے نماز سری میں قرأت کی ممانعت نہیں پائی جاتی'' تو سری نمازوں میں قرأت سے ہم بھی منع نہیں کرتے، مگر جہری میں تو قرأت کی ممانعت ثابت ہوگئی اور یہی ہمارا مدعی ہے۔

اس کے بعد صاحب تکمیل فرماتے ہیں کہ مطلب حدیث کا صاف ہے کہ سورۂ فاتحہ کے بعد جب امام جہری نمازوں میں کوئی سورت پڑھے تو مقتدی خاموش ہو کر سنے، الخ۔

مگر وہ یہ تو بتائیں کہ یہ مطلب اس حدیث کے کس لفظ سے معلوم ہوا؟ ظاہر ہے کہ **''فانتهٰى النّاس عن القرأة في ماجهر فيه النبى صلّى الله عليه وسلّم بالقرأة''**. (۱) ''پس لوگ قرأت کرنے سے رک گئے، ان نمازوں میں، جن میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قرأت جہر سے کرتے تھے''۔ ان الفاظ میں فاتحہ یا غیر فاتحہ کا کوئی ذکر نہیں؛ بلکہ مطلقاً قرأت سے رک جانا مفہوم ہو رہا ہے، اگر کہا جائے کہ دوسری حدیث سے یہ قید بڑھائی گئی ہے، جس میں ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کا اپنے شاگرد کو حکم ہے: **''إقرأبها في نفسك''** کہ سورۂ فاتحہ اپنے نفس میں پڑھ لیا کرو تو اس کا مطلب ہمارے نزدیک یہ ہے کہ دل میں پڑھ لیا کرو اور اگر ایک حدیث میں دوسری حدیث سے تم ایک قید بڑھا سکتے ہو تو حنفیہ نے کیا جرم کیا کہ جو وہ حدیث عبادہ: **''لاصلاة لمن لم يقرأبفاتحة الكتاب''** میں دوسری احادیث کی وجہ سے **''هٰذا إذا كان وحده''** کی قید بڑھاتے ہیں کہ سورۂ فاتحہ کی قرأت کے بغیر نماز نہ ہونا، اس وقت ہے کہ تنہا نماز پڑھ رہا ہو اور یہ قید خود راوی حدیث سفیان بن عیینہ نے بڑھائی ہے، (۲) اور امام احمد بن حنبل نے حضرت جابر کی روایت سے اس کی تائید کی ہے اور حدیث صحیح ''**إذا قرأ فانصتوا**'' بھی اس کی مؤید ہے، **''فما هو جوابكم فهو جوابنا''**، صاحب تکمیل کا ترمذی کے قول کو نقل کرنا اور امام احمد کے قول کو چھوڑ دینا اور امام الکلام سے سہارا ڈھونڈنا ان کی جس بیچارگی کو ظاہر کر رہا ہے، اہل علم خوب سمجھ سکتے ہیں۔

---

(۱) سنن أبى داؤد، باب من كره القراءة بفاتحة الكتاب إذا جهر (ح: ٨٢٦) انيس

(۲) مسند الإمام أحمد، مسند أبى هريرة (ح: ٥٢٨١) انيس

تیسری دلیل پر تنقید:

تیسری دلیل کے جواب میں تو صاحب تکمیل نے کمال کر دیا۔ ایک تو حضرت جابر کی حدیث: "**من صلّی رکعة لم یقرأ فیها بأمّ القراٰن فلم یصل إلاّ أن یکون وراء الإمام**" "جس نے کوئی رکعت بغیر فاتحہ کے پڑھی، اس نے نماز نہیں پڑھی، مگر یہ کہ امام کے پیچھے ہو"۔ اس کا مطلب آپ نے یہ نکالا کہ "مقتدی کی وہ رکعت جس میں اس نے امام کو حالت رکوع میں پالیا ہو، صرف یہ رکعت اس کی بلا فاتحہ درست ہے"۔ بھلا موطا مالک اور ترمذی نے حضرت جابر سے جو الفاظ نقل کئے ہیں، ان سے کسی کا ذہن بھی اس مطلب کی طرف پہنچ سکتا ہے جو صاحب تکمیل نے گھڑا ہے، ترمذی نے اس حدیث سے امام احمد کا عدم وجوب قرأت فاتحہ خلف الامام پر استدلال کرنا نقل کیا ہے تو کیا امام احمد حدیث کا مطلب غلط سمجھے، صاحب تکمیل ہی صحیح مطلب سمجھے، سبحان اللہ! لفظ "**إلا وراء الإمام**" کو مسبوق کی اس رکعت سے کیا واسطہ جو بحالت رکوع پالی گئی ہے۔ "ماروں گھٹنا پھوٹے آنکھ" اسی کو کہتے ہیں، اگر ایسے ہی دور دراز مطالب بیان کر دینے سے دوسرے کے دلائل کا جواب دیا جا سکتا ہے تو بخدا آپ ایک دلیل سے بھی اپنا مدعی ثابت نہ کر سکیں گے۔

یہ تو حدیث کے معنی میں بے تکی تاویل تھی، اب صاحب تکمیل کی دیانت سند کی بحث میں ملاحظہ ہو۔ اول تو آپ نے اثر جابر کو موقوف قرار دے کر یہ قاعدہ بیان کیا ہے کہ "قول صحابی حدیث مرفوع کے خلاف ہے تو وہ عند الحنفیہ مقبول نہیں"۔ مگر وہ پہلے تو یہ ثابت کریں کہ حضرت جابر کا یہ قول حدیث مرفوع کے خلاف کیوں کر ہے۔ حدیث: "**إذا قرأ فانصتوا**" کے خلاف نہیں اور حدیث "**من کان له إمام فقرأة الإمام له قراءة**" کے بھی موافق ہے۔ رہی حدیث عبادہ تو ترمذی نے امام احمد بن حنبل کا قول نقل کر دیا ہے کہ وہ حضرت جابر کے اس قول ہی کی وجہ سے حدیث عبادہ کو منفرد پر محمول کرتے ہیں؛ کیوں کہ حدیث عبادہ میں امام یا مقتدی سے کچھ بھی تعرض نہیں۔

پھر آپ نے ترمذی کے محشی اور مولانا احمد علی محدث سہارنپوری کو ناواقف قرار دیتے ہوئے یہ گل کھلائے ہیں کہ ان لوگوں نے اس اثر کو طحاوی کے حوالہ سے مرفوع لکھا ہے، حالانکہ خود امام طحاوی نے شرح معانی الآثار میں اس کی پرزور الفاظ میں تردید کی ہے، پھر طحاوی سے ایک عبارت نقل کر دی "**من ذٰلک: یحیٰی بن السلام عن شعبة فهو منکر، إلخ**" "من جملہ ان کے حدیث یحییٰ بن سلام کی شعبہ سے ہے، سو وہ حدیث منکر ہے"۔(۱) جس سے ہر دیکھنے سننے والا یہی سمجھے گا کہ امام طحاوی نے یحییٰ بن سلام کی اس حدیث کو منکر کہا ہوگا، جو حضرت جابر سے مروی ہے، حالانکہ طحاوی کا یہ قول حدیث جابر کے متعلق اصلاً نہیں؛ بلکہ مناسک حج کی اس حدیث کے متعلق ہے، جو یحییٰ بن سلام نے شعبہ سے ابن ابی لیلیٰ سے زہری سے سالم سے عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً روایت کی ہے کہ تمتع کرنے والا اگر

(۱)　شرح معانی الآثار، باب المتمتع إذا لا یجد هدیا، الخ (ح:٤١١٦): ٢/٢٤٦، انیس

ہدی نہ پائے تو ایام تشریق میں روزہ رکھ لے اور محدثین کے اصول پر اس حدیث کے مرفوع ہونے کو منکر قرار دیا ہے کہ یہ عبداللہ بن عمر کا قول ہے؛ کیوں کہ یحییٰ بن سلام اور ابن ابی لیلیٰ کے حفظ میں محدثین کو کلام ہے، اس کے بعد طحاوی نے یہ بھی فرمایا ہے: "**مع أنی لاأحبّ أن أطعن علٰی أحد من العلماء بشئ ولكن ذكرت مايقول أهل الرواية فی ذٰلک،اهـ**". (۳٦٥/۱)(۱) یعنی اگرچہ میں علما میں سے کسی پر بھی طعن کرنا پسند نہیں کرتا؛ لیکن اہل روایت نے جو کچھ کہا ہے، وہ میں نے ذکر کر دیا ہے۔

صاحب تکمیل کی خیانت:

اس جگہ صاحب تکمیل نے چند خیانتیں کی ہیں۔ایک یہ کہ طحاوی نے یحییٰ بن سلام کی اُس اُس حدیث کو منکر کہا تھا، جو وہ شعبہ کے واسطے سے جواز صوم ایام تشریق میں روایت کرتا ہے، اس حدیث کو ہرگز منکر نہیں کہا، جس کو (۱/۱۰۷) پر امام مالک کے واسطہ سے وہب بن کیسان سے حضرت جابر سے قرأت خلف الامام کے متعلق مرفوعاً روایت کیا گیا ہے۔(۲)

دوسرے جس حدیث کو طحاوی نے یحییٰ بن سلام وابن ابی لیلیٰ کے ضعف کی وجہ سے منکر کہا تھا، وہاں بھی پُر زور تردید نہیں کی تھی، بلکہ صاف کہہ دیا تھا کہ "میں خود کسی عالم پر طعن کرنا نہیں چاہتا تھا، صرف اہل روایت کا قول نقل کر رہا ہوں"۔ اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ خود طحاوی کے نزدیک یحییٰ بن سلام اور ابن ابی لیلیٰ ضعیف یا مطعون نہیں ہیں۔اس پر یہ دلیری اور بے باکی کہ خود تو خیانت کا ارتکاب کریں اور محشی ترمذی اور مولانا احمد علی صاحب پر خدا سے نہ ڈرنے کا الزام لگائیں۔

تیسرے کتب رجال سے یحییٰ بن سلام کا ترجمہ بھی نہ دیکھ لیا، جس سے معلوم ہو جاتا کہ بعض محدثین نے اس کو ثقہ بھی کہا ہے اور ایسا راوی حسن الحدیث ہوتا ہے اور صحیح اور حسن کا راوی اگر ایسی زیادتی کرے جو جماعت کے خلاف نہ ہو، اس کی زیادت مقبول ہے۔(ملاحظہ ہو! شرح نخبہ ص:۱۲)(۳) اور ظاہر ہے کہ موقوف کو مرفوع کرنا ایسی زیادت نہیں جس کو مخالفت پر محمول کیا جا سکے؛ کیوں کہ حضرات صحابہ کبھی حدیث رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو بطور فتویٰ اپنی طرف سے استعمال کرتے تھے، کبھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا نام لے کر حدیث کو مرفوع کرتے تھے۔اب یحییٰ بن سلام کا ترجمہ

(۱) شرح معانی الآثار،باب المتمتع إذا لا يجد هديا ،الخ (ح:٤١١٦):٢٤٦/٢،انیس

(۲) باب القراءة خلف الإمام: ٢١٨/١،عالم الكتب،انيس

(۳) (وزيادة راويهما) وفی نسخة:رواتهما(أی الصحيح والحسن مقبولة)إذ ليس فيها سبب الرد،وأضاف الراوی إليهما لأن الكلام فی الثقة وفزيادة غيرهما بل رواته مطلقا غيرمقبولة (مالم تقع)أی الزيادة (منافية لرواية من)... (هو أوثق)أی من راويهما فمن التفضيلية مقدرة مع مدخولها وبين من بقوله:(ممن لم يذكر تلك الزيادة)، الخ.(شرح نخبة الفكر للقاری،زيادة الثقة: ٣١٥/١،دار الأرقم لبنان،انيس)

لسان المیزان :۲۶۰/۶ سے ملاحظہ ہو۔ابن عدی کہتے ہیں کہ باوجود ضعف کے اس کی حدیث لکھی جائے۔ابن حبان نے اس کو ثقات میں ذکر کیا ہے اور کہا: کبھی خطا بھی کرجاتا ہے۔ابوزرعہ رازی نے کہا: ''لابأس به ربما وهم'' ''اس میں کوئی بات نہیں کبھی وہم بھی کرجاتا ہے''۔ ابوحاتم نے کہا: شیخ بصری صدوق بزرگ ہے اور بہت سچا۔ ابوالعرب نے طبقات قیروان میں اس کا تذکرہ کیا ہے اور کہا ہے: ''کان من الحفاظ ومن خیار خلق الله'' ''حفاظ حدیث میں سے اور بہترین لوگوں میں سے تھا'' اھ، صرف دارقطنی نے اس کو ضعیف کہا ہے۔ابن عدی نے اس کی منکرات میں حدیث جابر کو ذکر نہیں کیا جو اس وقت زیر بحث ہے، نہ طحاوی نے اس کو منکر کہا اور اکثر محدثین نے یحییٰ بن سلام کی توثیق کی ہے،(۱) تو اگر اس کی حدیث کو مولانا احمد علی صاحب نے حسن کہہ دیا تو کیا جرم کیا؟

رہا یہ کہ طحاوی نے اس کے بعد اسماعیل بن موسیٰ سدی کا اثر بیان کیا ہے، جس میں یہ مضمون ہے کہ اسماعیل نے امام مالک سے پوچھا میں جابر کی اس حدیث کو مرفوع کردوں؟ امام مالک نے فرمایا: ''خذوا برجله''. (۲) اس میں سب سے پہلے تو اسماعیل سدی کا حال معلوم کرنا چاہیے کہ وہ کس درجہ کا ہے؟ سو اگرچہ بعض محدثین نے اس کی توثیق کی ہے، مگر ابن حبان نے ثقات میں اس کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ عبدان (شیخ بخاری) نے فرمایا کہ ابوبکر بن ابی شیبہ اور نہاد بن السری نے (کہ یہ بھی امام بخاری کے مشائخ میں سے ہیں) ہمارے اس کے پاس جانے پر انکار کیا اور کہا: یہ شخص فاسق ہے، سلف کو برا کہتا ہے۔ابن عدی کہتے ہیں: اس نے امام مالک کی دو حدیثوں کو موصول کردیا اور شریک سے بھی چند احادیث میں منفرد ہے (کوئی اس کے ساتھ شریک نہیں)، لوگوں نے اس کے غلو فی التشیع کی بنا پر اس کو منکر کہا ہے، یعنی غالی شیعہ ہے؛ اس لیے محدثین نے اس پر انکار کیا ہے۔(تہذیب:۳۳۶/۱)(۳) ایسے غالی شیعہ کی روایت سے یحییٰ بن سلام جیسے بہترین حافظ کی روایت کو مجروح قرار دینا صاحب تکمیل ہی کی جرأت ہے، پھر اس غالی شیعہ نے امام مالک کا جو قول نقل کیا ہے، اس سے کچھ نہیں معلوم ہوتا کہ امام مالک نے اس حدیث کے رفع پر انکار کیا ہے، یا اس شخص کے شریک درس ہونے پر ان کے الفاظ یہ ہیں کہ ''اس کے پیر پکڑ لو'' جس کا مطلب یہ بھی ہوسکتا ہے کہ اس کو قید کرلو؛ تاکہ حدیث بیان نہ کرنے پائے اور یہ بھی مطلب ہوسکتا ہے کہ پیر پکڑ کے یہاں سے نکال دو، یہ شیعہ غالی ہمارے درس میں بیٹھنے کے لائق نہیں، اس سے یہ کہاں معلوم ہوا کہ امام مالک نے حدیث کے مرفوع ہونے

(۱) لسان الميزان، من اسمه يحي، مؤسسة الأعلمي للمطبوعات بيروت/ الثقات لابن حبان، باب الياء، رقم: ١٦٣٢٩ :٢٦١/٩، دائرة المعارف العثمانية بحيدر آباد/ الضعفاء لأبي زرعة الرازي في أجوبته على أسئلة البردعي: ٣٣٩/٢، عماد البحث العلمي بالجامعة الإسلامية المدينة المنورة/ علل الدارقطني: ٣٤/١٥، دار ابن الجوزي الدمام. انيس

(۲) شرح معاني الآثار، باب القراءة خلف الإمام: ٢١٨/١، عالم الكتب، انيس

(۳) تهذيب التهذيب، من اسمه اسماعيل، دائرة المعارف النظامية. انيس

پر انکار کیا ہے اور اگر انکار بھی ہو تو اس کا رفع صحیح نہ ہوگا، مگر حسن تو ہو سکتا ہے اور مولانا احمد علی صاحب نے رفع کو حسن ہی کہا ہے، صحیح نہیں کہا۔

چوتھی دلیل پر تنقید:

حنفیہ کی طرف سے چوتھی دلیل یہ بیان کی گئی ہے کہ صحیح مسلم میں قتادہ رضی اللہ عنہ سے ''وإذا قرأ فانصتوا'' وارد ہے، (صاحب تکمیل کے الفاظ سے ایسا مفہوم ہوتا ہے کہ وہ قتادہ کو صحابی سمجھتے ہیں، یہ غلط ہے، حدیث کے راوی حضرت ابوموسیٰ اشعری صحابی ہیں) اس حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے امام اور مقتدی کے فرائض کا بیان فرمایا ہے کہ امام اس لیے بنایا گیا ہے کہ اس کا اتباع کیا جائے، جب وہ تکبیر کہے تکبیر کہو، جب وہ قرأت کرے، خاموش رہو، جب وہ رکوع کرے، رکوع کرو' الخ، اس سے ہر شخص جو بھی سنے گا، یہی سمجھے گا کہ مقتدی کو امام کی قرأت کے وقت خاموش رہنا چاہیے۔ ہم نے اس حدیث کو حدیث عبادہ کے معارض یا اس کا ناسخ ہرگز نہیں کہا، ہم صرف یہ کہتے ہیں کہ حدیث عبادہ میں امام یا مقتدی کا کوئی ذکر نہیں، اس میں صرف یہ مضمون ہے کہ جو فاتحہ نہ پڑھے، اس کی نماز نہیں، اس کو مقتدی کے متعلق کہنا صحیح نہیں، وہ غیر مقتدی کے حق میں ہے اور حدیث ابوموسیٰ صاف طور سے مقتدی کے حق میں ہے اور ہم بتلا چکے ہیں کہ حدیث عبادہ کے راوی سفیان بن عیینہ اور زہری نے بھی اس کو غیر مقتدی کے متعلق سمجھا ہے۔

اب اس کے بعد اہل حدیث کی تاویلات ملاحظہ ہوں! وہ کہتے ہیں ''إذا قرأ فانصتوا'' کا مطلب یہ ہے کہ سورۂ فاتحہ کے سوا اور سورت پڑھنے سے خاموش رہو، کوئی ان سے پوچھے کہ حدیث ''إذا قرأ فانصتوا'' میں فاتحہ یا غیر فاتحہ کا کہاں ذکر ہے، جو یہ قید بڑھائی جا رہی ہے، حدیث میں تو مطلقاً خاموش رہنے کا ذکر ہے۔ اگر یہ کہا جائے کہ حدیث عبادہ کی وجہ سے یہ قید بڑھائی جا رہی ہے تو اس کی کیا دلیل ہے کہ حدیث عبادہ سے ''إذا قرأ فانصتوا'' کو مقید کرنا ضروری ہے؟ تطبیق اور توفیق کی یہ صورت بھی تو ہو سکتی ہے کہ حدیث عبادہ کو اس حدیث کی وجہ سے منفرد پر محمول کیا جائے، جیسا سفیان بن عیینہ اور امام احمد بن حنبل اور امام زہری نے کیا ہے اور یہی حنفیہ نے اختیار کیا ہے، اب صاحب تکمیل اس کی وجہ بتلائیں کہ جو وجہ تطبیق وہ بیان کرتے ہیں، وہی صحیح ہے اور جو وجہ ہم نے بیان کی ہے وہ صحیح نہیں ہے، اہل حدیث کو جو منکر تقلید ہیں، یہ حق نہیں ہے کہ وہ حدیث ''إذا قرأ فانصتوا'' کے ظاہر مطلب کو کسی کی تقلید سے بدل دیں اور اگر ان کو بیہقی وغیرہ کی تقلید میں اس حدیث کا ایک مطلب بیان کرنے کا حق ہے تو ہم کو بھی امام ابوحنیفہ اور احمد بن حنبل وسفیان بن عیینہ وزہری کی تقلید میں اس کا وہ مطلب بیان کرنے کا حق ہے، جو حدیث کے الفاظ سے بلا تاویل مفہوم ہو رہا ہے۔

رہا یہ کہ اس حدیث ''إذا قرأ فانصتوا'' کے دوسرے راوی حضرت ابوہریرہ نے اپنے شاگرد سے فرمایا تھا: ''إقرأ

بها فی نفسک یا فارسی" کہ حالت اقتدا میں سورۂ فاتحہ کو اپنے نفس میں پڑھو، اس کا مطلب ہمارے نزدیک یہ ہے کہ دل دل میں پڑھو؛ کیوں کہ موطا مالک میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ ہی کی یہ حدیث موجود ہے: "**فانتھی الناس عن القراءۃ فیما جھرفیہ النبی صلی اللّٰہ علیہ وسلم**" کہ لوگ جہری نمازوں میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پیچھے قرأت کرنے سے رک گئے، جیسا پہلے گزر چکا ہے، جس سے صاف معلوم ہوا کہ جہری نمازوں میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ قرأت خلف الامام کے قائل نہ تھے۔

"قال فی غیث الغمام: قولہ إقرأ بها المراد من القرأۃ فی النفس والاختیار بالبال من دون أن یتلفظ بها أی أحضر معانیها فی نفسک وقدر فیها حین یقرأها الإمام، کذا نقلہ الزرقانی فی معناہ عن عیسٰی وابن نافع، اھ.

یعنی حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کا یہ فرمانا کہ اپنے نفس میں سورۂ فاتحہ پڑھ لو، اس کا مطلب یہ ہے کہ دل میں پڑھو اور دل سے سوچتے رہو، زبان سے تلفظ نہ کرو؛ بلکہ اس کے معانی کو دل میں حاضر کرتے اور سوچتے رہو، جب کہ امام سورۂ فاتحہ پڑھے، زرقانی نے اسی طرح اس کا مطلب عیسیٰ اور ابن نافع سے نقل کیا ہے، اھ، ابن نافع امام مالک کے شاگرد ہیں۔

وقال الطحاوی رحمہ اللّٰہ: وکان من الحجۃ علیهم فی ذٰلک إن حدیثي أبی هریرۃ وعائشۃ الذین رووهما عن النبی صلّی اللّٰہ علیہ وسلّم کل صلاۃ لم یقرأ فیها بأم القراٰن فهی خداج لیس فی ذلک دلیل علٰی أنہ أراد بذٰلک الصلاۃ التی تکون وراء الإمام قد یجوز أن یکون عنی بذٰلک الصلاۃ التی لا إمام فیها للمصلی وأخرج من ذٰلک المأموم بقولہ من کان لہ إمام فقراءۃ الإمام لہ قراءۃ فجعل المأموم فی حکم من یقرأ بقراءۃ إمامہ فکان المأموم بذٰلک خارجاً من قولہ کل من صلّٰی صلاۃ لم یقرأ فیها بفاتحۃ الکتاب فصلٰوتہ خداج، اھ. (۱۰۶/۱)(۱)

امام طحاوی فرماتے ہیں کہ جو لوگ قرأت خلف الامام کے قائل نہیں ہیں، ان کی حجت مخالفوں پر یہ ہے کہ حضرت ابو ہریرہ اور حضرت عائشہ کی اس حدیث میں کہ جس نماز میں سورۂ فاتحہ نہ پڑھی جائے، وہ ناقص ہے، اس پر کوئی دلیل نہیں کہ اس سے وہ نماز مراد ہے جو امام کے پیچھے ہو، جائز ہے کہ اس سے وہ نماز مراد ہو، جس میں مصلی امام کے پیچھے نہ ہو، اس حکم سے آپ نے مقتدی کو اپنے دوسرے قول سے کہ جس کا کوئی امام ہو، اس کی قرأت مقتدی کے لیے قرأت ہے، مستثنیٰ کر دیا ہے، جس میں مقتدی کو امام کی قرأت کی وجہ سے حکماً قاری قرار دیا گیا ہے، پس مقتدی اس حکم سے مستثنیٰ ہے کہ جو نماز بغیر سورۂ فاتحہ کے پڑھی جائے، وہ ناقص ہے۔

اب صاحب تکمیل الانصاف سے بتلائیں کہ حدیث "**إذا قرأ فانصتوا**" کی جو تاویل وہ کر رہے ہیں، اس کے صحیح اور

(۱) شرح معانی الآثار، باب القراءۃ خلف الإمام: ۲۱۵/۱، عالم الکتب، انیس

حق ہونے کی کیا دلیل ہے؟ جب کہ حدیث میں صاف حکم ہے کہ امام جس وقت قرأت کرے، مقتدی خاموش رہیں۔ رہا یہ کہ دارقطنی کی روایت میں ہے:

"**إذا قال الإمام: غير المغضوب عليهم ولاالضالين فانصتوا**". (۱) کہ جب امام سورۂ فاتحہ ختم کرے، خاموش رہو۔ جس سے معلوم ہوا کہ خاموش رہنے کا حکم سورۂ فاتحہ کے بعد ہے تو اہل حدیث کو یہ روایت پیش کرتے ہوئے شرمانا چاہیے، یہ منکر روایت ہے، تمام ثقات نے اس کو یوں بیان کیا ہے:

"**إذا قال الإمام غير المغضوب عليهم ولاالضالّين فقولوا: آمين**" (۲) "جب امام غیر المغضوب علیهم ولاالضالّین" کہے تم آمین کہو"۔ کسی محدث نے "**فقولوا: آمين**" کو مختصر الفاظ میں "**فأمّنوا**" کے لفظ سے بیان کر دیا ہوگا، اس کو کسی عقلمند نے تصحیف اور تبدیل کر کے "**فانصتوا**" کہہ دیا، ایسی مہمل باتوں سے صاحب تکمیل اپنا دل خوش کر لیں، مگر سمجھنے والے ان کی بے بسی کو خوب سمجھ چکے ہیں اور اگر اس کو صحیح مان لیا جائے تو "**ولا الضّالّين**" کے بعد جہر سے آمین کہنا بھی ممنوع ہوگا؛ کیوں کہ حدیث میں "**ولا الضّالّين**" کے بعد خاموش رہنے کا امر ہے، **فما هو جوابكم فهو جوابنا**. اور اگر کوئی مقتدی نماز میں ایسے وقت شریک ہوا کہ امام سورۂ فاتحہ پڑھ چکا ہے، اس کو بحالت قیام سورۂ فاتحہ پڑھنا امام کے پیچھے جائز نہ ہوگا؛ کیوں کہ اس حدیث میں امام کے "**ولا الضالين**" پڑھنے کے بعد مقتدی کو خاموش رہنے کا حکم ہے، اس کے متعلق صاحب تکمیل کا کیا فتویٰ ہے؟

پانچویں دلیل پر تنقید:

پانچویں دلیل حنفیہ کی طرف سے یہ بیان کرتے ہوئے "**من كان له إمام فقرأته له قراءة**" "جس کا کوئی امام ہو، امام کی قرأت اس کے لیے قرأت ہے"۔ صاحب تکمیل نے علامہ سندی حنفی کا سہارا ڈھونڈا ہے کہ اس کی سند میں جابر جعفی ہے، جو کذاب ہے اور یہ حدیث صحاح ستہ کی حدیث (حدیث عبادہ) کے خلاف ہے، اللہ اللہ! تقلید کا انکار کرنے والے بھی سندی حنفی کی تقلید کرتے ہیں، یا للعجب! اگر وہ سچے اہل حدیث ہوتے تو اس حدیث کے طرق کی تلاش کرتے؛ تاکہ معلوم ہو جاتا کہ ابن ماجہ کی سند میں جابر جعفی کے ہونے سے یہ لازم نہیں آتا کہ ہر سند میں وہی موجود ہو، اب سنئے اس حدیث کو حضرات صحابہ کی ایک جماعت نے روایت کیا ہے۔

جابر بن عبداللہ وعبداللہ بن عمر وابوسعید خدری وابو ہریرہ وابن عباس وانس بن مالک رضی اللہ عنہم اجمعین، حدیث جابر کو حسن سند سے ابن ماجہ نے روایت کیا ہے اس میں جابر جعفی ہے، مگر اس کی دوسری سند بالکل صحیح ہے، جس کو امام محمد

(۱) سنن الدارقطنى، باب ذكر قوله صلى الله عليه وسلم: من كان له إمام، الخ (ح: ۱۲۵۱) انيس

(۲) موطأ الإمام مالك. ت: الأعظمى، باب ماجاء بالتأمين خلف الإمام (ح: ۴۵) انيس

نے موطأ میں امام ابوحنیفہ سے موسیٰ بن ابی عائشہ سے عبداللہ بن شداد سے حضرت جابر سے بایں الفاظ روایت کیا ہے:

"من صلّی خلف الإمام فإن قراء ۃ الإمام له قراء ۃ". (۱)

(جس نے امام کے پیچھے نماز پڑھی تو امام کی قرأت اس کے لیے بھی قرأت ہے)۔

اس پر دارقطنی کا یہ فرمانا کہ "اس حدیث کو سفیان ثوری اور ابوالاحوص، شعبہ، اسرائیل، شریک، ابو خالد دالانی، سفیان بن عیینہ وغیرہ نے موسیٰ بن ابی عائشہ سے عبداللہ بن شداد سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے مرسلاً روایت کیا ہے (صحابی کا نام حذف کر دیا) اور وہی درست ہے"۔ (۲) ہم پر حجت نہیں؛ کیوں کہ مسند احمد بن منیع میں اس حدیث کو سفیان ثوری اور شریک القاضی کے واسطہ سے مرفوعاً موصولاً روایت کیا گیا ہے، پس یہ کہنا غلط ہے کہ امام ابوحنیفہ نے تنہا اس کو موصول کیا ہے اور اگر مان لیا جائے تو ابوحنیفہ ہزاروں محدثین سے بڑھ کر ثقہ ہیں، ان کا کسی حدیث کو تنہا موصول کرنا بھی اصول محدثین کی بنا پر واجب القبول ہے۔

امام ابوحنیفہ کا درجہ علم حدیث میں:

یحییٰ بن معین کے زمانہ تک امام ابوحنیفہ پر کسی نے بھی جرح نہیں کی تھی، مسئلہ خلق قرآن کا فتنہ رونما ہونے کے بعد بعض محدثین حشویہ نے ان پر جرح شروع کر دی؛ کیوں کہ اس فتنہ میں علماء محدثین پر سختی کرنے والے قاضی عقیدۃً معتزلی اور فروعاً حنفی تھے، حشویہ نے ان قاضیوں سے اس طرح انتقام لیا کہ امام ابوحنیفہ، امام ابو یوسف اور امام محمد بن حسن شیبانی پر جرح کرنے لگے، جو مذہب حنفی کے ستون ہیں۔

"ولما سئل ابن معين عنه قال: ثقة مأمون ماسمعت أحدًا ضعفه، هٰذا شعبة بن الحجاج يكتب إليه أن يحدث وشعبة شعبة". (۲)

"جب یحییٰ بن معین سے امام صاحب کی نسبت سوال کیا گیا، فرمایا: ثقہ مامون ہیں، میں نے کسی کو نہیں سنا کہ ان کو ضعیف بتایا ہو، شعبہ بن الحجاج ان کو حدیث بیان کرنے کی تاکید خط کے ذریعہ کرتے ہیں اور شعبہ شعبہ ہی ہیں"۔

بڑے بڑے ائمہ نے امام صاحب کی تعریف کی ہے، جیسے عبداللہ بن المبارک اور ان کا شمار تو امام صاحب کے شاگردوں میں ہے اور سفیان بن عیینہ، سفیان ثوری، حماد بن زید، عبدالرزاق، وکیع بن الجراح اور یہ تو امام صاحب کی

---

(۱) موطأ الإمام مالک برواية محمد بن الحسن الشيباني، باب القراءة في الصلاة خلف الإمام، ص: ۵۸، رقم الحديث: ۱۱۷، دار إحياء التراث، انیس

(۲) عمدة القاري، باب وجوب القراءة للإمام والمأموم، الخ: ۱۲/۶، دار إحياء التراث العربي/ وكذا في تاريخ ابن معين رواية ابن محرز: ۷۹/۱، مجمع اللغة العربية دمشق/ تهذيب التهذيب، من اسمه النعمان: ۴۴۹/۱۰-۴۵۲. انیس

فقہ پر فتویٰ دیا کرتے تھے، نیز ائمہ ثلثہ امام مالک وشافعی واحمد بن حنبل رحمہ اللہ علیہم نے بھی امام صاحب کی بہت مدح وثنا کی ہے۔ (شرح بخاری: ۱۲/۶)(۱)

تاریخ خطیب بغدادی میں جو بعض بڑے لوگوں سے امام صاحب کی تضعیف وتنقیص منقول ہے، یہ سب فتنۂ خلق قرآن کے بعد جماعت حشویہ کی گھڑت ہے؛ کیوں کہ یہ تمام خرافات عموماً مجہولین، مجروحین، کذابین کے ذریعہ سے روایت کی گئی ہیں اور خطیب کی وفات کے بہت بعد اس کی تاریخ میں ملحق کی گئی ہیں، خطیب نے ثقات کے ذریعہ سے بجز مناقب وفضائل کے کچھ ذکر نہیں کیا، (۲) جس کو تفصیل کا شوق ہو، میرا مستقل مضمون ''خطیب بغدادی اور منکرین حدیث'' مطبوع ماہنامہ الصدیق ملتان بابت سنہ ۱۹۵۷-۱۹۵۸ء مطالعہ کریں۔

رہے دوسرے طرق، جو حضرت عبداللہ بن عمر وابوسعید خدری وابو ہریرہ وابن عباس وانس بن مالک رضی اللہ عنہم سے مروی ہیں، ان کے بعض راویوں پر اگر چہ دار قطنی نے کلام کیا ہے، مگر ان میں اکثر ایسے ہیں، جو بعض محدثین کے نزدیک ثقہ ہیں، پھر اصول حدیث کا قاعدہ ہے کہ چند ضعیف مل کر حسن اور کبھی صحیح کے درجہ پر پہنچ جاتے ہیں، پس یہ کہنا غلط ہے کہ حنفیہ کے گھر کا فیصلہ ہے کہ یہ حدیث قابل تسلیم نہیں، اگر صاحب تکمیل عینی شرح بخاری کا مطالعہ کر لیتے تو معلوم ہو جاتا کہ حنفیہ کے نزدیک یہ حدیث بالکل صحیح، بلکہ صحیح سے بھی اوپر ہے؛ کیوں کہ اس کو خود امام محمد نے امام ابوحنیفہ سے موطا اور کتاب الآثار میں بسند صحیح روایت کیا ہے، پھر امام دار قطنی نے جو اس کو مرسلاً صحیح کہا ہے، ان کو معلوم ہونا چاہیے کہ عبداللہ بن شداد صحابی صغیر ہیں، (۳) اور جب امام شافعی کے نزدیک سعید بن المسیب جیسے تابعی کبیر کا مرسل قابل قبول ہے تو صحابی صغیر کا مرسل بدرجہ اولیٰ مقبول ہوگا؛ کیوں کہ مراسیل صحابہ کو بالاتفاق سب نے قبول کیا ہے۔ (۴)

اس کے بعد صاحب تکمیل نے امام بخاری کا ایک فیصلہ نقل کیا اور دعویٰ کیا ہے کہ یہ آب زر سے لکھنے کے قابل ہے، جس کا حاصل یہ ہے کہ حدیث: ''**من كان له إمام فقراء ة الإمام له قراء ة**'' عام ہے اور حدیث عبادہ میں ''**إلاّ بأم القرآن**'' سے سورۂ فاتحہ کو مستثنیٰ کیا گیا ہے، اس کی ایسی مثال ہوئی، جیسے ایک حدیث میں ہے کہ میرے لیے ساری زمین نماز کی جگہ بنائی گئی ہے، پھر دوسری حدیث میں ''**إلا المقبرة و الحمام**'' کہہ کر قبرستان وغیرہ کو مستثنیٰ کیا گیا ہے۔

(۱) مرقاة المفاتيح ،مقدمة المؤلف: ۳۰/۱،دار الفكر/وكذا في شرح البخاری للسفيری الشافعی،المجلس السادس: ۱/۵۵-۱۵۷،دار الكتب العلمية بيروت.انيس

(۲) تاريخ بغداد،ت:بشار عواد معروف،مناقب أبی حنيفة: ۴۵۹/۱۵،دار الغرب الإسلامی بيروت.انيس

(۳) عبد اللّٰه بن شداد بن الهاد الليثی العتواری ولد علی عهد رسول اللّٰه صلی اللّٰه عليه وسلم، كان من أهل العلم.(الإستيعاب في معرفة الأصحاب: ۹۲۶/۳،دار الجيل بيروت/أسد الغابة،عبد اللّٰه بن شداد: ۲۷۶/۳،دار الكتب العلمية بيروت.انيس)

(۴) الفصول في الأصول،باب القول في الخبر المرسل: ۱۴۵/۳،وزارة الأوقاف الكويتية.انيس

مگر سوال یہ ہے کہ امام طحاوی نے بھی تو یہی فرمایا ہے کہ حدیث ابوہریرہ ''**کل صلاۃ لم یقرأ فیھابأم القراٰن فھي خداج**''، ''جس نماز میں سورۂ فاتحہ نہ پڑھی جائے، وہ خداج (ناقص) ہے''۔ عام ہے جس میں سے حدیث: ''**من کان له إمام فقرأته له قراءة**'' نے مقتدی کو مستثنیٰ کر دیا ہے اور اس کو امام کی قرأت کی وجہ سے قاری قرار دیا گیا ہے تو اس کی کیا وجہ کہ امام بخاری کا قول تو آبِ زر سے لکھنے کے قابل ہے اور امام طحاوی کا قول آبِ زر سے لکھنے کے قابل نہ ہو، یہ محض زبردستی اور عصبیت ہے اور کچھ نہیں، حالانکہ لفظ قرأت کو عام کہنا غلط ہے اور حدیث ابوہریرہ میں ''**کل صلاۃ**'' کا عام ہونا صحیح اور واضح ہے، پھر ہم بتلا چکے ہیں کہ حدیث عبادہ میں جملہ استثنائیہ الا بام القرآن کو امام فن یحییٰ بن معین نے ضعیف کہا ہے، اس کی وجہ سے حدیث ''**من کان له امام**'' الخ، میں تاویل کرنا صحیح نہیں اور حدیث ''**من کان له إمام**'' صحیح حدیث ہے، نیز حدیث مسلم ''**إذا قرأ فانصتوا**'' اور نص قرآن ﴿**إذا قرئ القراٰن فاستمعوا له وأنصتوا**﴾ (۱) کے موافق ہے، اس کو حدیث عبادہ اور حدیث ابوہریرہ کے لیے مخصص قرار دینا درست ہے، پس امام طحاوی کا قول بہت وزنی ہے، جس کے سامنے امام بیہقی وغیرہ کی تاویل کی کوئی حقیقت نہیں۔

رہا یہ کہ دارقطنی (اور بیہقی نے) حضرت جابر سے روایت کیا ہے کہ ایک شخص نے ظہر یا عصر میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پیچھے ﴿**سَبِّحِ اسمَ ربِّکَ الاَعلیٰ**﴾ (۲) پڑھی تو آپ نے نماز کے بعد دریافت فرمایا، یہ کون میرے پیچھے قرأت کر رہا تھا؟ تین بار دریافت فرمایا، ایک شخص نے کہا: میں نے قرأت کی تھی، فرمایا: میں دیکھ رہا تھا کہ تم قرآن میں مجھ سے منازعت کر رہے تھے، جو شخص امام کے پیچھے نماز پڑھے، اس کو امام کی قرأت کافی ہے، الخ۔

تو یہ حدیث تو حنفیہ کی دلیل تھی، جس کو مغالطہ کے طور پر صاحب تکمیل اپنی بنا رہے ہیں، حدیث سے صاف معلوم ہو رہا ہے کہ اس شخص نے آہستہ قرأت کی تھی، اگر جہر سے قرأت کی ہوتی تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو تین بار دریافت کرنے کی نوبت نہ آتی، صحابہ پہلے ہی سوال پر کہہ دیتے کہ فلاں نے قرأت کی تھی، پھر آپ کا یہ فرمانا کہ جو امام کے پیچھے نماز پڑھے، امام کی قرأت اس کے لیے قرأت ہے۔ صاف بتلا رہا ہے کہ امام کے پیچھے مقتدی کو قرأت نہ کرنا چاہیے۔ اس سے یہ سمجھنا کہ سورۂ فاتحہ کے سوا اور کوئی سورت نہ پڑھے، زبردستی کی تاویل ہے، جو ہرگز حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد سے مفہوم نہیں ہوسکتی؛ بلکہ اس سے تو یہ معلوم ہو رہا ہے کہ سری نمازوں میں بھی آپ کو مقتدی کی قرأت گوارا نہ تھی اور یہ کہ عام طور سے صحابہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پیچھے قرأت نہ کرتے تھے۔ ایک دو ناواقف ایسا کرتے تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم ان کو قرأت سے روک دیتے تھے، اگر سب صحابہ قرأت کرتے ہوتے تو بقیہ مقتدی یہ ضرور کہتے

---

(۱) سورة لأعراف: ۲۰٤، انیس

(۲) سورة الأعلی: ۱. انیس

کہ ہم نے تو صرف سورۂ فاتحہ پڑھی تھی، مگر ایسا نہیں ہوا؛ بلکہ سب خاموش رہے، پھر قرأت کرنے والے نے یہ بھی نہیں کہا کہ میں نے سورۂ فاتحہ اور ﴿سَبِّحِ اسْمَ رَبِّکَ الاَعلٰی﴾ پڑھی تھی، اس نے بھی صرف ﴿سَبِّحِ اسْمَ رَبِّکَ الاَعلٰی﴾ کی قرأت کا اقرار کیا، جس سے معلوم ہوا کہ قرأت فاتحہ خلف الامام کا صحابہ کو اہتمام نہ تھا، پھر اگر قرأت فاتحہ خلف الامام لازمی تھی تو اس شخص کو آپ مطلقاً قرأت سے منع نہ کرتے؛ بلکہ صاف فرمادیتے کہ فاتحہ کے سوا کچھ نہ پڑھا کرو۔ حضرت جابر کی حدیث کے کسی طریق میں بھی قرأت فاتحہ کا استثنا مذکور نہیں اور حدیث عبادہ کے جملہ استثنائیہ کا حال اوپر گزر چکا ہے کہ ائمہ حدیث نے اس کو ضعیف قرار دیا ہے، پس حنفیہ کی دلیل کو اپنی دلیل بنانے والا خود جہالت کا ارتکاب کررہا ہے، وہ اس خطاب کا جو دوسروں کو دے رہا ہے، خود ہی مستحق مستعمل ہے۔

چھٹی دلیل پر تنقید:

اس کے بعد چھٹی دلیل عبداللہ بن مسعود کی حدیث کنز العمال کے حوالہ سے نقل کی گئی ہے:

"إذا صلّى أحدكم خلف الإمام فلينصت فإن قرأته له قراء ة و صلاته له صلاة". (۱)

(جو شخص امام کے پیچھے نماز پڑھے خاموش رہے؛ کیوں کہ اس کی قرأت اس کے لیے قرأت ہے اور اس کی نماز اس کی نماز ہے۔)

اس حدیث کو اول تو ضعیف کہا گیا ہے، مگر ہم بتلا چکے ہیں کہ یہ حدیث چند صحابہ کی روایت سے ہے، جن میں عبداللہ بن مسعود صحابی کا بھی اضافہ ہوگیا اور حدیث ضعیف کا تعدد طرق سے حسن یا صحیح کے درجہ پر پہنچ جانا اصول حدیث میں مصرح ہے، پھر اس حدیث کے بعض طرق یقیناً صحیح ہیں اور بعض حسن ہیں، جیسا پہلے اپنے دلائل میں ہم بیان کرچکے ہیں اور یہ بھی گزر چکا ہے کہ حافظ ابن حجر نے اس حدیث کو حضرت جابر کی روایت سے مشہور قرار دیا ہے اور حدیث مشہور کا جو درجہ ہے اہل حدیث اس سے ناواقف نہیں ہیں، پھر اس میں بھی وہی بے تکی تاویل کی گئی ہے کہ لفظ قرأت عام ہے، جس سے بوجہ حدیث عبادہ کے سورۂ فاتحہ مستثنیٰ ہے، الخ۔ اس تاویل کا لغو ہونا ابھی بیان ہوچکا ہے۔

پھر ایک عجیب الزام دیا گیا ہے کہ اگر جملہ "فإن قرأته له قراء ة" سے یہ مطلب لیا گیا کہ امام کی قرأت مقتدی کو کافی ہے، اس کو سورۂ فاتحہ پڑھنے کی ضرورت نہیں تو جملہ "و صلاته له صلوٰة" کا بھی یہی مطلب ہوگا کہ امام کی نماز مقتدی کو کافی ہے تو اقتداء کے بعد ارکان نماز مثلاً رکوع وسجود وغیرہ کی بھی مقتدی کو ضرورت نہ ہوگی۔

اس کا جواب یہ ہے کہ صاحب تکمیل کے نزدیک صلوٰۃ نام ہی سورۂ فاتحہ کا ہے۔ جیسا حدیث "قسمت الصلاة

(۱) کنز العمال، الفصل الثاني في الإمامة وما يتعلق بها: ٦١٧/٧، مؤسسة الرسالة/القراء ة خلف الإمام للبيهقي، ذكر خبر آخر يحتج به من كره القراء ة خلف الإمام (ح: ٣٦٧) انیس

بيني وبين عبدي“ کی تفسیر میں ص:۵۴ پر امام رازی سے نقل کر چکے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے اس حدیث میں سورۂ فاتحہ کو صلوٰۃ فرمایا ہے، جس سے معلوم ہوا کہ اگر فاتحہ نہ ہو تو نماز ہی نہیں، الخ، جب آپ کے نزدیک سورۂ فاتحہ ہی کا نام صلوٰۃ ہے تو حدیث ابن مسعود کا حاصل یہ ہوگا کہ امام کی قرأت مقتدی کی قرأت ہے اور اس کی سورۂ فاتحہ مقتدی کی سورۂ فاتحہ ہے، اس کو خود پڑھنے کی ضرورت نہیں اور قرأت کے بعد خاص سورۂ فاتحہ کا ذکر اس لیے فرمایا گیا کہ شاید کوئی یہ سمجھے کہ قرأت سے مراد ماسوائے فاتحہ ہے، اس لیے اس شبہ کو رفع کر دیا گیا، یہ تو الزامی جواب تھا، دیکھیں صاحب تکمیل اس الزام کو کس طرح اپنے اوپر سے دفع کرتے ہیں۔

تحقیقی جواب یہ ہے کہ جملہ ”**وصلاته له صلاة**“ کا وہی مطلب ہے، جو حدیث ”**الإمام ضامن**“ کا مطلب ہے کہ امام کی نماز صحۃً وفساداً متضمن صلوٰۃ مقتدی ہے، یعنی اگر امام کی نماز صحیح ہوگی، اس کی بھی صحیح ہوگی، اس کی فاسد ہوگی تو اس کی بھی فاسد ہوگی، چنانچہ ابوداؤد کی ایک روایت میں اسی مضمون کو اس طرح بیان کیا گیا ہے:

”قال وحدّثنا...أن رسول اللّٰه صلّى اللّٰه عليه وسلّم قال: لقد أعجبني أن تكون صلاة المسلمين أو المؤمنين واحدةً“.(۱)

(حضرت معاذ بن جبل نے بیان کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: مجھے یہ اچھا معلوم ہوتا ہے کہ مسلمانوں کی نماز ایک نماز ہو۔)

جماعت کی نماز کو آپ نے ایک نماز قرار دیا ہے، الگ الگ بہت سی نمازیں قرار نہیں دیں اور عرفاً وعادۃً بھی جماعت کی نماز کو ایک ہی نماز قرار دیا جاتا ہے اور اسی لیے کہ جماعت کی نماز ایک نماز ہے، سترہ صرف امام کے سامنے کافی ہے، ہر مقتدی کے آگے الگ الگ سترہ کی ضرورت نہیں تو ایک نماز کے لیے ایک قرأت اور ایک ہی فاتحہ کافی ہے، ہر ایک کو قرأت کی ضرورت نہیں، بقیہ ارکان کو قرأت پر قیاس کرنا غلط ہے؛ کیوں کہ امام کی قرأت کے لیے تو استماع وانصات کا قرآن وحدیث میں صاف حکم ہے اور رکوع وسجود کے لیے نیابت کافی نہیں سمجھی گئی، بلکہ مقتدیوں کو صاف حکم ہے:

”إذا ركع فاركعوا وإذا سجد فاسجدوا“(۲)

(جب امام رکوع کرے تم بھی رکوع کرو اور جب وہ سجدہ کرے تم بھی سجدہ کرو۔)

اور یہی عام عادت بھی ہے کہ جب دربار شاہی میں بہت سے لوگ ایک درخواست لے کر پہنچتے ہیں تو افعال تعظیمی تو ہر شخص بجالاتا ہے، مگر گفتگو رئیس وفد کرتا ہے، ہر شخص الگ الگ گفتگو نہیں کرتا اور درخواست قبول ہونے کے بعد پھر

(۱) سنن أبي داؤد، كتاب الصلاة، باب كيف الأذان: ۷۹/۱ (ح:۵۰۶) بيت الأفكار، انيس

(۲) سنن الدارمي، باب القول بعد رفع الرأس من الركوع (ح:۱۳۵۰): ۸۲۸/۲، دار المغني. انيس

ہر شخص شکریہ الگ الگ ادا کرتا اور آداب تعظیمی بجالاتا ہے، یہی صورت شریعت نے نماز میں رکھی ہے کہ اول سب تکبیر کہیں، آداب شاہی بجالائیں، اس کے بعد درخواست پیش کرنا امام کا کام ہے، جب وہ سورۂ فاتحہ کے بعد دوسری سورت پڑھتا ہے جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے بمنزلہ جواب کے ہے تو ہر شخص آداب تعظیمی بجالاتا ہے اور رکوع وسجدہ میں شکریہ اور تعظیم کے الفاظ ادا کرتا ہے۔

منصفین اہل حدیث سے اپیل:

اگر اہل حدیث انصاف سے کام لیں تو ان کے لیے اتنا سمجھ لینا ہی کافی ہے کہ جس حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے امام اور مقتدی دونوں کے فرائض بیان فرمائے ہیں؛ یعنی حدیث:

”إنّما جعل الإمام ليؤتم به فإذا كبر فكبروا، وإذا ركع فاركعوا، وإذا قال: سمع الله لمن حمده، فقولوا: اللّهم ربنا لک الحمد، وإذا سجد فاسجدوا، الخ“. (۱)

(امام اس لیے بنایا گیا ہے کہ اس کا اتباع کیا جائے، جب وہ تکبیر کہے، تکبیر کہو، جب رکوع کرے، رکوع کرو، جب ”**سمع الله لمن حمده**“ کہے ”**اللّهم ربنا لک الحمد**“ کہو، جب سجدہ کرے سجدہ کرو۔)

اس کی کسی روایت میں بھی یہ نہیں ہے: ”**وإذا قرأ فاقرؤا**“ کہ جب امام قرأت کرے، تم بھی قرأت کرو، اگر مقتدی کے ذمہ امام کی قرأت کے ساتھ قرأت فرض یا واجب ہوتی تو اس کا بیان اس حدیث میں ضروری تھا، جس میں امام اور مقتدی دونوں کے فرائض بیان کئے جارہے ہیں، اس حدیث میں اگر ہے تو ”**إذا قرأ فانصتوا**“ ہے کہ جب امام قرأت کرے، تم خاموش رہو، ملاحظہ ہو! صحیح مسلم اور ابوداؤد، پس جس کو قرأت فاتحہ خلف الامام کے فرض ہونے کا دعویٰ ہے، وہ اس حدیث کے کسی طریق میں ”**إذا قرأ فاقروا**“ دکھلائے؛ کیوں کہ اسی حدیث میں امام اور مقتدی دونوں کے فرائض کا بیان ہے، حدیث عبادہ پیش کرنا کافی نہیں؛ کیوں کہ اس میں امام اور مقتدی کے فرائض کے فرائض کا بیان نہیں، بلکہ راوی حدیث سفیان بن عیینہ اور زہری وغیرہ نے خود کہہ دیا ہے کہ وہ تنہا نماز پڑھنے والے کے متعلق ہے اور اسی کو امام احمد نے بیان فرمایا ہے۔

ساتویں دلیل پر تنقید:

ساتویں دلیل صحیح مسلم سے زید بن ثابت رضی اللہ عنہ کا قول نقل کیا گیا ہے: ”**لا قراءة مع الإمام فی شئ من الصلوات**“ کہ امام کے ساتھ کسی نماز میں بھی قرأت نہیں ہے، (۲) اس کے بعد وہی بے تکی تاویل اس میں بھی کی گئی

(۱) سنن أبی داؤد، كتاب الصلاة، باب الإمام يصلی من قعود: ۸۸/۱ (ح: ۶۰۳) بيت الأفكار/سنن الدارمی، باب القول بعد رفع الرأس من الركوع (ح: ۱۳۵۰): ۸۲۸/۲، دار المغنی، عن أبی هريرة رضی اللّٰه عنه. انيس

(۲) الصحيح لمسلم، باب سجود التلاوة (ح: ۵۷۷)/أحاديث اسماعيل بن جعفر، أحاديث يزيد بن خصيفة (ح: ۳۳۱) مكتبة الرشد. انيس

==

ہے کہ یہ اثر ماسوائے فاتحہ پر محمول ہے اور دیدہ دلیری کے ساتھ فرماتے ہیں کہ یہ جواب صحیح مسلم کے اسی صفحہ پر موجود ہے، الخ، کوئی ان سے پوچھے کہ امام نووی کی تقلید کس دن سے واجب ہوگئی، جو ان کے جواب کو ماننا حنفیہ پر لازم ہوگیا اور نہ مانیں تو شپرہ چشم کہلائیں؟ مگر جو لوگ امام طحاوی کے جواب کو نہ دیکھیں، نہ مانیں، ان کے لیے کیا لقب تجویز کیا جائے گا؟ یہ ہے اہل حدیث کی دیانت اور تہذیب کہ اپنے مطلب کی بات کسی جگہ سے مل جائے تو فوراً مقلد بن جاتے ہیں اور اس کے ماننے پر ایسا زور دیتے ہیں گویا آسمان سے وحی نازل ہوگئی ہے کہ اثر زید بن ثابت کا وہی مطلب ہے جو امام نووی نے بیان کیا، یا امام بیہقی نے اپنے مذہب کی رعایت وحمایت میں کچھ لکھ دیا ہے، میں پوچھتا ہوں کہ زید بن ثابت کے اثر میں فاتحہ یا غیر فاتحہ کا ذکر ہی کہاں ہے اور اگر اسی طرح کی تاویلوں سے کام لیا جائے گا تو آپ کی ایک دلیل بھی قائم نہ رہ سکے گی، ہر شخص کو اختیار ہوگا کہ آپ کے تمام دلائل کو منفرد پر محمول کردے اور تائید میں حدیث: ''إذا قرأ فانصتوا'' اور نص قرآنی: ﴿إذا قرئ القرآن فاستمعوا له وأنصتوا﴾ (۱) کو پیش کردے، پھر یہ کہاں کا انصاف ہے کہ آپ کی تاویل اور امام نووی اور بیہقی کا قول تو حجت ہو اور دوسرے کی تاویل اور امام احمد وسفیان بن عیینہ اور زہری اور طحاوی اور علامہ عینی کے اقوال حجت نہ ہوں؟ اگر آپ سچے اہل حدیث ہیں، تو صرف حدیث کے الفاظ سے استدلال کیجئے، اِدھر اُدھر سے اس میں قیدیں نہ بڑھائیے، اس راستہ سے آپ چلیں گے تو ان شاء اللہ حنفیہ کے مسلک کی قوت کھلی آنکھوں سے نظر آجائے گی۔

آپ نے حنفیہ کے جتنے دلائل پر کلام کیا ہے، وہ صاف الفاظ میں قرأت فاتحہ خلف الامام کے ممنوع ہونے یا فرض وواجب نہ ہونے کو ظاہر کررہے ہیں، مگر آپ امام نووی یا بیہقی یا امام رازی وغیرہ کی تقلید کا سہارا لے کر ان میں وہ تاویلیں کرتے ہیں، جس کا آپ کو کوئی حق نہیں، ''ڈوبتے کو تنکے کا سہارا'' اسی کا نام ہے۔

امام احمد اور علامہ ابن تیمیہ کے قول کا اعادہ:

اخیر میں امام احمد بن حنبل اور علامہ ابن تیمیہ کا قول پھر یاد دلاتا ہوں، امام احمد فرماتے ہیں: ''ہم نے اہل اسلام میں سے کسی کو یہ کہتے نہیں سنا کہ جب امام قرأت جہر سے کررہا ہو اور اس کے پیچھے مقتدی قرأت نہ کرے تو ان کی نماز صحیح نہ ہوگی، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہ وتابعین اور اہل حجاز میں امام مالک، اہل عراق میں امام سفیان ثوری، اہل شام میں امام اوزاعی، اہل مصر میں امام لیث بن سعد، ان میں سے کوئی یہ نہیں کہتا کہ جو شخص مقتدی ہو اور اس کا امام قرأت کررہا ہو وہ قرأت نہ کرتا ہو تو اس کی نماز باطل ہے'' اھ۔

== امام طحاوی کے الفاظ یہ ہیں ''لا تقرأ مع الإمام في شئ من الصلوات ورجاله ثقات'' امام کے ساتھ کسی نماز میں قرأت نہ کرو اور اس کے راوی سب ثقہ ہیں۔

(۱) سورة الأعراف: ۲۰۴، انیس

موفق بن قدامہ نے امام احمد کا یہ قول نقل کرکے اس مسئلہ میں اجماع کا دعویٰ کیا ہے۔ (۶۰۶/۱)(۱)

علامہ عینی نے شرح بخاری میں فرمایا ہے کہ قرأت خلف الامام کی ممانعت بڑے بڑے اسی صحابہ سے منقول ہے، جن میں حضرت علی اور عبادلہ ثلثہ (عبداللہ بن مسعود، عبداللہ بن عمر، عبداللہ بن عباس) بھی ہیں، محدثین کو ان صحابہ کے نام معلوم ہیں، ان حضرات کا اس پر اتفاق کرنا بمنزلہ اجماع کے ہے؛ اسی لیے صاحب ہدایہ نے فرمایا ہے کہ ترک قرأت خلف الامام پر صحابہ کا اجماع ہے، اکثر کے اتفاق کو اجماع کہہ دیا گیا؛ کیوں کہ ہمارے نزدیک اس کو بھی اجماع کہا جاتا ہے اور شیخ امام عبداللہ ابن یعقوب حارثی نے اپنی کتاب ''کشف الاسرار'' میں فرمایا ہے کہ عبداللہ بن زید بن اسلم نے اپنے والد سے روایت کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ میں سے دس حضرات قرأت خلف الامام کے بارے میں بہت سختی کے ساتھ منع فرماتے تھے، (جن کے نام یہ ہیں:) ابوبکر صدیق، عمر بن الخطاب، عثمان بن عفان، علی بن طالب، عبدالرحمٰن بن عوف، سعد بن ابی وقاص، عبداللہ بن مسعود، زید بن ثابت، عبداللہ بن عمر، عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہم، اھ، اس کے بعد علامہ عینی نے متعدد صحابہ کے اقوال بحوالہ کتب واسانید بیان کئے ہیں، جن کو ہم نے اپنے دلائل میں پہلے ہی بیان کردیا ہے۔ (۲)

علامہ ابن تیمیہ نے اپنی کتاب ''تنوع العبادات'' میں فرمایا ہے کہ ''سلف نے عام طور پر قرأت خلف الامام کو مکروہ سمجھا ہے، جب کہ امام قرأت جہر سے کررہا ہو اور اکثر ائمہ سورۂ فاتحہ کے بعد سکوت طویل نہ کرتے تھے؛ (تاکہ مقتدی فاتحہ پڑھ لیں)، جہری نمازوں میں (امام کے پیچھے (قرأت کرنے والے بہت کم تھے اور اس سے کتاب اللہ نے بھی منع کیا ہے اور سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی اور جمہور سلف وخلف بھی اس سے منع کرتے ہیں اور قرأت خلف الامام کی صورت میں نماز کے باطل ہونے میں اختلاف ہے، بعض علما جہری نماز میں بھی مقتدی پر قرأت فاتحہ خلف الامام کو واجب کرتے ہیں اور اگر قرأت نہ کرے تو نماز باطل ہونے میں اختلاف ہے، پس نزاع دونوں طرف ہے؛ لیکن جو لوگ قرأت خلف الامام سے منع کرتے ہیں، ان کے ساتھ جمہور سلف وخلف ہیں اور کتاب اللہ بھی اور سنت صحیحہ بھی اور جو لوگ اس حالت میں مقتدی پر قرأت کو واجب کرتے ہیں، ان کی حدیث کو ائمہ نے ضعیف کہا ہے، ابوداؤد نے اس کو روایت کیا ہے اور حدیث ابوموسیٰ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد کو ﴿وإذا قــرأ فــانـصـتـوا﴾ (جب امام قرأت کرے، خاموش رہو) امام احمد اور اسحٰق اور امام مسلم وغیرہم نے صحیح بتلایا ہے، بخلاف اس حدیث کے جو حضرت عبادہ سے روایت کی گئی ہے: ''**(لا تفعلوا إلا بأم القرآن)** کہ امام کے پیچھے نہ پڑھے، مگر

(۱) المغني لابن قدامة الحنبلي، مسألة المأموم إذا سمع قراءة الإمام فلايقرأ بالحمد ولا بغيرها: ۴۰۴/۱، مكتبة القاهرة. انيس

(۲) عمدة القاری، باب وجوب القراءة للإمام والمأموم، الخ: ۱۳/۶، دار إحياء التراث العربي بيروت. انيس

سورۂ فاتحہ"، وہ صحیح میں شامل نہیں کی گئی اور اس کا ضعیف ہونا چند وجوہ سے ثابت ہو چکا ہے، دراصل وہ حضرت عبادہ کا قول ہے، اھ، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد نہیں ہے۔(۱)

حنفیہ کا اہل حدیث پر احسان:

الحمد للہ کہ آج بروز چہارشنبہ ۲۷/ربیع الثانی سنہ ۱۳۸۰ھ رسالہ تکمیل البرہان کا جواب تمام ہوا، جس سے ناظرین کو بخوبی اندازہ ہوگیا ہوگا کہ مسئلہ قرأت خلف الامام میں امام ابوحنیفہ کا مسلک کتاب اللہ اور سنت صحیحہ اور اجماع جمہور سلف وخلف سے مؤید ہے اور جو اہل حدیث مقتدی کی نماز کو بوجہ ترک قرأت فاتحہ خلف الامام کے باطل کہتے ہیں، ان کے پاس کوئی دلیل صریح نہیں؛ بلکہ امام کے پیچھے قرأت کرنے والوں کی نماز درست ہی ہوجائے تو غنیمت ہے؛ کیوں کہ قرآن میں اور سنت صحیحہ میں مقتدی کو قرأت قرآن کے وقت خاموش رہنے کا حکم ہے، قرأت سے منع کیا گیا ہے اور اہل حدیث کے اصول پر نہی کی مخالفت سے عمل باطل ہو جاتا ہے، اگر چہ حنفیہ کے نزدیک باطل نہیں ہوتا۔ پس ان کو امام ابوحنیفہ کا احسان مند ہونا چاہیے کہ وہ قرأت خلف الامام کی وجہ سے ان کی نمازوں کو باطل نہیں کہتے، ورنہ خود اصول اہل حدیث کا مقتضی یہ ہے کہ آیت: ﴿وإذا قری القرآن فاستمعوا له وأنصتوا﴾ (۱) کی مخالفت سے جس کا نزول بالاجماع قرأت خلف الامام کے بارے میں ہوا ہے، جیسا امام احمد بن حنبل نے فرمایا ہے، نیز حدیث صحیح "إذا قرأ فانصتوا" (۲) کی خلاف ورزی سے جو صاف طور سے مقتدیوں کے متعلق وارد ہے کہ جب امام قرأت کرے خاموش رہو، اہل حدیث کی نمازیں باطل ہو جانی چاہئیں، جیسا صوم یوم النحر کو اسی بنا پر باطل کہتے ہیں کہ شارع کی نہی موجب بطلان عمل ہے۔

امید کہ اہل فہم اس نکتہ کو سمجھ گئے ہوں گے۔ اللہ تعالیٰ مسلمانوں کو عصبیت جاہلیہ سے بچائے اور ائمہ سلف کی عظمت وادب کا پاس کرنے کی توفیق دے اور اس رسالہ کو مقبول عام وخاص بنائے۔

وآخر دعوانا أن الحمد لله ربّ العالمين وصلّى الله تعالىٰ علىٰ خير خلقه سيّدنا محمّد وآله وأصحابه أجمعين والحمد لله الذى بنعمته وبعزّته وجلاله تتم الصّلحٰت.

۲۷/ربیع الثانی ۱۳۸۰ھ۔ (احسن الفتاویٰ: ۱۰۵/۳-۲۵۶)

---

(۱) سورة الأعراف: ۲۰٤، انیس

(۲) مصنف ابن بی شیبة، من كره القراءة خلف الإمام (ح: ۳۷۹۹)/ مسند الإمام أحمد، مسند أبی هريرة (ح: ۸۸۸۹)/ الصحيح لمسلم، باب التشهد فى الصلاة (ح: ٤۰٤)/ سنن ابن ماجة، باب إذا قرأ الإمام فانصتوا (ح: ۸٤٦)/ سنن أبی داؤد، باب الإمام يصلی من قعود (ح: ٦۰٤)/ مسند البزار، أول حديث أبی موسیٰ (ح: ۳۰۵۹/ ۳۰٦۰)/ سنن النسائی، باب تأويل قوله تعالى: إذا قرئ القرآن فانصتوا (ح: ۹۲۱)/ صحيح ابن خزيمة، باب فضل إنصات المأموم عند خروج الإمام، الخ (ح: ۱۷۷۵)/ مسند الرويانى، حطان عن أبی موسى (ح: ۵٦۵) انیس

قرأت خلف الامام کے مسئلہ میں حنفیہ کی دلیل:

سوال: سورۂ فاتحہ مقتدی کو امام کے پیچھے پڑھنا جائز ہے یا نہیں بمذہب امام اعظمؒ؟ حضرت امام اعظمؒ نے کونسی آیت شریفہ کے حوالہ سے منع فرمایا ہے کہ مقتدی امام کے پیچھے الحمد نہ پڑھے؟

الجواب

امام اعظمؒ کے نزدیک ممانعت ہے اور گو آیۃ: ﴿وإذا قرئ القرآن فاستمعوا له وأنصتوا﴾ سے اس پر استدلال ممکن ہے اور علما نے کیا ہے، مگر اصل استدلال احادیث صحیحہ سے ہے؛ چنانچہ صحیح مسلم میں: ''إذا قرأ فانصتوا'' حدیث صحیح موجود ہے، وجہ استدلال اطلاق ہے قرأت کا، پس جہری سری اور فاتحہ وغیر فاتحہ سب کو شامل ہے، بندہ نے رسالہ اقتصاد میں اور مسئلوں کے ساتھ یہ بھی ذرا تفصیل سے لکھدیا ہے۔

۱۶/رجب ۱۳۲۴ھ۔ (امداد اول صفحہ: ۷۹) (امداد الفتاویٰ جدید: ۱/۲۲۹-۲۳۰) ☆

☆ قرأت فاتحہ خلف الامام کے متعلق غیر مقلدوں کے دلائل کا جواب:

سوال: جناب مفتی صاحب السلام علیکم (قراءۃ فاتحہ خلف الامام کے متعلق یہ ادلّہ ایک غیر مقلد نے پیش کی ہیں، جن کی نقل ارسال ہے) اب ہم احناف کی جو دلیلیں ہوں، ان کے جواب میں ان کو بحوالہ کتاب تحریر فرما کر ماجور ہوں؟

الجواب

مذہب مختار جمہور حنفیہ کا اس باب میں یہی ہے کہ امام کے پیچھے قرأت فاتحہ وغیرہ سب مکروہ ہے، مطلقاً خواہ نماز جہری ہو یا سری، صرف امام محمد رحمۃ اللہ علیہ سے غیر ظاہر الروایۃ میں ایک قول نقل کیا جاتا ہے کہ وہ سری نمازوں میں قرأت فاتحہ کو احتیاطاً مستحسن فرماتے ہیں۔ سائل نے اس تحریر میں حنفیہ کا مذہب نقل کرنے میں احتیاط وانصاف سے کام نہیں لیا؛ کیوں کہ خود ہدایہ میں جس سے عبارت مذکورہ فی السوال نقل کی گئی ہے، اس کے خلاف صراحۃً موجود ہے۔ سائل نے صرف اپنے مطلب کا ایک جملہ لے لیا اور اس کے خلاف قوی روایات وتصریحات کو چھوڑ دیا، ہدایہ کے یہ الفاظ:

''ولنا قوله عليه السلام من كان له إمام فقراءة الإمام له قراءة، وعليه إجماع الصحابة، إلخ. (الهداية، كتاب الصلوٰة، فصل في القراءة: ۱/۱۲۰. انیس)

اور جو قول امام محمد صاحب کا سائل نے ہدایہ سے نقل کیا ہے وہ بھی ادھورا ہے ہدایہ کے الفاظ یہ ہیں:

''ويستحسن علىٰ سبيل الاحتياط فيما يروى عن محمد رحمه الله ويكره عندهما لما فيه من الوعيد. (الهداية، كتاب الصلوٰة، فصل في القراءة: ۱/۱۲۱. انیس)

اس پوری عبارت سے دو باتیں معلوم ہوئیں۔ اول یہ کہ امام محمدؒ کا یہ قول جو نقل کیا گیا ہے ظاہر الروایت اور قوی نہیں، بلکہ روایت ضعیفہ ہے۔ صحیح قول وہی ہے جو امام صاحب کا ہے، دوسرے یہ معلوم ہوا کہ امام اعظم ابو حنیفہؒ اور امام ابو یوسفؒ سے ایسی ضعیف روایت بھی اس میں نہیں، بلکہ وہ یقینی طور پر قرأت خلف الامام کو ناجائز فرماتے ہیں، دلیل ان دونوں امر کی یہ ہے۔ علامہ ابن ہمام فتح القدیر میں ہدایہ کے اس قول کے تحت میں فرماتے ہیں:

==

قراءۃ خلف الامام کے بارے میں صحابہ کرام کا تعامل:

سوال: صحابہ کرام جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پیچھے نماز میں پڑھتے تھے تو مقتدی ہونے کی حالت میں کیا کیا پڑھتے تھے اور کس وقت خاموش رہتے تھے؟

(۲) ظہر عصر میں کچھ پڑھتے تھے، یا خاموش کھڑے رہتے تھے؟

(۳) مغرب اور عشا میں صحابہ کرام مقتدی ہونے کی حالت میں تیسری اور چوتھی رکعت میں کچھ پڑھتے تھے، یا خاموش رہتے تھے؟

== تقتضی هٰذه العبارة أنها ليست ظاهر الرواية عنه كما قال فی الزکٰوة وهو الذی يظهر من قوله فی الذخيرة وبعض مشايخنا ذكروا أن علٰی قول محمد لا يكره وعلٰی قولهما يكره، ثم قال فی الفصل الرابع: الأصح أنه يكره والحق أن قول محمد كقولهما فإن عباراته فی كتبه مصرحة بالتجافی عن خلافه فإنه فی كتاب الأثار فی باب القراء ة خلف الإمام بعد ما أسند إلٰی علقمة بن قيس أنه ما قرأ لا فيما يجهر فيه ولا فيما لا يجهر فيه، قال: وبه نأخذ، لا نرٰی القراء ة خلف الإمام فی شیءٍ من الصلٰوة وفی الموطأ للامام محمد بعد أن روی فی منع القراء ة فی الصلٰوة ما روی قال: قال محمد لا قراء ة خلف الإمام فيما جهر ولا فيما لم يجهر فيه، بذلک جاء عامة الأخبار وهو قول أبی حنيفة. (فتح القدير، كتاب الصلٰوة، فصل فی القراء ة: ۲٤۱/۱ .انيس)

الغرض امام محمد رحمۃ اللہ سے جو استحسان قرأت خلف الامام منقول ہے وہ ضعیف روایت ہے، جو تمام ان کی تصانیف کے خلاف ہے اور خود ہدایہ میں بھی اس کی تضعیف کی طرف اشارہ ہے، جیسا کہ ابن ہمام کی تصریح سے معلوم ہوا۔ اب سائل نے اس ضعیف روایت کو مختلف کتب حنفیہ سے نقل کرکے یہ دکھانا چاہا ہے کہ خود حنفیہ کے نزدیک بھی قرأت خلف الامام مستحسن ہے اور انہیں کتابوں میں جو اس روایت کے خلاف تصریحات اور قوی روایات ہیں ان کو چھوڑ دیا۔ لہٰذا صحیح بات وہی ہے جو علامہ ابن ہمامؒ نے فرمائی ہے، یعنی: والحق أن قول محمد رحمه الله كقولهما.

یہاں تک تو اس کے متعلق تھا کہ حنفیہ کا مذہب مختار اور صحیح کیا ہے۔ رہا یہ امر کہ قرأت فاتحہ خلف الامام کی ممانعت پر حنفیہ کے دلائل کیا ہیں۔ سو یہ طویل الذیل سوال ہے، جس کے جواب میں بیسوں مفصل ومدلل رسائل حنفیہ کی طرف سے مطبوعہ موجود ہیں، اگر اس کی مکمل تحقیق کرنا ہے تو رسائل ذیل ملاحظہ فرمائیں۔

ہدایۃ المعتدی بزبان اردو۔ فصل الخطاب (عربی) امام الکلام (عربی) آثار السنن (عربی) اعلاء السنن (عربی واردو) وغیرہ اور اجمالاً اتنا بھی کافی ہے کہ ایک دلیل حنفیہ کی آیت قرآن ہے:

﴿وإذا قرئ القرآن فاستمعوا له وأنصتوا﴾. (سورة الأعراف: ۲۰٤، انيس) جس میں صاف سکوت اور استماع کا امر ہے اور منجملہ دلائل کے ایک وہ حدیث بھی ہے جو اوپر بحوالہ ہدایہ گذری۔ یعنی: من كان له امام فقرأة الامام له قرأة. یہ حدیث بالکل صحیح اور صریح ہے، اجلہ محدثین نے اس کی تصحیح فرمائی ہے، جس کی تفصیل کی یہاں گنجائش نہیں۔ (والله تعالیٰ اعلم)

۸/صفر ۱۳۵۰ھ۔ (امداد المفتین: ۲/۲۹۸-۲۹۹)

(۴) اگر کوئی صحابہ ایک یا دو رکعت کے بعد جماعت میں شریک ہوتے تھے تو فوت شدہ رکعات میں کچھ پڑھتے تھے، یا نہیں؟

(۵) اگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم قصر پڑھ کر سلام پھیر دیتے تو مقتدی باقی دو رکعت کس طرح ادا کرتے تھے؟

الجواب

نمبر اول سے نمبر پانچ تک تمام صورتوں میں صحابہ کرام کا عمل مختلف رہا ہے اور اسی لئے ان کے بعد تابعین اور تبع تابعین اور تمام ائمہ دین کے اندر اس مسئلہ میں خلاف واقع ہوا، صحابہ کرام اس بات میں تین جماعتوں پر منقسم تھے، بعض حضرات مطلقاً امام کے پیچھے قرأت نہ پڑھتے تھے، نہ سرّی نمازوں میں اور نہ جہری نمازوں میں اور نہ جہری نمازوں کی آخری تیسری یا چوتھی رکعت میں اور بعض حضرات سری نمازوں میں پڑھتے تھے اور جہری میں نہیں اور بعض حضرات سے یہ بھی نقل کیا جاتا ہے کہ وہ سری اور جہری دونوں میں امام کے پیچھے فاتحہ پڑھتے، جیسا کہ کتب حدیث کے تتبع سے معلوم ہوتا ہے؛ لیکن جمہور صحابہ کا عمل کتب حدیث سے یہی ظاہر ہوتا ہے کہ وہ قرأت خلف الامام کے مطلقاً منکر تھے، جن میں سے بعض آثار اس جگہ نقل کئے جاتے ہیں:

(۱) **وكان عبد الله بن عمر لايقرأ خلف الإمام.** (وإسناده صحيح، رواه مالك فى الموطأ)(۱)

(۲) **عن وهب بن كيسان أنه سمع جابربن عبد الله يقول من صلى ركعة لم يقرأ فيهابأم القران فلم يصل إلا وراء الإمام.** (رواه مالك فى المؤطاوإسناده صحيح)(۲)

(۳) **عن زيد بن ثابت وجابر بن عبد الله فقالوا: لايقرأ خلف الإمام فى شيءٍ من الصلوٰة.** (رواه الطحاوى وإسناده صحيح)(۳)

عن ابن مسعودرضى الله عنه قال: انصت للقراءة فإن فى الصلوٰة شغلاً وسيكفيك ذلك الإمام. (رواه الطحاوى وإسناده صحيح)(۴)(امداد المفتین: ۲۹۹/۲-۳۰۰) ☆

(۱) موطأ الإمام مالك، ت: الأعظمى، ترك القراءة خلف الإمام فيما جهر فيه (ح: ٢٨٤)انيس

(۲) موطأ الإمام مالك، ت: الأعظمى، ترك القراءة خلف الإمام فيما جهر فيه (ح: ٢٧٦)انيس

(۳) شرح معانى الآثار، باب القراءة خلف الإمام (ح: ١٣١٧)انيس

(۴) شرح معانى الآثار، باب القراءة خلف الإمام (ح: ١٣٠٧)انيس

☆ **امام کے پیچھے الحمد شریف پڑھنا:**

سوال: جو لوگ امام کے پیچھے الحمد شریف پڑھتے ہیں، ان کی نماز ہوتی ہے یا نہیں؟

الجواب

کتب فقہ میں ہے کہ مقتدی کو امام کے پیچھے الحمد شریف پڑھنا مکروہ تحریمی ہے؛ لیکن اصح مذہب کے موافق نماز صحیح ہو جاتی ہے۔ ==

مقتدی کے لئے سورہ فاتحہ پڑھنا:

سوال: مقتدی کے لئے سورہ فاتحہ پڑھنا ضروری ہے یا نہیں؟

الجواب

امام شافعیؒ کے نزدیک فرض ہے، مگر حنفیہ کے نزدیک جائز نہیں۔ دلیل ہے:

"من كان له إمام فقراء ةالإمام قراء ةله". (۱)

جس کا مطلب یہ ہے کہ امام کی قرأت پوری جماعت کے لئے کافی ہے اور سورہ کی قرأت قیاس کا تقاضا بھی یہی ہے اور حدیث "**لاصلاةإلابفاتحة الكتاب**" بھی قرأت کے بارے میں معمول بہ ہے اور آیت کریمہ: ﴿**واذا قرئ القرآن فاستمعوا له وأنصتوا**﴾ (۲) "قرأت مقتدی سے مانع ہے، خواہ جہری نماز ہو یا سری۔ واللہ اعلم

(مجموعہ فتاویٰ مولانا عبدالحئی اردو: ۲۱۰)

== درمختار میں ہے:

"والمؤتم لايقرأ مطلقاًولاالفاتحة، إلخ. فإن قرأ كره تحريماًوتصح فى الأصح، إلخ. (امداد المفتین: ۳۰۰/۲)

مقتدی کے لئے سورہ فاتحہ کی تلاوت:

سوال: کیا نماز میں امام کے ساتھ مقتدی بھی فاتحہ پڑھے، یا مقتدی خاموش کھڑا رہے؟ (محمد عبدالصمد، وجے واڑہ)

الجواب

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "امام اس لئے ہے کہ اس کی اقتدا کی جائے، لہٰذا جب امام "اللہ اکبر" کہے تو تم بھی "اللہ اکبر" کہو، اور جب قرأت کرنے لگے تو خاموش ہو جاؤ، "**إذا كبر فكبروا وإذاقرأ فانصتوا**". (سنن النسائی: ۱۴۶/۱، رقم الحديث: ۹۲۳ (باب تأويل قوله عزوجل: ﴿إذا قرئ القرآن فاستمعوا له وأنصتوا لعلكم ترحمون﴾ (سورة الأعراف: ۲۰۴، انیس) محشی) ایک روایت میں مزید وضاحت ہے کہ "جب امام "اللہ اکبر" کہے تو "اللہ اکبر" کہو، جب قرأت کرے تو خاموش رہو، اور جب امام "**غير المغضوب عليهم ولاالضآلّين**" کہے تو "آمین" کہو" (سنن ابن ماجة: ۶۱/۱. رقم الحديث: ۸۴۶، باب إذا قرأالإمام فانصتوا. از محشی) نیز حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: "جب کوئی شخص امام کے ساتھ نماز پڑھ رہا ہو تو امام ہی کی قرأت اس کی قرأت ہے" "**من كان له إمام فقراء ة الإمام له قراء ة**". (سنن ابن ماجة: ۶۱/۱، رقم الحديث: ۸۵، سنن الدار القطني: ۳۲۳/۱) اس لئے امام کے پیچھے سورۂ فاتحہ نہیں پڑھنی چاہئے، اگر پڑھ لے تو گو کراہت سے خالی نہیں؛ لیکن نماز درست ہو جاتی ہے۔ "**فإن قرأ كره تحريما وتصح في الأصح**". (رد المحتار: ۲۶۶/۲) (کتاب الفتاویٰ: ۱۹۵/۲-۱۹۶)

(۱) شرح معانی الآثار، باب القراء ة خلف الإمام (ح: ۱۲۹۴): ۲۱۷/۱، عالم الكتب بيروت/مسند أبي حنيفة برواية أبي نعيم: ۲۱۰/۱، مكتبة الكوثر الرياض. انیس

(۲) سورة الأعراف: ۲۰۴، انیس

قرأت فاتحہ خلف الامام:

سوال: ایک اشکال مجھ کو اس حدیث میں ہے جو کہ ترمذی ابوداؤد دونوں میں ہے:

"هل قرأ منكم معي أحد ؟ قالوا: نعم، قال: لا تفعلوا إلاّ بأم القرآن، فإنه لاصلاة لمن لم يقرء بها". (سنن الترمذی: ۶۹/۱)

اس کا جناب والا نے ایک مطلب یہ بھی بتلایا تھا کہ حضور کے ارشاد کا یہ مطلب ہے کہ کوئی نماز ایسی نہیں ہوتی کہ اس میں سورۂ فاتحہ نہ پڑھی جائے، کثیر الدوران ہونے کی وجہ سے اس کے پڑھنے میں ثقل نہ ہوگا، مکمل بحث پڑھنے پر ظاہر ہوتا ہے کہ یہاں لفظ نہ ہوگا اور اس پر دلیل نفی واستثنا کی بیان فرمائی تھی، اب اشکال یہ ہے کہ جب مختصر حدیث جو تمام صحاح کی کتابوں میں ہے اور یہ مطول حدیث متحد ہیں، ابن حجر بھی متحد مانتے ہیں اب برتقدیر اتحاد؛ مختصر حدیث میں مسلم ابوداؤد وغیرہ میں معمر اور سفیان نے جو زیادتی فصاعداً کی زیادہ کی ہے اور صحیح ہے، اس زیادتی کو اس مطول حدیث کے ساتھ اگر ملایا جائے تو عبارت اس طرح ہوگی۔

"قال لعلكم تقرؤن خلف إمامكم قلنا نعم هذا يارسول الله (صلى الله عليه وسلم) قال: لا تفعلوا إلا بفاتحة الكتاب فإنه لا صلوة لمن لم يقرأ بها(فصاعداً).

اس تقدیر پر مذکورہ بالا معنی حدیث کے سمجھ میں نہیں آتے۔

الجواب ــــــــــــــــــــــــ

اس حدیث کے متعلق یہی تو اشکال ہے کہ اس کا سیاق سباق کے مخالف ہے؛ یعنی جملہ اولی تو دلالت کرتا ہے کہ مازاد علی الفاتحہ کو امام کے پیچھے جہریہ میں مت پڑھا کرو اور جملہ اخیرہ دلالت کرتا ہے کہ ہر نماز میں مازاد اور فاتحہ دونوں ضروری ہیں، بغیر ان دونوں کے نماز ہوتی ہی نہیں، اس لئے یہ حدیث اپنے متعارض مفہوم کی وجہ سے قابل استدلال ہی نہیں ہے، مگر یہ اشکال اس معنی کی وجہ سے پیدا ہوتا ہے جو کہ محدثین اور شوافع وغیرہ اس حدیث کے لیتے ہیں کہ "**لا صلاة إلابفاتحة الكتاب**" کو انشا اور حکم قرار دیتے ہیں اور مختصر کرنے کی وجہ سے یہی متبادر ہوتا ہے جو کہ لفظ "**فإنه**" کے حذف کی وجہ سے اور قوی ہوگیا ہے اور اگر اس جملہ کو خبر قرار دیں جو کہ مدلول مطابقی اسی جملہ کا ہے اور لفظ فانہ اس پر شاہد قوی ہے۔ جس سے علت حکم سابق کی بتلانا منظور ہے تو معنی بالکل صحیح ہوجاتے ہیں اور حدیث مذکور کے اول وآخر کا تعارض جاتا رہتا ہے؛ یعنی امام کے پیچھے قرأت کی ممانعت منازعت فی القراءۃ کی وجہ سے ہے اور وہ ام القرآن میں نہیں ہوتی؛ کیوں کہ وہ ہر نماز میں خواہ سری و جہری منفرداً ہو یا جماعت خواہ رکعت اولی ہو، ثانیہ اور ثالثہ ورابعہ، نافلہ ہو یا فریضہ، سب میں پڑھی جاتی ہے تو کثیر الدوران ہوئی، بخلاف مازاد کے کہ وہ کثیر الدوران نہیں ہے،

رکعات اخیرہ ثالثہ ورابعہ میں پڑھا ہی نہیں جاتا اور جن رکعتوں میں پڑھا بھی جاتا ہے وہ ایک نہیں ہے؛ اس لئے وہ کثیر الدوران نہیں ہے، کبھی کوئی سورت اور کبھی کوئی سورت دوسری ہے، کبھی کوئی آیت کبھی دوسری آیت؛ اس لئے مازاد کے پڑھنے کی وجہ سے امام کے ساتھ منازعت اور مخالجت پائی جائے گی، پس امام کا مازاد کو بھول جانا ضروری ہوگا، بخلاف فاتحہ کہ اس میں کثیرۃ الدوران ہونے کی بناء پر مخالجت اور نسیان نہ ہوگا؛ اس لئے مازاد امام کے پیچھے مت پڑھو، البتہ فاتحہ کی اجازت ہے، پس استثناء ام القرآن کا کیا گیا، جس کی اباحت لفظ "إلاّ بام القرآن" سے کی گئی تھی، "لأن الاستثناء من النهي إباحة كماصرح به الأصوليون". بہرحال ابتداء حدیث میں امام کے پیچھے پڑھنے سے نہی کی گئی اور استثناء کرکے أم القرآن کو مباح کردیا گیا، پھر فإنه سے اس اباحت کی علت ذکر کردی گئی کہ ہر نماز میں فاتحہ اور مازاد پائی جاتی ہے تو فاتحہ کثیر الدوران او رغیر مفضی الی المنازعت والمخالجت ہوئی اور مازاد کثیر الدوران نہ ہوئی؛ اس لئے باعث مخالجت ہوگی، اس تقریر پر جملہ "فإنه لاصلاة إلابفاتحة الكتاب" سے فرضیت فاتحۃ الکتاب اور انشا حکم نکالنا بالکل غلط اور اور حدیث کو مہمل بنانا ہے، جس کا منشاء حدیث کا اختصار مخل ہے، اگر اس حدیث کا صدر حذف نہ کیا جاتا، یا کم از کم لفظ "فإنه" ہی حذف نہ ہوتا تو اس قدر خلل نہ ہوتا، یہی وجہ ہے کہ روایت بالمعنی اور اختصار روایت میں تفقہ کی اشد ضرورت سمجھی گئی، جس کا اقرار خود محدثین کو بھی ہے۔ (دیکھو نخبۃ الفکر)

(تاہم) جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اس حکم کے بعد فاتحہ میں بھی مخالجت محسوس ہوئی تو پھر اس کو بھی منع کیا گیا، جیسا کہ روایات حضرت جابر اور ابن اکیمہ وغیرہ دلالت کرتی ہیں۔

(مکتوبات: ۵۳/۳-۵۵) (فتاوی شیخ الاسلام: ۳۵-۳۶)

☆ **فاتحہ خلف الامام:**

سوال: حافظ صاحب نے یہ ایجاد کیا ہے کہ بلا سورۃ فاتحہ کے نماز نہ ہوگی نماز سری ہو یا جہری، کل مصلی سخت پریشان ہیں، اس کے بارہ میں جو ثبوت ہو مدلل ارقام فرماویں اور جو کتاب در بارۂ مسئلہ ہذا میں ہو اطلاع فرمادیں؟

الجواب

حنفیہ کے مذہب میں بدون سورۂ فاتحہ پڑھنے کے مقتدی کی نماز درست ہے، بلکہ حنفیہ کے نزدیک مقتدی کو امام کے پیچھے سورۂ فاتحہ پڑھنا مکروہ ہے، خواہ نماز سری ہو یا جہری، (قال محمد: لا قراءة خلف الإمام فيما جهر فيه ولا فيما لم يجهر بذلك جاءت عامة الآثار وهو قول أبي حنيفة رحمه الله. (موطأ الإمام محمد، باب افتتاح الصلاة: ۶۰/۱، المكتبة العلمية. انيس) اس شخص نے جو مسئلہ بیان کیا ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ غیر مقلد ہے، مسلمانوں کو اس کے پیچھے نماز پڑھنے سے احتراز کرنا چاہئے۔

۴/رجب ۱۳۴۱ھ۔ (امداد الاحکام: ۱۸۰/۲)

سورہ فاتحہ پڑھنے پر آمین کہنا:

سوال: آمین آہستہ کہنا مسنون ہے یا جہر سے؟

الجواب

آمین آہستہ کہنا مسنون ہے حنفیہ کے نزدیک۔

”عن علقمة بن وائل عن أبيه أن النبی صلی الله عليه وسلم قرأ:”غير المغضوب عليهم ولا الضآلين“فقال:اٰمين وخفض بها صوته“.(۱)

ولما اختلف فی الحديث عدل صاحب الهداية إلٰی ما روی عن ابن مسعود رضی الله عنه أنه كان يخفی فإنه يفيد أن المعلوم منه عليه السلام الإخفاء،قلت:مع أنه الأصل فی الدعاء،لقوله تعالٰی:﴿ اُدْعُوْا رَبَّكُمْ تَضَرُّعاً وَّخُفْيَةً﴾ولاشک أن آمين دعاء فعند التعارض ترجح الإخفاء بذلک و بالقياس علٰی سائر الأذكار والأدعية ولأن آمين ليس من القرآن إجماعاً فلاينبغی أن يكون فيه صوت القرآن كما لايجوز كتابته فی المصحف.(۲)(فتاویٰ دار العلوم دیوبند:۲/۱۷۷)

آمین وغیرہ آہستہ کہنا چاہئے:

سوال: اگر کوئی مقتدی حنفی ”آمين بالجهر“ کہے یا ”ربنا لک الحمد“ بلند آواز سے کہے تو نماز اس کی بلا کراہت جائز ہے یا نہیں؟

الجواب

قال فی الدر المختار فی بيان سنن الصلاة:(والثناء والتعوذ والتسمية والتأمين)وكونهن(سرًا،إلخ) (۳)

---

(۱) سنن الترمذی،باب ماجاء فی التأمين: ۵۸،(رقم الحديث: ۲۴۸،انيس)/كذا فی سنن الدارقطنی،باب التأمين فی الصلاة بعد فاتحة الكتاب والجهربها: ۱/۱۲۸، رقم الحديث: ۱۲۷۰،انيس)

(۲) وأمن اللإمام سرًا كمأموم ومنفرد.(الدرالمختارعلٰی هامش رد المحتار،باب صفة الصلٰوة: ۱/۴۵۹، ظفير (فروع قرأ بالفارسية أو التوراة أو الإنجيل،انيس)

عن إبراهيم قال:أربع يخفيهن الإمام:بسم الله الرحمن الرحيم،والإستعاذة وآمين وإذا قال:سمع الله لمن حمده،قال:ربنالک الحمد.(مصنف عبدالرزاق،طاط مايخفی الإمام(ح:۲۵۹۶)/كذا فی كتاب الآثار لمحمد بن الحسن الشيبانی،باب الجهر ببسم الله الرحمن الرحيم (ح:۸۳)انيس)

(۳) الدرالمختارعلٰی هامش رد المحتار،باب صفة الصلاة،مطلب فی سنن الصلاة: ۱/۴۴۳،ظفير
وفيه أيضاً:وكذا فی التسميع والسلام وأماالمؤتم والمنفرد فيسمع نفسه،إلخ.(أيضاً،ظفير)
وفيه أيضاً:ترک السنة لايوجب فسادًا ولاسهوًا بل إساءةً الخ وقالوا: الإساءة أدون من الكراهة.(أيضاً: ۱/۴۴۲،ظفير)

فی الشامی: الإساء ة أفحش من الکراہۃ، إلخ. (۱)

ان سب روایات سے معلوم ہوا کہ ”جہر بالتأمین و التحمید“ عند الحنفیہ خلاف سنت ہے اور مرتکب اس کا مسیئ ہے۔ فقط (فتاویٰ دار العلوم دیوبند: ۲/۱۹۷-۱۹۸)

آمین آہستہ یا بلند آواز سے کہنا:

سوال: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا نماز میں آمین آہستہ کہنا یا خدا تعالیٰ و رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا آمین بالجہر سے منع کرنا (ثابت ہے یا نہیں)؟

الجواب

اخفا آمین کا حکم اولاً قرآن شریف سے مفہوم ہوتا ہے: ﴿اُدْعُوْا رَبَّكُمْ تَضَرُّعاً وَّ خُفْيَةً﴾ (۲)

اور حدیث کے الفاظ ”وخفض وأخفٰی به صوته“ (۳) وغیرہ وارد ہیں، جو نص میں اخفا آمین پر اور روایت ابن مسعود رضی اللہ عنہ جو ہدایہ میں مذکور ہے، وہ بھی اخفا آمین پر دال ہے، (۴) اور شرح منیہ میں حضرت وائل رضی اللہ عنہ کی روایت بھی اخفاء آمین کے سنت ہونے میں مذکور ہے۔ (۵) (فتاویٰ دار العلوم دیوبند: ۲/۱۸۵-۱۸۶)

آمین بلند آواز سے پکارنے کی تحقیق:

سوال: آمین بلند آواز سے پکارنا از روئے قرآن وحدیث وفعل صحابہ رضی اللہ عنہم درست ہے یا نہیں؟

الجواب

آمین میں اخفاء مسنون ومستحب ہے، اگرچہ پکار کر کہنے سے بھی نماز ہو جاتی ہے؛ لیکن طریق سنت یہ ہے کہ آمین کو آہستہ کہا جائے؛ لأنه دعاء وقال اللّٰه تعالٰی: ﴿اُدْعُوْا رَبَّكُمْ تَضَرُّعاً وَّ خُفْيَةً﴾ (۶)

والأحادیث متعارضة فتعین المصیر إلی الأصل وهو الإخفاء. (فتاویٰ دار العلوم دیوبند: ۲/۱۸۷)

(۱) رد المحتار، باب صفة الصلاة، مطلب فی سنن الصلاة: ۱/۴۴۲، ظفیر (فی قولهم الإساءة دون الکراهة، انیس)

(۲) سورة الأعراف: ۵۵، الرکوع: ۷، ظفیر

(۳) دیکھئے: آثار السنن، باب ترک الجهر بالتأمین (ص: ۱۴۳، رقم الحدیث: ۳۸۴، أبواب صفة الصلاة، مکتبة البشریٰ باکستان. انیس)

(۴) لقول ابن مسعود رضی اللّٰه عنه: أربع یخفیهن الإمام وذکر من جملتها التعوذ والتسمیة وآمین. (الهدایة، باب صفة الصلوٰة: ۱/۹۶، ظفیر)

(۵) شرح منیة المصلی، باب صفة الصلاة: ۳۰۹، مطبع سنده. انیس

(۶) سورة الأعراف: ۵۵، الرکوع: ۷، ظفیر

آمین بالجہر وبالسر کی تحقیق:

سوال: آمین بالجہر اور بالاخفا میں تحقیق کیا ہے؟ اور اگر غیر مقلدین آمین بالجہر کہیں تو حنفیوں کی نماز میں کچھ خلل آتا ہے یا نہیں؟ اور اس بارے میں حنفیوں اور غیر مقلدین میں ہمیشہ جھگڑا رہتا ہے، حنفیہ کہتے ہیں کہ مسجد بانٹ دی جاوے، غیر مقلدین ہماری مسجد میں نہ آویں اور غیر مقلدین کہتے ہیں کہ مسجدیں نہ بانٹی جاویں، اس صورت میں کیا حکم ہے؟

الجواب______________________

حنفیہ کا مذہب یہ ہے کہ آمین کو آہستہ کہنا چاہئے فقہا حنفیہ اخفا آمین کو مسنون فرماتے ہیں اور حدیث میں اخفا آمین بھی وارد ہوا ہے۔ شرح منیہ میں ہے:

"وقد روىٰ أحمد وأبويعلىٰ الطبرانی والدارقطنی والحاکم فی المستدرک من حديث شعبة عن سلمة بن كهيل عن حجربن العنبس عن علقمة بن وائل عن أبيه رضی الله عنه: أنه صلّٰى مع رسول الله صلی الله عليه وسلم فلما بلغ "غير المغضوب عليهم ولا الضآلين" قال: اٰمين وأخفىٰ بها صوته.

وقال الشافعی وأحمد: يجهر الإمام والمأموم بآمين، لماروى ابن ماجة "كان عليه الصلوٰة والسلام إذا تلا "غير المغضوب عليهم ولاالضآلين" قال اٰمين حتىٰ يسمع من فی الصف الأول فيرتج المسجد". قلنا: تعارض روايتا الجهر والإخفاء فی فعله فيرجح الإخفاء بإشارة قوله "فإن الإمام يقولها" وبأنه الأصل فی الدعاء وآمين دعاء فإن معناه استجب" إلخ. (۱)

اس عبارت سے واضح ہے کہ علما حنفیہ حدیث اخفا آمین کو ترجیح دیتے ہیں اور ان کے نزدیک سنت اخفا آمین ہے، مگر چونکہ مسئلہ مختلف فیہا ہے، لہٰذا حنفیہ کو بھی تعصب نہ کرنا چاہئے، غیر مقلدین کے آمین بالجہر کہنے سے حنفیوں کی نماز میں کچھ خلل نہیں آتا؛ لیکن غیر مقلدوں کو بھی تعصب نہ کرنا چاہئے، ہرگاہ اخفا آمین بھی حدیث شریف میں وارد ہے اور وہ راجح بھی ہے تو اپنے خیال پر ہٹ کیوں کرتے ہیں، رہا یہ کہ حنفیہ کی مسجدوں میں غیر مقلدین کا آنا اگر موجب فساد وفتنہ ہو تو ان کو روک دیا جائے کہ حنفیوں کی مسجدوں میں نماز نہ پڑھیں، جیسا کہ روافض کو روک سکتے ہیں۔ (۲) فقط (فتاویٰ دارالعلوم دیوبند: ۲/۲۱۰-۲۱۱)

---

(۱) **غنية المستملی، باب صفة الصلاة: ۳۰۲، ظفير**

حديث شعبة رواه أبوداؤد الطيالسی، حديث وائل بن حجر عن النبی صلی الله عليه وسلم (ح: ۱۱۱۷)/ الإمام أحمد فی المسند، حديث وائل بن حجر (ح: ۱۸۸٤۳)/ الإمام الترمذی فی سننه، باب ماجاء فی التأمين (ح: ۲٤۸)/ الطبرانی فی المعجم الكبير، حجر بن العنبس عن علقمة بن وائل عن وائل بن حجر (ح: ۳)/ الدارقطنی، فی السنن باب التأمين فی الصلاة بعد فاتحة الكتاب (ح: ۱۲۷۰)/ الحاکم فی المستدرک، من كتاب قراء ات النبی صلی الله عليه وسلم (ح: ۲۹۱۳) وقال: هذا حديث صحيح شرط الشيخين ولم يخرجا وصححه الذهبی

(۲) اگر غیر مقلدین اپنے طریقہ پر نماز پڑھتے ہیں اور زور سے آمین کہتے ہیں، مگر اس کی وجہ سے کوئی فتنہ نہیں ہوتا ہے تو مسجد میں آنے سے روکنا جائز نہیں ہے۔ انیس

آمین بالسرّ کی حدیث کس درجہ کی ہے:

سوال: مخالفین کہتے ہیں کہ احادیث 'آمین بالخفاء' معلول ومجروح ہوئی ہیں، لہٰذا 'آمین بالجہر' کہنا اولیٰ ہے اور کہتے ہیں کہ خود حنفیہ نے کہا ہے کہ 'آمین بالجہر' احادیث قویہ سے ثابت ہے، اس اعتراض کا کیا جواب ہے؟ امید کہ کوئی حدیث قوی تحریر فرماویں اور باعث ترجیح بھی تحریر فرماویں؟

الجواب

حدیثیں دونوں طرح کی موجود ہیں، یعنی اخفا وجہر دونوں قسم کی احادیث موجود ہیں؛ لیکن احادیث اخفا کو ترجیح ہے بسبب قول اللہ تعالیٰ کے: ﴿اُدْعُوْا رَبَّكُمْ تَضَرُّعاً وَّخُفْيَةً﴾ (الأية)(۱) اور حدیث صحیح بھی موجود ہے: "إنكم لاتدعون أصم ولا غائباً". (۲)

اور فرمایا ابن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے: "أربع يخفيهن الإمام وذكر من جملتها التعوذ والتسمية وآمين". (۳) فقط (فتاویٰ دارالعلوم دیوبند: ۱۸۹/۲) ☆

(۱) سورة الأعراف: ٥٥، الركوع: ٧، ظفير

(۲) مشكاة المصابيح، باب ثواب التسبيح، الفصل الأول: ٢٠١، ظفير (كتاب الدعوات، رقم الحديث: ٢٣٠٣، المكتب الإسلامی/صحيح البخاری، باب ما يكره من رفع الصوت فی التكبير (ح: ٢٩٩٢) انيس)

(۳) الهداية، باب صفة الصلوٰة: ٩٦، ظفير

☆ **آمین بالجہر اور رفع یدین سنت ہے یا نہیں:**

سوال: آمین بالجہر اور رفع یدین سنت ہے کہ نہیں؟

الجواب

حنفیہ کے نزدیک یہ سنت نہیں، بلکہ آہستہ آمین کہنا اور رفع یدین نہ کرنا سنت ہے۔ (وأمّن سرًّا، الخ، ولا يسن رفع يديه إلا فی تكبيرة الافتتاح، الخ. (الدر المختار علی هامش رد المحتار، باب صفة الصلوٰة، ظفير) (فتاویٰ دارالعلوم دیوبند: ۱۹۶/۲)

آمین بالجہر جائز ہے یا نہیں:

سوال: آمین آواز سے کہنا کیسا ہے؟

الجواب

آمین بالجہر حنفیہ کے نزدیک مسنون نہیں ہے۔ (والثناء والتعوذ والتسمية والتأمين وكونهن سرًا. (الدر المختار) "جعل سرًا خبرًا لكون المحذوف ليفيد أن الإسرار بها سنة أخرىٰ. (ردالمحتار: ٤٤٤/١، ظفير (باب صفة الصلاة، سنن الصلاة، مطلب: فی التبليغ خلف الإمام، انيس)) جیسا کہ قرآن شریف میں ہے: ﴿اُدْعُوْا رَبَّكُمْ تَضَرُّعاً وَّخُفْيَةً﴾ (سورة الأعراف: ٥٥، الركوع: ٧، ظفير) فقط (فتاویٰ دارالعلوم دیوبند: ۲۵۶/۲)

آمین بالجہر:

سوال: آمین حدیث شریف سے جائز ہے یا نہیں؟

الجواب ــــــــــــ حامداً و مصلیاً

اس کے متعلق حدیثیں دونوں قسم کی ہیں، بعض میں بالجہر ہے، بعض میں بالسر۔(۱)

امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ تعالیٰ، امام مالک رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ آمین بالسر کہا جائے۔ امام احمد رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ آمین بالجہر کہی جائے، امام شافعی رحمہ اللہ تعالیٰ کے دو قول ہیں: قول قدیم امام احمد کے موافق ہے، قول

== آمین بالجہر درست ہے یا نہیں:

سوال: مسلمانان حنفی نے پیش امام سے سوال کیا کہ کیا ہم حنفی بھی آمین بآواز بلند کہہ سکتے ہیں یا نہیں، تو امام صاحب نے فرمایا کہ ہاں کہہ سکتے ہو۔ کیا ہم کہہ سکتے ہیں؟

الجواب ــــــــــــ

یہ جواب اس امام کا صحیح نہیں ہے، جبکہ عندالحنفیہ آمین کو آہستہ کہنا اور اخفا کرنا سنت ہے تو امر خلاف سنت کا امر کرنا امام مذکور کو درست نہیں ہے اور حنفیوں کو یہ حکم ماننا اس امام کا درست نہیں ہے، بلکہ آمین آہستہ کہنا چاہئے، جیسا کہ آیت: ﴿ اُدْعُوْا رَبَّکُمْ تَضَرُّعاً وَّ خُفْيَةً ﴾ (سورة الأعراف: ۵۵، الرکوع: ۷، ظفیر) اور حدیث اخفا آمین سے ثابت ہے، (عن وائل بن حجر رضی اللّٰہ عنه قال صلّٰی بنا رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیه وسلم فلما قرأ ﴿غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ وَلاَ الضَّآلِّيْنَ﴾ قال "آمین" وأخفیٰ بها صوته. رواہ أحمد. (آثار السنن، باب ترک الجهر بالتأمین، الجزء الأول: ۹۶، ظفیر (أبواب الصلاۃ، رقم الحدیث: ۳۸۴، مکتبة البشریٰ، پاکستان، انیس) اور آمین بالجہر کی تاویل کی گئی ہے کہ یہ بغرض تعلیم ہے، **کما ثبت عنه علیه السلام الجهر بالقراء ۃ فی بعض الصلوٰۃ التی یقرأ فیها سرًا**، یا محمول ہے ابتدا پر۔ فقط (فتاویٰ دارالعلوم دیوبند: ۳/۲۷۰)

(۱) عن وائل بن حجر رضی اللّٰہ تعالیٰ عنه قال: صلی بنا رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیه وسلم فلما قرأ غیر المغضوب علیهم ولا الضالین قال: "امین" وأخفی بها صوته". (مسند الإمام أحمد بن حنبل: ۴۱۳/۵، دار الإحیاء التراث العربی/ و آثار السنن، باب ترک الجهر بالتأمین: ۱۲۴، مکتبة إمدادیة، ملتان)

"عن أبی هریرة رضی اللّٰہ تعالیٰ عنه قال: "إذا أمن الإمام فأمنوا، فإنه من وافق تأمینه تأمین الملائکه، غفر له ماتقدم من ذنبه". قال ابن شهاب: وکان رسول اللّٰہ تعالیٰ علیه وسلم یقول: "آمین". (صحیح البخاری، کتاب الأذان، باب الجهر الأمام بالتأمین، ۱۰۸/۱، رقم الحدیث: ۷۸۰، انیس)

"عن جهر بن عنبس عن وائل بن حجر رضی اللّٰہ تعالی عنه قال: سمعت النبی صلی اللّٰہ تعالیٰ علیه وسلم قرأ ولا الضالین فقال: "آمین" یمد بها صوتها". (مسند الإمام أحمد بن حنبل: ۴۱۲/۵، رقم الحدیث: ۱۸۳۶۳، در إحیاء التراث العربی، بیروت)

جدید امام ابوحنیفہ اور امام مالک رحمہم اللہ تعالیٰ کے موافق ہے۔(۱) فقط واللّٰہ سبحانہ وتعالٰی أعلم وأتم وأحکم

حررہ العبد محمود گنگوہی عفا اللہ عنہ، معین المفتی مدرسہ مظاہر علوم سہارن پور۔۱۴/۱۲/۱۳۵۴ھ

صحیح: عبداللطیف عفی عنہ، مدرسہ مظاہر علوم۔۱۵/ ذی الحجہ/۱۳۵۴ھ، سعید احمد غفرلہ۔(فتاویٰ محمودیہ:۵/۵۹۶۔۵۹۷) ☆

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ سے آمین بالجہر وبالاخفاء ثابت ہے یا نہیں:

سوال: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہؓ سے آمین بالجہر وآمین بالاخفاء ثابت ہے یا نہیں؟

(۱) ”قال سرًا، هٰذا هو قول مالک فی روایة عنه، والشافعی فی قوله الجدید: إن المنفرد والإمام والماموم کل منهم یسر بآمین جهریة کانت الصلوٰة أو سریة، اهـ ... وذهب الشافعی فی المشهور عنه المختار عند جمهور أصحابه وأحمد وعطاء وغیرهم إلٰی أن الجهر للإمام فی الجهریة مسنون إلخ “. (السعایة فی کشف ما فی شرح الوقایه، کتاب الصلوٰة، صفة التأمین: ۲/۱۷۵، سهیل اکیڈمی لاهور)

”وقال مالک: یؤمن بالمقتدی فقط سرًا، وهٰکذا مروی عن أبی حنیفة رحمه اللّٰه تعالٰی فی مؤطا محمد، والروایة الثانیة عن أبی حنیفة وهو مختار صاحبیه أن یأتی به الإمام والمقتدی سرًا والقول القدیم للشافعی رحمه اللّٰه تعالٰی أن یجهر الإمام ویسر القوم وفی الجدید جهرهما به، وبه قال أحمد بن حنبل رحمه اللّٰه تعالٰی ولم أجد تصریح الجهر عن المالک بل صرح فی المدونة بالأخفاء“. (فتح الملهم شرح الصحیح لمسلم، کتاب الصلوٰة، باب التسمیع و التمحید والتأمین: ۲/۴۹، المکتبة الرشیدیة، کراتشی)

☆ **آمین بالجہر:**

سوال: امام کے پیچھے آمین بلند آواز سے کہنا چاہئے یا نہیں؟

الجواب ــــــــــــــــــــ حامداً ومصلیاً

امام کے پیچھے مقتدیوں کو اور خود امام کو آمین آہستہ کہنا چاہئے۔

”عن وائل بن حجر رضی اللّٰه تعالٰی عنه قال: صلٰی بنا رسول اللّٰه صلی اللّٰه علیه وسلم، فلما قرأ غیر المغضوب علیهم ولا الضالین قال: ”آمین“ وأخفٰی بها صوته“. (رواه الإمام أحمد والترمذی) (آثار السنن: ۱/۹۶)

(آثار السنن، باب ترک الجهر بالتأمین: ۱۲۴، مکتبة إمدادیة، ملتان/أبواب الصلاة، رقم الحدیث: ۳۸۴، مکتبة البشریٰ، پاکستان، انیس)/ومسند الإمام أحمد بن حمبل: ۵/۴۱۳، رقم الحدیث: ۱۸۳۷۵، دار أحیاء التراث العربی، بیروت/وسنن الترمذی، أبواب الصلوٰة، باب ماجاء فی التأمین: ۱/۵۸، سعید)

”وأمن الإمام سرًا کمأموم ومنفرد ولو فی السریة إذا سمعه ولو من مثله فی نحو جمعة وعید“. (الدر المختار، کتاب الصلاة، باب صفة الصلاة، فصل فی بیان تألیف الصلاة: ۱/۴۹۲، سعید)

”إذا فرغ من الفاتحة قال: آمین والسنة فیه الإخفاء، کذا فی المحیط“. (الفتاوی الهندیة، کتاب الصلاة، الباب الرابع، الفصل الثانی فی بیان سنن الصلاة وآدابها وکیفیتها: ۱/۷۴، رشیدیة) (فتاویٰ محمودیہ:۵/۵۹۵۔۵۹۶)

الجواب

احادیث میں آمین بالجہر اور آمین بالاخفاء دونوں مروی ہیں اور ائمہ مجتہدین میں بعض نے آمین بالجہر کو راجح فرمایا ہے اور بعض نے آمین بالسرّ کو راجح فرمایا۔(۱)

چنانچہ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ آمین بالسرّ کو سنت فرماتے ہیں اور آمین بالجہر کو تعلیم اور ضرورت پر محمول فرماتے ہیں، جیسا کہ بعض اوقات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز سری میں کوئی آیت جہر سے پڑھی کہ مقتدیوں کو معلوم ہو جائے کہ آپ فلاں سورت پڑھ رہے ہیں اور امام ابوحنیفہؒ کے مذہب کی تائید آیت قرآنی سے بھی ہوتی ہے: ﴿اُدْعُوْا رَبَّکُمْ تَضَرُّعاً وَّخُفْیَةً﴾ والبحث فيه طويل فاكتف على هذا الدليل. (فتاویٰ دارالعلوم:۲/۲۶۲-۲۶۳)☆

(۱) عن وائل بن حجر رضي الله عنه قال: كان رسول الله صلى الله عليه وسلم إذا قرأ: ﴿وَلاَ الضَّآلِّيْنَ﴾ قال: "آمين" رفع بها صوته، رواه أبوداؤد والترمذي وآخرون، وهو حديث مضطرب.

وعن أبي هريرة رضي الله عنه قال: كان النبي صلى الله عليه وسلم إذا فرغ من قراءة أم القرآن رفع صوته وقال: آمين. رواه الدارقطني والحاكم، وفي إسناده لين -(آثار السنن، باب الجهر بالتأمين :۱/۹۲،۹۳)(أبواب صفة الصلاة، حديث نمبر:۳۷۷،۳۷۸، مكتبة البشرىٰ، پاکستان، انیس)

قال عطاء: آمين وقد قال الله تعالىٰ: ﴿اُدْعُوْا رَبَّكُمْ تَضَرُّعاً وَّخُفْيَةً﴾ (قال عطاء: آمين دعا. (صحيح البخاري، باب جهر الإمام بالتأمين: ١/١٥٦، دارطوق النجاة. انیس)

عن أبي هريرة قال: كان رسول الله صلى الله عليه وسلم يعلمنا، يقول: لاتبادروا الإمام، إذا كبّر فكبّروا، وإذا قال: ﴿وَلاَ الضَّآلِّيْنَ﴾ فقولوا: آمين، وإذا ركع فاركعوا، إلخ. رواه مسلم.

قال النيموي: يستفاد منه أن الإمام لايجهر بآمين، (رقم الحديث: ٣٨١، انیس)

وعن وائل بن حجر رضي الله عنه قال: صلى بنا رسول الله صلى الله عليه وسلم فلما قرأ ﴿غير المغضوب عليهم ولا الضالين﴾ قال آمين وأخفى بها صوته... (رواه أحمد والترمذي وأبوداؤد... وآخرون، وإسناده صحيح، وفي متنه اضطراب. (آثار السنن، باب ترك الجهر بالتأمين: ١/٩٤، (أبواب صفة الصلاة، مكتبة البشرىٰ، رقم الحديث: ٣٨٤، پاکستان، انیس) تفصیل مذکورہ کتاب میں ملاحظہ فرمائیں۔ظفیر)

☆ مسائل مختلف فیہا کے متعلق سوال:

سوال: آمین بالجہر اور فاتحہ خلف الامام اور رفع یدین حنفیہ کے نزدیک جائز ہے یا نہیں؟ اور ان مسائل میں حنفیہ کے دلائل کیا ہیں؟

الجواب

آمین بالجہر اور فاتحہ خلف الامام اور رفع یدین عندالحنفیہ جائز (بہتر) نہیں ہے اور دلائل ان مسائل کے حنفیہ کے پاس بہت ہیں اور آیات واحادیث اس بارہ میں موجود ہیں، و بہت سی کتابوں اور رسالوں میں شائع ہو چکی ہیں، آمین کے بارے میں "وأخفى بها صوته" (غنية المستملي: ٣٠٢) وارد ہے اور قرأت خلف الامام کی ممانعت میں "وإذا قرأ فأنصتوا" مسلم کی روایت میں موجود ہے۔(مسلم شریف:۱/۱۷۴)

==

آمین بالجہر، رفع یدین میں اختلاف اَولوِیت کا ہے:

سوال: آج تک بعض علماءِ دین سے قرأت خلت الامام، رفع یدین، آمین بالجہر وغیرہ مختلف فیہ مسائل کے بارے میں ہم لوگ یہ سنتے تھے کہ اس میں قرأت خلف الامام کے علاوہ باقی تمام مسائل میں اختلاف اولویت وغیر اولویت میں ہے؛ لیکن شامی میں بحوالہ مکحول امام اعظم رحمہ اللہ تعالی سے منقول ہے کہ رکوع میں جاتے ہوئے اور رکوع سے اٹھتے ہوئے رفع یدین کرنے سے نماز فاسد ہوجاتی ہے، نیز اسی جگہ تحریر ہے کہ مکروہ ہے،(۱) لفظ ''مکروہ'' مطلقاً ہے، جس سے ذہن میں تبادر مکروہ تحریمی کی طرف ہوتا ہے۔ صحیح نوعیت بیان فرمائی جائے؟

الجواب ــــــــــــــــ حامداً و مصلیاً

امام جصاص رازی (۲) وسرخسی رحمہما اللہ وغیرہ نے اس کو اختلاف اولویت ہی قرار دیا ہے، مفسد صلوۃ قرار نہیں دیا،

== اور رفع یدین کے بارہ میں حدیث ابن مسعود رضی اللہ عنہ ترمذی وغیرہ میں مذکور ہے:

''قال لنا ابن مسعود: ألا أصلی بکم صلاۃ رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم؟(فصلیٰ) ولم یرفع یدیہ إلا مرۃ واحدۃ مع تکبیر الافتتاح''. (مشکاۃ المصابیح، باب صفۃ الصلاۃ: ۷۷، ظفیر (الفصل الثالث، رقم الحدیث: ۸۰۹، المکتب الإسلامی، انیس) فقط (فتاویٰ دار العلوم دیوبند: ۲/۲۱۲)

☆ رفع الیدین، آمین بالجہر وغیرہ اختلافی مسائل میں صحابہ سے اختلاف آرہا ہے:

سوال: محترم جناب مفتی صاحب: میں بطور ایک محقق دین عرض کرتا ہوں کہ آپ روز قیامت اللہ تعالیٰ کے دربار میں اپنی پیشی کو ملحوظ رکھتے ہوئے صحیح ترین سند کے ساتھ جواب سے مشکور فرمالیں کہ رفع الیدین عند الرکوع کرنے اور آمین بالجہر کے دلائل زیادہ قوی ہیں، یا نہ کرنے کی؟ بینوا توجروا۔

(المستفتی: امان اللہ حلیم، میڈیکوز یونیورسیٹی ٹاؤن پشاور......۲/ جون/ ۱۹۷۵ء)

الجوابــــــــــــــــ

محترم المقام دامت برکاتہم!

وعلیکم السلام کے بعد واضح رہے کہ ان مسائل میں قرن صحابہ سے اختلاف آرہا ہے، لہٰذا ان میں حق عند اللہ کا تعین مشکل؛ بلکہ ناممکن ہے، ان میں سے ہر مذہب حق عندأھلہ ہے، باقی جو شخص علم تفسیر اور علم حدیث سے باقاعدہ خبردار نہ ہو اور کسی امام کا مقلد بھی نہ ہو، وہ شیطان کا شکار ہوجاتا ہے۔ وھو الموفق (فتاویٰ فریدیہ: ۲/۲۳۳)

(۱) قولہ: (إلا فی سبعۃ) إشارۃ إلی أنہ لا یرفع عند تکبیرات الانتقالات، خلافاً للشافعی وأحمد، فیکرہ عندنا، ولا یفسد الصلاۃ إلا فی روایۃ مکحول عن الإمام. (رد المحتار، کتاب الصلاۃ، باب صفۃ الصلاۃ، آداب الصلاۃ، فصل فی بیان تألیف الصلاۃ، مطلب: فی إطالۃ الرکوع للجائی: ۱/۵۰۶، سعید)

(۲) ''وأما ما لیس بفرض فھم یخیرون فی أن یفعلوا ماشاؤا منہ، وإنما الخلاف بین الفقھاء فیہ فی الأفضل منہ''. (أحکام القرآن للجصاص تحت آیۃ: ﴿یأیھا الذین اٰمنوا کتب علیکم الصیام﴾. (البقرۃ: ۱۸۳) الآیۃ. باب کیفیۃ شھر والشھر: ۱/۲۰۴، دار الکتاب العربی، بیروت)

یہی روایت امام صاحب کی روایت مشہورہ متواترہ ہے، روایت مکحول اس کے مقابلہ میں قابل احتجاج نہیں۔ علامہ شامی نے روایت مرفوعہ نقل کی ہے، اس سے نماز باطل ہو جاتی ہے، (۱) مگر ملا علی قاری (۲) اور علامہ پٹنی نے اس کو موضوع لکھا ہے، (۳) اس لئے نہ یہ روایت سند صحیح سے ثابت ہے، نہ امام اعظم کی طرف اس کی نسبت سند صحیح سے ثابت ہے۔ مکروہ کے متعلق تحقیق یہ ہے:

"وإذا ذكروا مكروهاً فلابد من النظر فى دليله". (شامی) (۴)

اس لئے مکروہ تحریمی قرار دینا دشوار ہے۔ فقط واللہ تعالیٰ اعلم

حررہ العبد محمود غفرلہ، دار العلوم دیوبند۔ ۱۳۸۷/۶/۲ھ۔

الجواب صحیح: بندہ نظام الدین عفی عنہ، دار العلوم دیوبند۔ ۸۷/۶/۲ھ۔ (فتاویٰ محمودیہ: ۵/ ۵۹۷-۵۹۹)

آمین بالجہر سے دوسروں کی نماز پر اثر:

سوال: ہم حنفیوں کی جماعت میں اہل حدیث مسلک کے لوگ شریک نماز ہو کر الحمد کے بعد آمین بالجہر اپنے طریقہ کے مطابق بلند آواز سے کہتے ہیں، کیا بلند آواز سے کہنے سے ہماری نماز میں تو کوئی خرابی نہیں آئی اور ان کو مسجد میں آنے سے روکنے کا حق ہم لوگوں کو ہے کہ نہیں؟

الجواب ــــــــــــــ حامداً و مصلیاً

ان کے زور سے آمین کہنے کی وجہ سے حنفیوں کی نماز خراب نہیں ہوگی، اگر وہ کوئی فتنہ وفساد نہیں کرتے، مسجد میں آکر صرف اپنے طریقہ پر نماز پڑھتے ہیں تو ان کو مسجد میں آنے سے نہ روکیں نہ ان سے بحث کریں۔ فقط واللہ تعالیٰ اعلم

حررہ العبد محمود عفی عنہ، دار العلوم دیوبند۔ ۱۳۸۷/۶/۱۲ھ

---

(۱) قوله: (إلا فى سبعة) أشارة إلىٰ أنه لايرفع عند تكبيرات الانتقالات، خلافاً للشافعي وأحمد، فيكره عندنا، ولايفسد الصلوٰة إلا فى رواية مكحول عن الإمام. (رد المحتار: ۱/ ۵۰۶، باب صفة الصلاة، آداب الصلاة، مطلب فى إطالة الركوع للجائى، سعيد)

(۲) ومن ذلک أحاديث المنع من رفع اليدين فى الصلوٰة عند الركوع والرفع منه، كلها باطلة، لا يصح منها شيء. (الموضوعات الكبرىٰ للعلامة ملاعلى القارى، ص: ۳۵۴، قديمى)

(۳) تذكرة الموضوعات، باب الصلوٰة وإثم تاركها، والخشوع فيها، وتحقيقها، والصف الأول، والتنوير فى الفجر ورفع اليدين والبتيراء والسرقة فيها ونحو ذلک، ص: ۳۹، الإدارة المنيرية، مصر)

(۴) والعبارة بأسرها: "فحينئذٍ إذا ذكروا مكروهاً، فلابد من النظر فى دليله، فإن كان نهياً ظنياً يحكم بكراهة التحريم إلا لصارف للنهى عن التحريم إلىٰ الندب، فإن لم يكن الدليل نهيا بل كان مفيداً للترک الغير الجازم، فهى تنزيهية". (ردالمحتار: ۱/ ۱۳۲، كتاب الطهارة، مطلب فى تعريف المكروه وأنه قد يطلق على الحرام والمكروه تحريماً وتنزيهًا، سعيد)

جواب صحیح ہے؛ لیکن اہل حدیث حضرات کے نزدیک بھی بالجہر آمین کہنا ضروری نہیں ہے، بلکہ صرف اتنی آواز سے کہنا کافی ہے کہ پاس کا آدمی سن سکے، اس لیے بلا وجہ زور سے چیخنے کے بجائے جہر ادنی پر کفایت کرنی چاہئے اور حنفیوں کی رعایت کرنی چاہئے؛ کیونکہ اس چیخنے سے یقیناً حنفیوں کی توجہ نماز سے ہٹ کر اس آواز پر جائے گی، لہذا یہ طریقہ مذموم ومعیوب ہوگا۔ فقط

بندہ نظام الدین عفی عنہ، دار العلوم دیو بند۔۱۳/۶/۱۳۸۷ھ۔ (فتاویٰ محمودیہ: ۶۰۰/۵) ☆

مقتدیوں کی اطلاع کے لئے کسی کو آمین بالجہر کے لئے متعین کرنا:

سوال: امام صاحب بکر کو حکم دیتے ہیں کہ میری آواز دور تک نہیں جاتی، لہذا تم آمین زور سے (بالجہر) کہہ دیا کرو؛ تاکہ دوسرے لوگ اس کی آمین سن کر آمین کہیں، جو حنفی مسلک کے خلاف ہے، امام صاحب ضعیف آدمی ہیں۔ ایک مرتبہ انہوں نے بوجہ کثرت جماعت بکر کو کہا کہ تم آمین بالجہر کہنا؛ تاکہ باقی مقتدیوں کو پتہ چل جائے، لوگوں نے اس پر اعتراض کیا، امام صاحب نے جواب دیا کہ بکر بھی مقتدی ہے، اس کو آمین جہراً کہنا جائز ہے، تمام ائمہ رحمہم اللہ تعالیٰ میں اختلاف افضلیت میں ہے، احناف کے نزدیک سراً افضل ہے اور شوافع کے نزدیک جہراً افضل ہے، جیسا کہ اطلاع امام کے لئے سبحان اللہ کہنا شارع علیہ السلام سے ثابت ہے۔ اس پر عوام الناس شور مچایا ہے، امام صاحب غیر مقلد ہیں، حالانکہ امام صاحب نے آمین بالجہر کو نہ سنت موکدہ کہا ہے، نہ اس کے تارک کو مجرم اسلام کہا ہے؛ بلکہ ایک دفعہ واقعہ ہوا۔

الجواب ـــــــــــــــــــ حامداً و مصلياً

اس اطلاع کے لئے آمین بالجہر کہنے کی کیا ضرورت ہے، جب کہ حنفیہ کے نزدیک آمین آہستہ کہنا سنت ہے بالجہر سنت نہیں (۱) تو پھر بالجہر کہہ کر، یا کسی مقتدی سے کہلوا کر، شور وشغب کا دروازہ کھولنا قرین دانشمندی نہیں اور محض ایک مرتبہ آمین بالجہر کہنے سے مقتدیوں کا امام کو غیر مقلد کہنا بھی صحیح نہیں۔ فقط واللہ سبحانہ تعالیٰ اعلم

حررہ العبد محمود گنگوہی عفا اللہ عنہ، معین مفتی مدرسہ مظاہر علوم سہارنپور۔ صحیح: عبد الطیف، مدرسہ مظاہر علوم سہارنپور، ۱۴/شعبان/۱۳۶۴ھ۔ الجواب صحیح: سعید احمد غفرلہ، مفتی مدرسہ مظاہر علوم سہارنپور۔ (فتاویٰ محمودیہ: ۵۹۹/۵-۶۰۰)

☆ **جماعت میں غیر مقلد کے آمین بالجہر سے نماز کا حکم:**

سوال: ہم مذہب حنفی کے ہمراہ شامل صف نماز ہو کر کسی شخص کا پکار کے آمین کہنا ہمارے لئے موجب فساد نماز یا کراہت نماز ہے یا نہیں اگر باعث کراہت ہے تو کونسی کتاب میں لکھا ہے؟

الجوابـــــــــــــــــــ

فساد نہیں۔ فقط (فتاویٰ دار العلوم دیو بند: ۱۹۶/۲)

(۱) ”ویخفونها: أی یخفی الإمام والمقتدون آمین، لقول ابن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنه: ==

نماز میں آمین بالجہر اور رفع یدین:

سوال (۱) غیر مقلدین کے آمین بالجہر و رفع یدین سے مسجد کے اندر حنفیوں کی نماز خراب ہوتی ہے، یا نہیں؟

(۲) حنفیہ کہتے ہیں کہ آمین بالجہر مت کرو، یا مسجد میں نہ آؤ، ورنہ ماریں گے، یہ مطالبہ صحیح ہے، یا نہیں؟

(۳) آمین بالجہر کی وجہ سے مسجد سے نکالنا صحیح ہے، یا نہیں؟

(۴) غیر مقلد ہونے کی وجہ سے مسجد سے نکالنا درست ہے، یا نہیں؟

الجواب ــــــــــــــ وباللہ التوفیق

(۱) کسی مقتدی کے آمین بالجہر یا رفع یدین سے دوسروں کی نماز میں خرابی نہیں آتی۔(۱)

(۲) مسلکی فرق کی وجہ سے کسی کو مسجد سے نکالنا حرام ہے۔(۲)

(۳) آمین بالجہر کی وجہ سے کسی مسلمان کو مسجد سے نکالنا جائز نہیں ہے۔(۳)

(۴) غیر مقلد ہونے کی وجہ سے مسجد سے نکالنا درست نہیں۔(۴) فقط، واللہ تعالیٰ اعلم

محمد عثمان غنی۔۲۵/۵/۱۳۴۶ھ۔(فتاویٰ امارت شرعیہ: ۱۳۶/۲-۱۳۷)

== أربع يخفيهن الإمام : التعوذ والتسمية وآمين وربنا لك الحمد، آه". (الحلبي الكبير، باب صفة الصلاة: ۳۰۹، سهيل اكيڈمی لاهور)

"أن الإسرار بها سنة أخرى". (ردالمحتار: ۴۷۶/۱، كتاب الصلاة، باب صفة الصلاة، مطلب في التبليغ خلف الإمام، سعيد)

(۱) (و) لا يرفع يديه إذ (لايسن رفع اليدين) في حالتي الركوع وقيامه ولا يفسد الصلاة في الصحيح فلايسن (إلا عندافتتاح كل صلاة وعند تكبير القنوت في الوتر وتكبيرات الزوائد في العيدين) لاتفاق الأخبار، الخ. (مراقي الفلاح، فصل في كيفية تركيب الصلاة: ۱۰۷، المكتبة العصرية. انيس)

(۲-۴) ﴿وَمَنْ أَظْلَمُ مِمَّنْ مَّنَعَ مَسَاجِدَ اللّٰهِ أَنْ يُّذْكَرَ فِيْهَا اسْمُهٗ وَسَعٰى فِيْ خَرَابِهَا﴾ (سورة البقرة: ۱۱۴)

أي من ياتي إليها للصلاة والتلاوة والذكر وتعليمه. (فتح البيان في مقاصد القرآن، تفسير سورة البقرة: ۲۵۷/۱، المكتبة العصرية بيروت، انيس)

والمنع يكون من وجهين: أحدهما: بالقهر والغلبة والآخر: الاعتقاد والديانة والحكم؛ لأن من اعتقد من جهة الديانة المنع من ذكر الله في المساجد فجائز أن يقال فيه قد منع مسجداً أن يذكر فيه اسمه فيكون المنع هاهنا معناه الحظر كما جائز أن يقال منع الله الكافرين من الكفر والعصاة من المعاصي بأن حظر عليهم وأوعدهم على فعلها فلما كان اللفظ منتظما للأمرين وجب استعماله على الاحتمالين. (أحكام القرآن للجصاص، سورة البقرة: ۷۴/۱، دارالكتب العلمية بيروت. انيس)

رفع یدین کہاں ہے:

سوال: رفع یدین کرنا کیسا ہے؟

الجواب

رفع یدین سوائے تکبیر اولیٰ کے حنفیہ کے نزدیک منسوخ ہے اس واسطے کہ جلیل القدر صحابہؓ نہیں کرتے تھے۔

"عن البراء بن عازب رضی اللّٰہ عنه قال: کان النبی صلی اللّٰہ علیه وسلم إذا کبّر لافتتاح الصلٰوۃ، رفع یدیه، حتٰی یکون إبهاماہ قریباً من شحمتي أذنیه ثم لایعود. (۱)

عن الأسود قال: رأیت عمر بن الخطاب رضی اللّٰہ عنه یرفع یدیه فی أول تکبیرۃ، ثم لایعود ... قال أبوجعفر (الطحاوی): فهٰذا عمر رضی اللّٰہ عنه لم یکن یرفع یدیه أیضاً إلا فی التکبیرۃ الأولٰی فی هٰذا الحدیث، وهو حدیث صحیح، إلخ، وفعل عمر رضی اللّٰہ عنه هٰذا وترک أصحاب رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیه وسلم إیاہ علٰی ذلک، دلیل صحیح أن ذلک هو الحق الذی لاینبغی لأحد خلافه. (۲) (فتاویٰ دار العلوم دیوبند: ۲/۱۵۸-۱۷۷)

رفع یدین کی تحقیق:

سوال: رفع یدین کرنا از روئے قرآن وحدیث وفعل صحابہ رضی اللہ عنہم درست ہے یا نہیں؟

الجواب

رفع یدین سوائے تکبیر افتتاح کے منسوخ ہوگیا ہے، جیسا کہ روایت "کان فترک" اس پر دال ہے اور عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی حدیث میں ہے:

"وعن علقمة قال: قال لنا عبد اللّٰہ ابن مسعود رضی اللّٰہ عنه: ألا أصلی بکم صلٰوۃ رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیه وسلم؟ فصلٰی فلم یرفع یدیه إلا مرۃً واحدۃً مع تکبیرۃ الافتتاح. (۳)

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ آخر فعل آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا ترک رفع یدین ہے، سوائے تکبیر افتتاح کے۔

(فتاویٰ دار العلوم دیوبند: ۲/۱۸۷-۱۸۸)

---

(۱) شرح معانی الآثار، باب التکبیر للرکوع والتکبیر للسجود والرفع من الرکوع هل مع ذلک رفع أم لا: ۱/۱۳۲، ظفیر (کتاب الصلاۃ، رقم الحدیث: ۱۳٤٦، دار عالم الکتب، انیس)

عن کلیب الجرمی قال رأیت علی بن أبی طالب رفع یدیه فی التکبیرۃ الأولیٰ من الصلاۃ المکتوبة ولم یرفعهما فیما سوی ذلک. (موطأ الإمام محمد، باب افتتاح الصلاۃ (ح: ۱۰٥): ۱/٥۸، المکتبة العلمیة. انیس)

(۲) أیضاً: ۱/۱۳۳-۱۳٤، ظفیر (رقم الحدیث: ۱۳٦٤، دار عالم الکتب، انیس)

(۳) آثار السنن، باب ترک رفع الیدین فی غیر الافتتاح: ۱/۱۰۳ (ح: ٤۰۲، انیس) نیز دیکھئے: غنیة المستملی، صفة الصلٰوۃ: ۳۱٦، ظفیر)

رفع یدین، تکبیر تحریمہ کے علاوہ منسوخ ہے:

سوال: رفع یدین آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کس موقع پر کرنے کا حکم دیا تھا اور کب منع فرمایا تھا؟

(۲) آمین بالجہر کا کب حکم دیا تھا اور کب منع فرمایا تھا؟ (المستفتی: حکیم اللہ بخش بگڑا بنگال، ۲۹ جنوری ۱۹۲۸ء)

الجواب

(۱) رفع یدین ابتدا میں نماز شروع کرتے وقت اور رکوع میں جاتے وقت اور رکوع سے اٹھنے کے وقت اور دونوں سجدوں کے درمیان ہوتا تھا اور یہ سب صحیح روایتوں سے ثابت ہے، پھر سجدوں کے درمیان اور رکوع میں جانے اور رکوع سے اٹھنے کے مواقع میں سے منسوخ ہوگیا، نسخ کی تاریخیں معلوم نہیں، لیکن صحابہ رضی اللہ عنہ سے یہ ثابت ہوگیا کہ ان مواقع میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے رفع یدین نہیں فرمایا، جس کا مطلب یہ ہے کہ پہلے کرتے تھے، پھر (رفع یدین) چھوڑ دیا۔(۱)

(۲) آمین بالجہر کسی صحیح روایت سے ثابت نہیں ہے؛ اس لئے حنفیہ آمین بالاخفا کو مستحب سمجھتے ہیں۔(۲)

محمد کفایت اللہ غفرلہ۔ (کفایت المفتی: ۴۵۹/۹) ☆

(۱) وقد حدثني من لاأحصي عن عبد الله أنه رفع يديه في بدء الصلاة فقط وحكاه عن النبي صلى الله عليه وسلم و عبد الله عالم بشرائع الإسلام وحدوده متفقد لأحوال النبي صلى الله عليه وسلم ملازم له في الإقامة والسفر وقد صلّى مع النبي صلى الله عليه وسلم مالايحصى فيكون الأخذ به عند التعارض أولٰى من أفراد مقابله ومن القول بسنية الأمرين. (شرح فتح القدير : ۱/ ۳۱۲، ط:مصر)

(۲) وأمن الإمام سرًا كمأموم ومنفرد ولو في السرية إذا سمعه ولو من مثله في نحو جمعة وعيد، وأما حديث إذا أمن الإمام فأمنوا فمن التعليق بمعلوم الوجود فلايتوقف على سماعه منه بل يحصل بتمام الفاتحة بدليل إذاقال الإمام ولاالضالين فقولوا آمين. (الدرالمختارمع ردالمحتار : ۱/ ٤٩٢)دارالفكر بيروت. انيس)

☆ **رفع الیدین کی احادیث ہمارے نزدیک منسوخ ہیں:**

سوال: محترم مولانا صاحب! رفع الیدین کے بارے میں آپ کے فتویٰ نے مجھے سخت حیرت میں ڈال دیا، میں نے ثبوت میں بخاری ومسلم سے احادیث پیش کرنے کا کہا تھا لیکن آپ نے تعمیل کے لئے شرائط پیش کیں کہ جب تک قرآن وحدیث کا بڑا عالم یا کسی امام کا مقلد نہ ہو اور عمل کرے تو شیطان کا شکار ہوا ہے، بزرگو! میں نہ تو عالم دین ہوں اور نہ تقلید جانتا ہوں اب میں کیا کروں بخاری ومسلم کی احادیث سے صاف انکار کروں؟

(المستفتی: امان اللہ حلیم میڈیکوز یونیورسیٹی ٹاؤن پشاور......۱۷/جون/۱۹۷۵ء)

الجواب

محترم المقام دامت برکاتہم! السلام علیکم کے بعد واضح رہے کہ اگر آپ باقاعدہ عالم نہ ہوں تو ان مسائل میں عذر ظاہر کریں==

رفع یدین کے منسوخ ہونے کی دلیل کیا ہے:

سوال: رفع یدین سوائے سات جگہ کے جو منسوخ ہے اس کی کیا دلیل ہے؟

الجواب

رفع یدین سوائے سات جگہ کے منسوخ ہے۔

(دلیل):

"والدليل المجمل للكل ماروى عن النبى صلى الله عليه وسلم أنه قال: لاترفع الأيدى إلا فى

== اوراس کو کسی مقامی یا غیر مقامی عالم کے پاس روانہ کریں؛ تاکہ آپ کی تشفی ہوجائے۔محترم بخاری اور مسلم کی یہ احادیث منسوخ ہیں،(احادیث میں رفع الیدین اور ترک رفع الیدین دونوں کے متعلق روایات موجود ہے لیکن ترک رفع الیدین کے روایات ناسخ ہیں،منہاج السنن: میں ہے:

"إعلم أن ترك الرفع متواتر عملاً كالرفع،والبلاد قاطبة فيها الرافعون وفيها التاركون ماعداالكوفة فإنهم بأجمعهم تعاملوا بالترك وكذا بالترك كان تعامل أهل المدينة فى عهد مالك كما ينقله المالكية...فيحمل حديث ابن عمرعلى النسخ ويؤيده ترك الراوى العمل به كما فى رواية الطحاوى،وكذا يؤيدالنسخ كونه غير المفعول به فى المدينة المنورة فى عهد مالك وكذا ترك أكابر الصحابة وفقهاء هم مثل عمروعلى وابن مسعود العمل به.(منهاج السنن: ١٤٢/٢)

اس کے علاوہ یہ روایات صریحاً ترک رفع الیدین کے لئے دلیل ہےں:

(۱) عن علقمة قال:قال لنا عبدالله ابن مسعود ألا أصلى بكم صلاة رسول الله صلى الله عليه وسلم؟ فصلىٰ فلم يرفع يديه إلا مرة واحدة تكبيرة الافتتاح. (رواه الترمذى وأبو داؤدوالنسائى وهوحديث صحيح (آثارالسنن،أبواب صفة الصلاة،باب ترك رفع اليدين فى غيرالافتتاح: ١٠٤/١،رقم الحديث: ٤٠٢،انيس)

وفى التعليق: قلت: صححه ابن حزم وقال الترمذى: حديث ابن مسعود حديث حسن.(باب ترك رفع اليدين عند الركوع: ٥٩/١)

(۲) عن براء بن عازب قال أن رسول الله صلى الله عليه وسلم:"كان إذا افتتح الصلاة رفع يديه إلىٰ قريب من أذنيه ثم لا يعود(أبوداؤد: ١٠٩/١)(كتاب الصلاة،باب من لم يذكرالرفع عندالركوع،رقم الحديث: ٧٤٩،بيت الأفكار،انيس)

(۳) عن عبد الله بن عمرقال:رأيت رسول الله صلىٰ الله عليه وسلم إذاافتتح الصلاة رفع يديه حذومنكبيه وإذا أراد أن يركع وبعد ما يرفع رأسه من الركوع فلا يرفع ولا بين السجدتين.(مسندالحميدى : ٢٧٧/٢، أحاديث عبد الله بن عمر،رقم: ٦١٤)

ان میں صرف یہ ثابت ہے کہ پیغمبر علیہ السلام نے رفع الیدین کیا ہے ان میں یہ ثابت نہیں کہ تاحین وفات کیا ہے جیسا کہ نماز میں چلنا پھرنا باتیں کرنا معمول تھا۔وھوالموفق (فتاویٰ فریدیہ:۲۳۴/۲)

سبع مواطن،وعدّ منها تكبيرة الافتتاح وتكبيرة القنوت والعيدين وذكر الأربع في الحج،كذا في الهداية،ثم هذا عندنا.

وقال الشافعي رحمه الله:يرفع يديه عند الركوع والرفع منه،لأنه عليه السلام فعل ذلك، ولنا مارويناومارواه محمول على الابتداء،وكذا نقل عن ابن زبيررضي الله عنه فإنه رأى رجلاً يفعل هٰذا فقال له:لاتفعل ليس هذا بشئ فإنه فعله رسول الله صلى الله عليه وسلم ثم ترك، كذا في الهداية والكفاية.(۱)

وقد روى الطبراني بسنده عن ابن أبي ليلٰى عن الحكيم عن المقسم عن ابن عباس رضي الله عنهما عنه عليه الصلوٰة والسلام.(۲)فقط (فتاویٰ دارالعلوم دیوبند:۱۵۸/۲-۱۵۹-۱۷۸)

رفع یدین کی حکمت:

سوال: شیعہ مجتہد نے بیان کیا کہ حدیث اہل سنت میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ تعالی علیہ وسلم کے زمانہ میں لوگ آستین میں بت لیکر نماز پڑھتے تھے،حکم ہوا کہ ہاتھ چھوڑ کر نماز پڑھو۔کیا یہ مضمون کسی حدیث کا ہے؟

الجواب ــــــــــــــــ حامداً و مصلیًا

بہتر یہ تھا کہ وہ اشتہار بھیج دیا جاتا؛تا کہ اس کا منشا معلوم ہو جاتا کہ ان روایات کو غیر معتبر اور موضوع قرار دینا ہے...کتب سے بدظن کرنا مقصود ہے،یا اپنے مسائل کتب مذکورہ سے ثابت کرنا ہے،یا یہ بتانا ہے کہ ان لوگوں کا عمل اپنی کتب پر نہیں،یا کچھ اور مقصود ہے؛تا کہ اس کے مطابق جواب تحریر کیا جاتا،تاہم مختصراً عرض ہے کہ اوجز المسالک شرح موطأ امام مالکؒ:۲۰۲/۱ میں رفع یدین کی متعدد حکمتیں شمار کرتے ہوئے لکھا ہے:

”وزاد ابن رسلان:قيل:إن كفارقريش وغيرهم كانوايصلون مع النبي صلى الله تعالٰى عليه وسلم وأصنامهم تحت آباطهم،فأمروا بالرفع ليسقطوا“.(۱)

مجتہد شیعہ نے اس کا حوالہ نہیں دیا کہ کس کتاب میں ہے اور اعتراض مقصود ہے۔فقط واللہ سبحانہ تعالی اعلم

(فتاویٰ محمودیہ:۶۰۴/۵-۶۰۵)

---

(۱) دیکھئے:الهداية،باب صفة الصلاة:۱۱۰/۱،وفتح القدير،باب أيضاً:۲٦۸/۱،ظفير

(۲) فتح القدير،باب أيضا:۲٦۸/۱،رد المحتار،باب صفة الصلوٰة:٤۷۳/۱،ظفير (مصنف ابن أبي شيبة عن ابن عباس (ح:۲٤٥۰)/قرة العينين برفع اليدين في الصلاة (ح:۸۱)/المعجم الكبير للطبراني،مقسم عن ابن عباس (ح:۱۲۰۷۲)انيس)

(۳) أوجز المسالك في شرح مؤطا مالك،افتتاح الصلاة،رفع اليدين عند الركوع وغيره:۲۰۲/۱،المكتبة اليحيوية بسهارنفور،يوپي الهند (رقم الحديث:۱٦۱،انيس)

عدم رفع یدین کے سلسلہ کی ایک حدیث کا حال:

سوال: روایت کی وکیع نے اعمش سے انہوں نے مسیّب بن رافع سے، انہوں نے تمیم بن طرفہ سے، انہوں نے جابر بن سمرہ سے، انہوں نے کہا کہ آئے ہم لوگوں کے پاس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور ہم لوگ اپنے ہاتھ اٹھاتے ہیں نماز میں تو فرمایا کہ کیا حال ہے کہ میں تم کو دیکھتا ہوں کہ ہاتھ اٹھاتے ہو نماز میں، جیسی دم ہو سرکش گھوڑے کی، اطمینان سے رہو نماز میں۔ یہ حدیث صحیح ہے یا ضعیف؟

الجواب

اس میں اختلاف ہے اور تحقیق اس کی فتح القدیر میں اس طرح ہے:

عن جابر بن سمرة رضی اللّٰہ عنه قال: خرج علینا رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیه وسلم والناس رافعو أیدیهم، قال زهیر: أراه قال فی الصلٰوة فقال: مالی أراکم رافعی أیدیکم کأنها أذناب خیل شمس، اسکنوا فی الصلٰوة.(۱)

یہ حدیث صحیح ہے اور یہ حدیث مطلقاً حالت صلٰوۃ میں ہے۔ فقط (فتاویٰ دار العلوم دیوبند: ۲/۱۶۰) ☆

(۱) یہ حدیث مسلم شریف، باب الأمر بالسکون فی الصلٰوة الخ میں متعدد طرق سے مروی ہے۔ (کتاب الصلاة، ۱/۱۸٤، رقم الحدیث: ٤۳۰، بیت الأفکار، انیس)/مصنف ابن أبی شیبة، من کره رفع الیدین فی الدعاء (ح: ۸٤٤۷)/سنن أبی داؤد، باب فی السلام (ح: ۱۰۰۰) انیس)

☆ **مسئلہ ترک رفع الیدین اور حدیث مسلم شریف:**

سوال: محترم ومکرم آپ صاحبان نے فرمایا تھا کہ رفع الیدین منسوخ ہے لیکن رفع الیدین کرنے والے کہتے ہیں کہ اگر کسی نے اس کا منسوخ ہونا ثابت کیا تو ہم اس کو مبلغ پانچ سو روپے نقد بطور انعام دیں گے، میں نے انہیں وہ مسلم شریف والی حدیث پیش کی، انہوں نے مسلم شریف لا کر بتایا کہ یہ منع تو بوقت سلام ہے اور پھر اس مسلم شریف میں بوقت رکوع رفع کی کئی احادیث اثبات میں پیش کیں براہ مہربانی منسوخ ہونے کی مضبوط دلیل مع حوالہ تحریر فرماویں تاکہ ہم اہل حدیث کا جواب کریں۔ بینوا توجروا۔

(المستفتی: امان اللہ پشاور یونیورسٹی۔ ۱۹/جولائی ۱۹۷۵ء)

الجواب

الحدیث المسئول رواه جابر بن سمرة رضی اللّٰہ تعالٰی عنه مرفوعاً: ۱/۱۸۱ (عن جابر بن سمرة قال: خرج علینا رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیه وسلم فقال: مالی أراکم رافعی أیدیکم کأنها أذناب خیل الشمس؟ اسکنو فی الصلاة. قال ثم خرج علینا قرآناً حلقاً. فقال مالی: أراکم عزین؟ قال ثم خرج علینا فقال: ألا تصفون کما تصف الملائکة عند ربها؟ فقلنا: یا رسول اللّٰہ! وکیف تصف الملائکة عند ربها؟ قال: یتمون الصفوف الأول: ویتراصون فی الصف. (الصحیح لمسلم، باب الأمر بسکون فی الصلاة: ۱/۱۸۱) (کتاب الصلاة، رقم الحدیث: ٤۳۰، انیس)

==

حدیث ابن عمر رضی اللہ عنہما متناً مضطرب ہے:

سوال: محترم جناب مولانا مفتی محمد فرید صاحب دار العلوم حقانیہ!

گزشتہ دنوں آپ کے ہاں ایک غیر مقلد مولوی گکھڑ منڈی سے آیا تھا اور اس نے ایک حدیث ترجمہ کروانا تھا، انہوں نے یہاں آکر مفتیوں اور خصوصاً مولانا سرفراز خان صفدر صاحب کے خلاف پروپیگنڈہ شروع کیا کہ وہ غلط ترجمہ پڑھاتے ہیں اور وہ حدیث رفع الیدین کے بارے میں ہے، وغیرہ وغیرہ۔

بہرحال اس حدیث میں رکوع کے بعد جو لفظ "لایرفعهما" ہے، اس کا تعلق ماقبل سے ہے یا مابعد سے؟ بینوا توجروا۔

(المستفتی: قاری محمد یوسف گکھڑی منڈی گجرانوالہ۔ ۵/ جمادی الثانی ۱۴۰۲ھ)

الجواب

ابن عمر رضی اللہ عنہما کی حدیث متناً مضطرب ہے، معارف السنن اور مشکل الآثار وغیرہ کو مراجعت کرنے سے اس میں کوئی تردد باقی نہیں رہتا۔(۱)

پس اس روایت مسئولہ میں "أن یرکع" پر جملہ ختم ہوا ہے، اور "بعد ما یرفع رأسه" ظرف مقدم ہے، اپنے عامل "لایرفعهما" پر، اگر قلمی یا قدیم نسخوں میں اس سے مخالف عبارت ہو تو اس پر اعتماد کرنا چاہیے۔ وهو الموفق

(فتاویٰ فریدیہ: ۲/۲۵۴)

رفع یدین کا ثبوت ہے یا نہیں:

سوال: مشکوٰۃ اور مسلم میں ہے اور یہ مشکوٰۃ کے حاشیہ سے لیا گیا ہے۔

(۱) عن جابر بن سمرة رضی الله عنه قال: خرج علینا رسول الله صلی الله علیه وسلم فقال: مالی أراکم رافعی أیدکم کأنها أذناب خیل شمس؛ اسکنوا فی الصلوٰة.(۲)

== وفیه انکار علیٰ رفع الیدین لقوله صلی الله علیه وسلم: "اسکنوا فی الصلاة وهو لایصدق علیٰ وقت السلام؛ لأن السلام محلل ومخرج عن الصلاة. (وفی المنهاج: ومنها ما رواه مسلم وغیره عن جابر بن سمرة قال خرج علینا رسول اللّٰه صلی الله علیه وسلم ونحن رافعوا أیدینا فی الصلاة فقال مالی أراکم رافعی أیدیکم کأنها أذناب خیل شمس؟ واللفظ للنسائی وسیاق هذ الحدیث مغایر عن سیاق الحدیث الذی أنکر فیه علیٰ من رفع أیدیهم عند السلام کما لا یخفی علی من راجع إلی نصب الرایة وتعلیقاته. (منهاج السنن شرح جامع السنن، باب رفع الیدین عند الرکوع: ۲/۱۴۰) وهو الموفق (فتاویٰ فریدیہ: ۲/۲۳۵-۲۳۶)

(۱) مشکل الآثار، باب بیان مشکل ما روی عن عبدالله بن عمر رضی الله عنهما فی هذا المعنی: ۱۵/۴۱-۴۸، مؤسسة الرسالة. انیس

(۲) الصحیح لمسلم، باب الأمر بالسکون فی الصلوٰة، ۱/۱۸۴، رقم الحدیث: ۴۳۰، بیت الأفکار، انیس

(۲)　عن جابر بن سمرة رضی اللّٰہ عنه یقول: کنا إذا صلینا مع رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیه وسلم قلنا: السلام علیکم ورحمة اللّٰہ وبرکاته وأشار بیده إلی الجانبین، فقال رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیه وسلم: علام تؤمون بأیدکم کأنها أذناب خیل شمس إنما یکفی أحدکم أن یضع یده علٰی فخذه ثم یسلم علی أخیه من علی یمینه وشماله.(۱)

یہ حدیث (یعنی حدیث:۱) تمیم بن طرفہ رحمہ اللہ سے ہے،(۲) یہ حدیث:۲ عبداللہ بن قبطیہ سے ہے، یہ دونوں حدیثیں ایک نہیں ہیں، اس حدیث (یعنی حدیث:۱) میں رفع یدین کی ممانعت ہے اور اس حدیث (یعنی حدیث:۲) میں سلام کے وقت ہاتھ اٹھانے کی ممانعت ہے، اس حدیث (یعنی حدیث:۱) میں ''خرج علینا رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیه وسلم'' ہے؛ یعنی نکلے ہم پر رسول رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، یعنی حضور صلی اللہ علیہ وسلم نماز میں شامل نہیں تھے اور حدیث (یعنی حدیث:۲) میں ''کنا صلینا مع رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیه وسلم'' ہے؛ یعنی ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ نماز پڑھ رہے تھے،''وأشار بیده إلی الجانبین'' یعنی اشارہ کیا سلام پھیرتے وقت دونوں ہاتھوں سے، پس عرض یہ ہے کہ یہ دونوں حدیثیں ایک ہیں یا علیحدہ علیحدہ اور ''رافعی أیدکم'' سے ''رفع یدین عند الرکوع'' وغیرہ مراد ہے؟ اور کیا تکبیر تحریمہ میں بھی رفع یدین کرنے کی ممانعت اس سے ثابت ہوتی ہے؟ اور ''اسکنوا فی الصلوٰة'' علیحدہ چیز ہے یا ''أشار بیدیه إلی الجانبین'' امقصد ایک ہے؛ کیوں کہ پہلی حدیث رفع یدین کی ممانعت ہے اور دوسری حدیث میں سلام کے وقت ہاتھ اٹھانے کی ممانعت ہے، پس اس کا جواب مدلل تشفی بخش تحریر فرما کر ارسال فرمائیں؟ بینوا توجروا۔

الجواب

(۱)　عن تمیم بن طرفة، عن جابر بن سمرة رضی اللّٰہ تعالٰی عنه قال خرج علینا رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیه وسلم ونحن رافعوا أیدینا فی الصلوٰة فقال: ما بالهم رافعین أیدیهم فی الصلوٰة کأنها أذناب الخیل الشمس؟ اسکنوا فی الصلوٰة.(۳)

(ترجمہ): تمیم بن طرفہ جابر بن سمرة رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں کہ انہوں نے فرمایا کہ نکل کر ہمارے پاس جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے، اس حال میں جبکہ ہم نماز میں ہاتھ اٹھائے ہوئے تھے تو فرمایا کہ اس کو کیا ہوا کہ نماز میں ہاتھ اٹھائے ہوئے ہیں، جیسے کہ چمکنے والے گھوڑوں کی دمیں ہوتی ہیں، نماز میں سکون اختیار کرو۔)

---

(۱)　الصحیح لمسلم ،باب الأمر بالسکون فی الصلوٰة، ۱۸٤/۱، رقم الحدیث: ٤۳۱ ،بیت الأفکار،انیس

(۲)　فی روایة مسلم:قال:صلیت مع رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیه وسلم فکنا إذا سلمنا وقلنا بأیدینا السلام علیکم السلام علیکم فینظر إلینا رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیه وسلم فقال:ماشأنکم تشیرون بأیدیکم.

(۳)　سنن النسائی : ۱۷٦/۱ (کتاب الصلاة،باب السلام بالأیدی فی الصلاة (ح:۱۱۸۳)دار المعرفة بیروت،انیس

(۲) عن تميم الطائى عن جابربن سمرة رضى اللّٰه عنه قال: دخل علينا رسول اللّٰه صلى اللّٰه عليه وسلم والناس رافعوا أيديهم قال زهير: أراه قال فى الصلوٰة فقال: مالى أراكم رافعى أيديكم كأنها أذناب خيل شمس اسكنوا فى الصلوٰة، الحديث.(۱)

(ترجمہ): تمیم طائی جابر بن سمرۃ رضہ اللہ عنہ سے وایت کرتے ہیں کہ انہوں نے فرمایا کہ ہمارے پاس جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایسی حالت میں داخل ہوئے کہ لوگ ہاتھ اٹھائے ہوئے تھے؛ یعنی نماز میں، تو فرمایا کہ مجھ کو کیا ہوا کہ میں تم کو دیکھتا ہوں ہاتھ اٹھائے ہوئے ایسی طرح کہ گویا وہ چمکنے والے گھوڑوں کی دمیں ہیں، نماز میں سکون کرو۔)

(۳) عن عبيد اللّٰه بن القبطية عن جا بربن سمرة رضى اللّٰه تعالىٰ عنه قال: كنا نصلى خلف النبى صلى اللّٰه عليه وسلم فنسلم بأيدينا فقال: ما بال هٰولاء يسلمو ن بأيديهم كأنها أذناب خيل شمس؟إما يكفى أحدهم أن يضع يده علىٰ فخذه ثم يقو ل: السلام عليكم، السلام عليكم.(۲)

(ترجمہ): عبیداللہ بن قبطیہ جابر بن سمرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں کہ جب ہم جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پیچھے نماز پرھتے ہوئے اپنے ہاتھوں سے سلام کیا کرتے تھے، تو جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ان لوگوں کو کیا ہو گیا کہ اپنے ہاتھوں سے اس طرح سلام کرتے ہیں کہ گویا وہ چمکنے والے گھوڑوں کی دمیں ہیں کیا ان کو یہ کافی نہیں ہے کہ اپنی رانوں پر ہاتھ رکھیں پھر کہیں کہ: السلام عليكم السلام عليكم.)

(۴) عن عبيد اللّٰه عن جا بربن سمرة رضى اللّٰه عنه قال: كنا إذاصلينا خلف رسول اللّٰه صلى اللّٰه عليه وسلم فسلم أحدنا أشاربيده من عن يمينه ومن عن يساره فلما صلىٰ قال: مال بال أحدكم يومى بيده كأنها أذناب خيل شمس؟إنما يكفى أحدكم أن يقول هٰكذا وأشاربأصبعه يسلم علىٰ أخيه من عن يمينه ومن عن شماله.(۳)

(ترجمہ): عبیداللہ بن قبطیہ جابر بن سمرۃ رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں کہ جب ہم جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پیچھے نماز پڑھتے تھے تو جب ہم میں سے کوئی سلام پھیرتا تھا تو اپنے ہاتھوں سے اشارہ کرتا تھا داہنے والوں اور بائیں والوں کی طرف تو جب جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نماز سے فارغ ہوئے تو فرمایا کہ تم میں سے ہر ایک کو کیا ہوا کہ وہ اس طرح اپنے ہاتھوں سے اشارہ کرتا ہے جس طرح چمکنے والے گھوڑوں کی دم ہوتی ہے کیا ہر ایک کو کافی نہیں کہ اس طرح کرے اور اپنی انگلی سے اشارہ کیا، الخ۔)

(۵) عن عبيد اللّٰه بن القبطية، عن جا بربن سمرة رضى اللّٰه عنه قال: كنا إذا صلينامع رسول

(۱) سنن أبى داؤد: ۱۴۳/۱ (كتاب الصلاة، باب فى السلام (ح: ۱۰۰۰) بيت الأفكار، انيس

(۲) سنن النسائى: ۱۷۶/۱ (الصلاة باب السلام بالأيدى فى الصلاة (ح: ۱۱۸۴) دار المعرفة بيروت، انيس

(۳) سنن أبى داؤد: ۱۴۳/۱ (كتاب الصلاة، باب فى السلام (ح: ۹۹۸) بيت الأفكار، انيس

اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم قلنا:السلام علیکم ورحمة اللّٰہ السلام علیکم ورحمة اللّٰہ، وأشار بیدہ إلی الجا نبین، فقال رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم:علام تؤمون بأیدیکم کأنھاأذ باب خیل شمس؟إنما یکفی أحدکم أن یضع یدہ علٰی فخذہ،ثم یسلم علٰی أخیہ من علٰی یمینہ و شمالہ.(۱)

(ترجمہ): عبیداللہ بن قبطیہ جابر بن سمرة رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں کہ انہوں نے فرمایا کہ ہم جب جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ نماز پڑھتے تھے تو کہتے تھے: السلام علیکم ورحمة اللّٰہ،السلام علیکم ورحمة اللّٰہ اور اشارہ اپنے ہاتھوں سے دونوں جانبوں پر کرتے تھے تو جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تم کیوں اپنے ہاتھوں سے اس طرح اشارہ کرتے ہو کہ گویا وہ دمیں چمکنے والے گھوڑوں کی ہیں، کیا تم میں سے کسی کو یہ کافی نہیں ہے کہ وہ اپنی ران پر ہاتھ رکھے، پھر اپنے بھائی کے لئے سلام داہنی طرف اور بائیں طرف پھیرے۔)

(۶)　عن عبید اللّٰہ عن جابر بن سمرة رضی اللّٰہ عنہ قال:صلیت مع رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم،فکنا إذا سلمنا،قلنا بأیدینا:السلام علیکم،السلام علیکم فنظر إلینا رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم فقال ما شأنکم؟تشیرون بأیدیکم کأنھاأذنا ب خیل شمس؟إذا سلم أحد فلیلتفت إلٰی صاحبہ ولا یومی بیدہ.(۲)

(ترجمہ): عبیداللہ جابر بن سمرہ رضی اللہ عنہ سے روایت فرماتے ہیں کہ میں نے (ہم نے) جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ سلم کے ساتھ نماز پڑھی تو ہماری عادت تھی کی جب ہم سلام پھیرتے تھے تو اپنے ہاتھوں سے کہتے تھے: السلام علیکم تو جناب رسو ل اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہماری طرف دیکھا اور فرمایا کہ تمہاری کیا شان ہے کہ تم اپنے ہاتھوں سے اس طرح اشارہ کرتے ہو کہ گویا وہ چمکنے والے گھوڑوں کی دمیں ہیں جب تم میں سے کوئی سلام پھیرا کرے تو اپنے ساتھی کی طرف التفات کیا کرے اور اپنے ہاتھ سے اشارہ نہ کرے۔)

حضرت جابر بن سمرة رضی اللہ عنہ کے دو شاگرد تمیم بن طرفة طائی اور عبید اللہ بن قبطیہ اس حدیث کو اپنے استاد حضرت جابر بن سمرة رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں، صحاح میں یہ روایت مسلم، ابوداؤد، نسائی، میں موجود ہے، ہم نے تینوں کے الفاظ نقل کردئے ہیں؛ تاکہ صحیح نتیجہ تک پہنچنے میں آسانی ہو؛ کیوں کہ روایات کے طرق متعددہ کے الفاظ تو روایات کی توضیح کرتے ہیں، اس لیے مندرجہ ذیل امور غور طلب ہیں:

(اول) یہ کہ آیا ہر دو روایتیں ایک ہی واقعہ کی حکایت کرتی ہیں، یا واقعات مختلف پر روشنی ڈالتی ہیں؟ جب ہم دیکھتے ہیں کہ تمیم کی روایت کے تمام طرق کے الفاظ اور کلمات کے مدلولات عبید اللہ کے الفاظ اور کلمات کے مدلولات سے مختلف ہیں تو یقین ہوتا ہے کہ ہر دو کے واقعات علیحدہ علیحدہ ہیں۔

(۱-۲)　الصحیح لمسلم: ۱/۱۸۱ (کتاب الصلاة،باب:الأمر بالسکون فی الصلاة (ح:۴۳۱) بیت الأفکار ،انیس

(الف) تمیم کی روایت کے تمام طرق بتلاتے ہیں کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ سلم باہر سے تشریف لائے اور عبیداللہ کی روایت کے طرق سے معلوم ہوتا ہے کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ سلم صحابہ رضی اللہ عنہم کے ساتھ نماز میں شریک تھے۔

(ب) تمیم کی روایت کے تمام طرق بتلاتے ہیں کہ جب جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ سلم تشریف لائے، صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اپنی اپنی نمازیں پڑھ رہے تھے اور سب منفرد تھے اور عبیداللہ کی روایت کے طرق بتلاتے ہیں کہ نماز باجماعت تھی جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ سلم امام تھے اور صحابہ کرام آپ کے مقتدی تھے۔

(ج) تمیم کی روایت کے طرق بتلاتے ہیں کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ سلم جب تشریف لائے تو صحابہ کرام نماز میں رفع یدین کررہے تھے اور عبیداللہ کی روایت کے طرق بتلاتے ہیں کہ صحابہ کرام نماز سے فراغت پر سلام کرتے ہوئے ہاتھوں سے اشارہ کرتے تھے کسی میں رفع یدین کا تذکرہ نہیں ہے۔

(د) تمیم کی روایت کے طرق بتلاتے ہیں کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ سلم نے نماز میں رفع یدین کرنے پر انکار فرمایا اور عبیداللہ کی روایت کے طرق بتلاتے ہیں کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ سلم نے سلام کرتے ہوئے ہاتھوں سے اشارہ کرنے اور اس کے اٹھانے (رفع) پر انکار فرمایا۔

(ہ) تمیم کی روایت کے طرق بتلاتے ہیں کہ جناب سول اللہ صلی اللہ علیہ سلم نے نماز میں سکون کا حکم فرمایا اور عبیداللہ کی روایت کے طرق بتلاتے ہیں کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ سلم نے سلام کرتے ہوئے ہاتھوں کو رانوں پر رکھنے اور انگلیوں سے اشارہ کرنے اور عدم التفات الی الاخوان کا حکم فرمایا۔

(و) تمیم کی روایت کے طرق بتلاتے ہیں کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا انکار رفع یدین پر اس وقت ہوا جب کہ صحابہ کرام نماز میں تھے اور رفع یدین کررہے تھے اور عبیداللہ کی روایت کے طرق بتلاتے ہیں کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا منع فرمانا سلام پھیرنے اور نماز ختم کرنے کے بعد ہوا۔

(ز) تمیم کی روایت کے طرق بتلاتے ہیں کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ سلم نے ان کو نوافل اور سنن اور منفرد نماز میں ہدایت فرمائی اور عبیداللہ کی روایت کے طرق دلالت کرتے ہیں کہ صحابہ کرام کو فریضہ اور باجماعت نماز کے متعلق ارشاد فرمایا۔

خلاصہ یہ کہ وجوہ مذکورہ بالا سے دونوں روایتوں کا تغایر معلوم ہوتا ہے، پھر ان کو ایک ہی واقعہ بتلانا کس قدر ظلم صریح ہے، جن حضرات نے اس کا ارتکاب کیا ہے، انہوں نے سیاق وسباق سے بے توجہی فرما کر اپنے مذہبی تعصب کی بناء پر ایسے ظلم کو اختیار فرمایا ہے، راوی صحابی؛ یعنی حضرت جابر بن سمرۃ رضی اللہ تعالی عنہ کا ایک ہونا واقعہ کی وحدت کا مقتضی

نہیں ہے ایک ہی راوی مختلف امور کو نقل کرتا ہے اور احوال مختلفہ کو اوقات مختلفہ میں مشاہدہ کر کے ہر حال کو ذکر کرتا ہے۔ سیاق وسباق پر غور کرنا اور ہر ایک کو اپنے اپنے مقام پر رکھنا فقیہ کا فریضہ ہے۔ بہر حال تمیم بن طرفۃ کی روایت نص صریح ہے جو کہ نماز میں مطلقاً رفع یدین سے منع کرتی ہے خواہ بوقت رکوع ہو یا بوقت سجود ہو اور خواہ رکوع سے سر اٹھاتے ہوئے ہو یا سجدہ سے سر اٹھاتے ہوئے یا سجدہ سے سر اٹھاتے وقت ہو اور خواہ **عند القیام إلی الثانیة** ہو یا **عند القیام الی الثالثة والرابعة** ہو، یہ سب ممنوع ہے۔

(۲) دوسرا امر قابل غور یہ ہے کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ سلم کا ارشاد "**اسکنوا فی الصلوٰۃ**" عام اور مطلق ہے، کسی وضع اور حالت سے مقید نہیں کیا گیا ہے اور چوں کہ اصول کا متفق علیہ مسئلہ ہے: "**العبرة لعموم اللفظ لا بخصوص المورد**"، (۱) اس لئے اگر فرض کر لیا بھی جائے کہ یہ ارشاد رفع یدین عند السلام کے لئے واقع ہوا ہے، تب بھی لازم ہے کہ الفاظ کو اپنے عموم پر ہی محمول کیا جائے اور نماز کے ہر حصہ میں رفع یدین اور سکون کو واجب قرار دیا جائے، یہاں پر یہ شبہ کہ اگر ایسا ہوتا تو رفع **عند التکبیر التحریمة** (یعنی ابتداء نماز میں بھی ممنوع ہوتا؛ حالانکہ وہ بالاتفاق مطلوب اور مشروع ہے، بالکل بے موقع ہے اور غلط ہے؛ کیوں کہ تکبیر تحریمہ نماز سے خارج اور شرط ہے، شطر صلوٰۃ نہیں ہے۔ اس پر لفظ "**فی الصلوٰۃ**" صادق نہیں آتا ہے۔ **قال اللّٰہ تعالیٰ**: ﴿**وذکر اسم ربه فصلیٰ**﴾ آیت مذکورہ میں "**فصلی**" کو "**ذکر اسم ربه**" پر عطف کیا گیا ہے تو اگر تکبیر تحریمہ نماز کے اجزاء میں سے ہوتا تو کل کا عطف علی الجزء لازم آتا، جو کہ جائز نہیں ہے، نیز یہ عطف حرف فاء سے کیا گیا ہے، جو کہ تعقیب پر دلالت کرتا ہے، جس سے مفہوم ہوتا ہے کہ نماز تکبیر تحریمہ کے بعد متحقق ہوتی ہے جو کہ مرتب شروط متصلہ کا ہے، اجزاء اور شطر نہیں ہے؛ اس لئے تکبیر تحریمہ کو رکن نماز اور جزء نماز قرار دینا، جیسا کہ شوافع اور موالک نے کیا ہے غلط ہے۔ الغرض یہ شبہ اس روایت تمیم پر بالکل وارد نہیں ہوتا، نیز تکبیرات عیدین پر بھی وارد نہیں ہوتا کیوں کہ!

(الف) رفع یدین فی تکبیرات العیدین متفق علیہ نہیں ہے، امام مالک اور امام ابو یوسف رحمہم اللہ تعالیٰ اس کے مخالف ہیں۔ (۲)

(ب) نماز عیدین دائمی نمازوں میں سے نہیں ہے؛ اس لئے وہ ان قواعد کلیہ سے خارج ہے، جیسے: "**صلاة النهار عجما**" (۳) سے خارج ہے۔

---

(۱) العبرة لعموم اللفظ لا لخصوص السبب. (کشف الإسرار شرح شرح أصول البزوی، العام الذی لم یثبت خصوصه لا یحتمل الخصوص: ۲۹۶/۱، دار الکتاب الإسلامی. انیس)

(۲) الهدایة مع فتح القدیر، باب صلاة العیدین: ۷۷/۲، دار الفکر بیروت. انیس

(۳) الحاوی الکبیر: ۱۴۹/۲، دار الکتب العلمیة/مبسوط السرخسی، باب إجارة الدواب: ۱۸۲/۱۵، دار المعرفة. انیس

(ج)　تکبیر تحریمہ میں رفع یدین کرنے کی اور اس کے ممانعت کی کوئی روایت موجود نہیں، بخلاف ''رفع یدین عندالرکوع ورفع الرأس منه وعند السجود ورفع الرأس منه'' وغیرہ کے اس میں روایات متعددہ موجود ہیں، بہرحال تمیم بن طرفہ کی روایت صحیح اور تمام شبہات سے خالی اور قابل اعتماد ہے۔

(۳)　تیسرا امر قابل غور یہ ہے کہ جابر بن سمرۃ رضی اللہ تعالی عنہ کی روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ نماز میں رفع یدین سلام کے وقت مشروع اور جاری تھا، نیز ہر انتقال پر بھی مشروع تھا، جیسا کہ ابن عباس اور عمیر بن حبیب رضی اللہ تعالی عنہما فرماتے ہیں:

''أن رسول اللّٰه صلی اللّٰه علیه وسلم کا ن یرفع یدیه عند کل تکبیرة''. (رواہ ابن ماجة: ٦٢)(۱)

اور مالک بن الحویرث رضی اللہ عنہ اور دوسرے صحابہ رضی اللہ عنہم فرماتے ہیں کہ سجدہ کرنے اور اس سے سر اٹھانے کے وقت رفع یدین ہوتا تھا۔ (النسائی: ١٦٥. بسند صحیح)(۲)

ابن عمر اور دوسرے صحابہ رضی اللہ تعال عنہم رفع یدین عندالقیام الی الثانیہ اور الی الثالثہ اور رکوع کرنے کے اور اس سے سر اٹھانے کے وقت ذکر فرماتے ہیں۔ (متفق علیہ)(۳)

یہ حالتیں یقیناً ابتدائی ہیں، مگر بعد کو رفع یدین سلام کے وقت منسوخ کر دیا گیا، (۴) اور رفع یدین عندالسجود اور سجدہ سے سر اٹھانے کے وقت بھی منسوخ کر دیا گیا۔ (۵) اسی طرح رفع یدین عندالقیام الی الثانیہ والی الثالثہ کو بھی امام شافعی رحمہ اللہ علیہ اور دوسرے ائمہ منسوخ تسلیم کرتے ہیں اور ان روایتوں کو پیش فرماتے ہیں، جس میں اس کی نفی ہے، اگرچہ امام نووی رحمۃ اللہ علیہ اس کو تسلیم نہیں کرتے، اسی طرح رفع یدین عندالرکوع اور اس سے سر اٹھانے کے وقت میں ابن مسعود، براء ابن عازب، تمیم بن طرفۃ عن جابر بن سمرۃ رضی اللہ عنہم وغیرہ منسوخ قرار دیتے ہیں، جس میں نزاع ہو رہا ہے۔ اب قابل غور یہ امر ہے کہ جب کہ ثابت ہے کہ پہلے ہر تکبیر وسلام کے وقت رفع یدین تھا اور پھر اس کو منسوخ کیا گیا تو معلوم ہوا کہ نماز کو تدریجاً حرکت سے سکون کی طرف لایا گیا، جس میں ایک درجہ تک نسخ کو سب

(۱)　کتاب إقامة الصلاة، باب رفع الیدین إذا رکع وإذا رفع من الرکوع (ح: ٨٦٥) بیت الأفکار، انیس

(۲)　باب رفع الیدین للسجود: ٢٠٥/٢، المطبوعات الإسلامیة حلب (ح: ١٠٨٥) انیس

(۳)　صحیح البخاری، باب رفع الیدین إذا کبر وإذا رکع وإذا رفع (ح: ٧٣٦)/ الصحیح لمسلم عن أبی هریرة، باب إثبات التکبیر فی کل خفض ورفع (ح: ٣٩٢) انیس

(۴)　دیکھو روایت عبیداللہ بن القبطیہ (سنن النسائی: ١٧٦/١، کتاب الصلاة، باب السلام بالأیدی فی الصلاة (ح: ١١٨٤) دار المعرفة بیروت، انیس)

(۵)　دیکھو روایت ابن مسعود رضی اللہ عنہ (سنن أبی داؤد، باب من لم یذکر الرفع عندالرکوع (ح: ٧٤٨)/ سنن الترمذی، باب ماجاء أن النبی صلی اللّٰه علیه وسلم (ح: ٢٥٧)/ سنن النسائی، الرحصة فی ترک ذلک (ح: ١٠٥٨) انیس)

تسلیم کرتے ہیں تو ضروری ہے کہ یہ ہی طریقہ رفع یدین عند الرکوع وعند رفع الرأس منہ تسلیم کیا جائے اور تمیم کی روایت کو حقیقی معنوں میں معمول بہ قرار دیا جائے اور ابن مسعود اور براء بن عازب کی روایتوں کو اسی کی مؤید قرار دیا جائے اور علاوہ تکبیر تحریمہ ہر جگہ رفع یدین کو سکون فی الصلوٰۃ کا مورد قرار دیا جائے، تکبیر تحریمہ کا رفع یدین تو سکون فی الصلوٰۃ کے ماتحت ہے ہی نہیں، کما ذکرناہ سابقاً۔ واللہ اعلم

(مخطوطات مبارکہ، ص: ۱۲۹۔۱۳۴) (فتاویٰ شیخ الاسلام: ۲۶۔۳۳)

جوازِ رفع یدین:

سوال: رفع الیدین فی الصلوٰۃ جائز ہے یا نہیں؟

الجواب ــــــــــــــــــــ

جائز ہے، جیسا کہ عدم رفع بھی جائز ہے؛ یعنی دونوں صورتوں میں سے کسی ایک کو ترجیح تحقیقی ہے، یا تقلیدی اور احد الشقین کا تحقیق ہے، یا تقلید۔

۲/صفر ۱۳۴۱ھ۔ (تتمہ خامسہ ۲۳۳) (امداد الفتاویٰ جدید: ۱/۲۲۱) ☆

☆ رفع یدین:

سوال: رفع یدین کرنا چاہئے یا نہیں، اگر نہیں کرنا چاہئے تو اس کی دلیل لکھئے کہ کہیں منع ثابت ہے یا نہیں؟

الجواب ــــــــــــ حامداً و مصلیًا

تکبیر افتتاح کے علاوہ نماز میں رفع یدین نہیں ہے۔

"عن علقمة قال: قال لنا عبداللّٰه بن مسعود رضی اللّٰه تعالٰی عنه: ألا أصلی بکم صلوةَ رسول اللّٰه صلی اللّٰه تعالٰی علیه وسلم؟ فصلّٰی، فلم یر فع یدیه إلافی أول مرة". راوہ الثلاثة وهو حدیث صحیح. (آثار السنن: ۱/ ۹٦) (آثار السنن، باب ترک رفع الیدین فی غیر الافتتاح: ۱۳۲، إمدادیه ملتان) (أبواب صفة الصلاة، رقم الحدیث: ۴۰۲، انیس)

"ولایسن رفع یدیه إلافی سبع مواطن". (الدر المختار)

"قوله: (إلافی سبعة) إشارة إلٰی أنه لایرفع عند تکبیرات الانتقالات، خلافاً للشافعی وأحمد، فیکره عندنا، ولایفسد الصلاة إلا فی روایة مکحول عن الإمام". (ردالمحتار، کتاب الصلاة، فصل فی بیان تألیف الصلاة إلٰی انتهائها: ۱/ ۵۰۹، سعید) (فتاویٰ محمودیہ: ۵/۲۰۱۔۲۰۲)

رفع یدین:

سوال: رفع یدین کرنا کیسا ہے؟ بینوا توجروا۔ (المستفتی: بندہ ابوذر گور یہارمی، مظفر پوری بہاری)

الجواب ــــــــــــ حامداً و مصلیًا

رفع یدین سات جگہ سنت مؤکدہ ہے:

تکبیر تحریمہ کے وقت، دعائے قنوت، تکبیرات عیدین، استیلام حجر، صفا و مروہ، عرفات، جمرات۔ ==

نماز میں رفع یدین کا حکم:

سوال (۱) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے آخری ایام میں رفع یدین کا معمول تھا یا نہیں؟
(۲)　خلفا راشدین کے اوقات میں رفع یدین کا معمول تھا یا نہیں؟
(۳)　امام اعظمؒ کے رفع یدین نہ کرنے کی وجہ کیا تھی؟

الجواب ــــــــــــــــ وباللہ التوفیق

احادیث سے رفع یدین بھی ثابت ہے اور ترک رفع یدین بھی، چنانچہ عبداللہ بن عمرؓ فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا کہ جب نماز شروع کرتے تو اپنے ہاتھوں کو مونڈھے تک اٹھاتے اور جب رکوع کرتے اور جب رکوع سے سر اٹھاتے:

"قال رأيتُ رسول اللّٰه صلى اللّٰه عليه وسلم إذا افتتح الصلاة يرفع يديه حتىٰ يحاذى منكبيه وإذا ركع وإذا رفع رأسه من الركوع".(۱)

اور حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ کیا میں تم لوگوں کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نماز نہ پڑھاؤں تو انہوں نے نماز پڑھائی اور پہلی مرتبہ کے علاوہ رفع یدین نہیں کیا:

== "(ولايسن) مؤكداً (مع رفع يديه إلا فى) سبعة مواطن كما ورد ... (تكبيرة إفتتاح وقنوت وعيد و خمسة فى الحج (استيلام) ...(والصفا والمروة وعرفات والجمرات)".(الدرالمختار: ۵۴۸/۱)
(الدرالمختار، كتاب الصلاة، باب صفة الصلاة، فصل فى بيان تأليف الصلاة: ۵۰۶/۱، سعيد)

"عن علقمة قال:قال عبد الله بن مسعود رضى الله تعالىٰ عنه:ألا أصلى بكم صلوة رسول الله صلى اللّٰه تعالىٰ عليه وسلم،فصلىٰ،فلم يرفع يديه إلافى أول مرة".(سنن الترمذى،أبواب الصلاة،باب رفع اليدين عند الركوع: ۵۹/۱،سعيد)

"عن أسود قال:رأيت عمر بن الخطاب رضى الله تعالىٰ عنه يرفع يديه فى أول تكبيرة ثم لايعود".رواه الطحاوى وقال:هوحديث صحيح،آه.وفى الدراية:رجاله ثقات.(إعلاء السنن،كتاب الصلاة،باب ترك رفع اليدين فى غير الافتتاح: ۴۸/۳،إدارة القرآن كراچى)

ان مواضع کے علاوہ سنت مؤکدہ نہیں اور عام نمازوں میں بجز تکبیر تحریمہ اور کسی جگہ سنت نہیں۔فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ أعلم وعلمه وأتم وأحكم

حررہ العبد محمود گنگوہی عفا اللہ عنہ، معین المفتی مدرسہ مظاہر علوم سہارن پور۔۱۴/۱۲/۱۳۵۴ھ۔
صحیح:عبداللطیف عفی عنہ، مدرسہ مظاہر علوم۔۱۵/ذی الحجہ/۱۳۵۴ھ۔سعید احمد غفرلہ۔(فتاویٰ محمودیہ:۶۰۰/۵)

(۱)　جامع الترمذى،باب ماجاء فى رفع اليدين عند الركوع: ۳۵/۱ (كتاب الصلاة (ح: ۲۵۵) بيت الأفكار/سنن النسائى،باب باب رفع اليدين للركوع حذاء المنكبين (ح:۱۰۲۵)انيس)

"قال عبد اللّٰہ بن مسعود رضی اللّٰہ عنہ ألا أصلی بکم صلوۃ رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم ؟فصلّی،فلم یرفع یدیہ إلاّ فی أوّل مرۃ". (الحدیث)(۱)

روایات میں اختلاف کی وجہ سے ائمہ اربعہ کے درمیان رفع یدین اور ترک رفع یدین میں اختلاف ہے؛ لیکن ان کے درمیان یہ اختلاف جواز اور عدم جواز کا نہیں ہے، بلکہ افضلیت اور غیر افضلیت کا ہے، امام ابوحنیفہؒ و مالکؒ کے نزدیک ترک رفع یدین افضل ہے، امام شافعیؒ و احمدؒ کے نزدیک رفع یدین افضل ہے، امام ابوحنیفہؒ و مالکؒ کے مسلک کی تائید آثار صحابہ اور تابعین و تبع تابعین سے بھی ہوتی ہے، چنانچہ طحاوی شریف میں ہے کہ حضرت عمرؓ تکبیر تحریمہ کے علاوہ رفع یدین نہیں کرتے تھے:

"عن الأسود قال: رأیت عمر بن الخطاب رضی اللّٰہ عنہ یرفع یدیہ فی أول تکبیرۃ، ثم لا یعود". (۲)

حضرت علی رضی اللہ عنہ بھی سوائے تکبیر تحریمہ کے رفع یدین نہیں کرتے تھے۔(۳) اور بہت سارے صحابۂ کرام کا عمل ترک کا رہا ہے، نیز ترک رفع یدین والی روایت اوفق بالقرآن والسنۃ ہے۔ ارشاد باری ہے:

﴿وَقُومُوا لِلّٰهِ قَانِتِينَ﴾ (۴) جس کا مقتضی یہ ہے کہ نماز میں حرکت کم ہو لہٰذا جن روایت پر عمل کرنے میں حرکتیں کم ہوں گی وہ اس آیت کے زیادہ مطابق ہوں گی۔

احادیث کے معارضہ کے وقت تعامل صحابہ کو بڑی اہمیت حاصل ہے، جب ہم اس جانب نظر دوڑاتے ہیں تو حضرت عمرؓ، حضرت علیؓ اور ابن مسعودؓ کا عمل ترک رفع یدین کا معلوم ہوتا ہے اور یہ تینوں صحابہ تمام صحابہ کے علوم کا خلاصہ ہیں اور ساتھ ہی ساتھ اہل مدینہ اور کوفہ کا تعامل ترک رفع یدین کا رہا ہے جب کہ دوسرے شہروں میں دونوں رائج تھا، جہاں تک ان روایات کا تعلق ہے جن سے رفع یدین کا ثبوت ملتا ہے، وہ منسوخ ہیں۔ رفع یدین ابتدائی زمانہ کا عمل ہے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا آخری عمل ترک رفع ہے، چنانچہ حضرت ابن زبیرؓ سے مروی ہے کہ

(۱) جامع الترمذی، باب ماجاء أن النبی صلی اللّٰہ علیہ وسلم لم یرفع إلا فی أول مرۃ: ۳۵/۱ (کتاب الصلاۃ (ح:۲۵۷) بیت الأفکار، انیس)

(۲) شرح معانی الآثار: ۲۲۷/۱ (کتاب الصلاۃ، باب التکبیر للرکوع والتکبیر للسجود والرفع من الرکوع هل مع ذلک رفع أم لا؟ رقم الحدیث: ۱۳٦٤، عالم الکتب، انیس

(۳) حدثنا عاصم بن کلیب، عن أبیہ أن علیًا رضی اللّٰہ عنہ کان یرفع یدیہ فی أول تکبیرۃ من الصلاۃ، ثم لا یرفع بعد. (شرح معانی الآثار: ۲۲۵/۱)(کتاب الصلاۃ، باب التکبیر للرکوع والتکبیر للسجود والرفع من الرکوع هل مع ذلک رفع أم لا؟ رقم الحدیث: ۱۳۵۳، عالم الکتب، انیس)

(۴) سورۃ البقرۃ: ۲۳۸.

انہوں نے ایک شخص کو دیکھا کہ رکوع سے اٹھتے وقت رفع یدین کرتا ہے تو انہوں نے فرمایا کہ رک جاؤ! یہ وہ چیز ہے جس کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کیا، پھر ترک کر دیا، اسی طرح ابن عباس سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب، جب رکوع کرتے تھے اور رکوع سے سر اٹھاتے تھے تو رفع یدین کرتے تھے، پھر یہ صرف تکبیر تحریمہ کے لئے باقی رہ گیا اور اس کے علاوہ کے لئے چھوڑ دیا گیا۔

"عن ابن عباس رضی اللّٰہ عنہ قال: کان رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم یرفع یدیہ کلما رکع وکلمارفع،ثم صارإلٰی افتتاح الصلاۃ وترک ما سوٰی ذلک".

"عن ابن زبیررضی اللّٰہ عنہ أنہ رأی رجلاً یرفع یدیہ من الرکوع،فقال:مہ فإن ھٰذا شیء فعلہ رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم ثم ترکہ". (إعلاء السنن: ۶۶/۳)(۱)

والذی یروی من الرفع محمول علٰی الابتداء،کذا نقل عن ابن الزبیر. (الھدایۃ: ۱۱۱/۱)(۲)

لہٰذا قرآنی آیات، روایت اور آثار صحابہ کی روشنی میں امام ابوحنیفہؒ کا مسلک راجح ہے، اولیٰ اور افضل یہی ہے کہ رفع یدین نہ کیا جائے۔ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کا عمل زندگی کے آخری ایام میں، اسی طرح خلفا راشدین کا عمل ترک رفع یدین کا تھا، جیسا کہ اوپر کے بیان سے معلوم ہوا۔

امام صاحب کے رفع یدین نہ کرنے کی وجہ روایات اور آثار صحابہ ہیں، نیز یہ روایت وآثار صحابہ اوفق بالقرآن بھی ہیں۔ فقط واللہ تعالیٰ اعلم

محمد جنید عالم ندوی قاسمی، ۱۴۱۴/۹/۶ھ۔ (فتاویٰ امارت شرعیہ: ۳۹۲/۲-۳۹۴)

رفع یدین، آمین بالجہر، قرأت فاتحہ، تراویح:

سوال (۱) زید امام کے پیچھے سورہ فاتحہ پڑھتا ہے اور عمر نہیں پڑھتا اور دونوں اپنے کو محمدی کہتے ہیں۔ اب دریافت طلب یہ ہے کہ شریعت محمدیہ کے مطابق کس کی نماز صحیح ہوگی اور کس کی نہیں؟

(۲)　بکر آمین بالجہر کا قائل ہے اور زید آمین لجہر کا قائل نہیں، کس کا عمل اور قول صحیح ہے؟

(۳)　رفع یدین کرنا شریعت محمدیہ کے مطابق ہے یا نہیں؟

(۴)　زید صلوۃ عیدین میں بارہ تکبیر کہتا ہے اور عمر چھ تکبیروں کا قائل ہے۔ آخر صحیح حدیث کیا ہے؟

(۵)　بیس رکعت تراویح حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے مرفوعاً ثابت ہے یا نہیں؟

---

(۱)　کذا فی نصب الرایۃ فی تخریج أحادیث الھدایۃ،باب صفۃ الصلاۃ: ۳۹۲/۱،مؤسسۃ الرسالۃ.انیس

(۲)　الھدایۃ،باب صفۃ الصلاۃ: ۵۲/۱،دارإحیاء التراث العربی بیروت.انیس

الجواب ــــــــــــــــ حامداً و مصلیًا

(۱) سوال واضح نہیں، زید وعمر میں جو اختلاف ہے وہ سری نماز میں ہے یا جہری نماز میں، یہ بھی معلوم نہ ہوسکا کہ محمدی کا کیا مصداق ہے، آیا یہ نسبت حضرت نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی طرف ہے یا کسی اور امام کی طرف، جیسے امام محمد بن حسن یا امام محمد بن ادریس وغیرہما؟ یہ لفظ کتب حدیث میں تو کہیں نہیں ملتا، آپ کے سوال سے تو معلوم ہوتا ہے کہ آپ محاکمہ چاہتے ہیں تو وہ موقوف ہے ہر دو کے دلائل کے معلوم ہونے پر، آپ نے کسی کی دلیل بھی نہیں لکھی۔

(۲) یہاں بھی دونوں کی دلیل لکھئے، تب محاکمہ سوال کیجئے۔

(۳) افتتاح صلوۃ کے وقت رفع یدین احادیث کثیرہ سے ثابت ہے،(۱) اس کے علاوہ بعض مواقع میں دونوں طرح کی روایات موجود ہیں۔(۲)

(۴) یہاں بھی دونوں کی دلیلیں لکھئے، نیز صحیح حدیث کی تعریف کیجئے، مگر یہ تعریف کتاب وسنت سے کیجئے۔

(۵) کیا کسی صحیح حدیث میں تراویح کا لفظ آیا ہے؟ نیز مرفوع حدیث کی تعریف کیا ہے، جوبات لکھیں سرور عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے صحیح فرمان سے لکھیں۔ فقط واللہ تعالیٰ اعلم

حررہ العبد محمود غفرلہ، دار العلوم دیوبند، ۱۳/۴/۱۳۸۸ھ۔

الجواب صحیح: بندہ محمد نظام الدین عفی عنہ، دار العلوم دیوبند، ۱۳/۴/۱۳۸۸ھ۔ (فتاویٰ محمودیہ: ۵/۶۰۵-۶۰۶)

---

(۱) عن سالم بن عبدالله عن أبيه أن رسول الله صلى الله عليه وسلم، كا ن يرفع يديه حذو منكبيه، إذا افتتح الصلٰوة، وإذا كبر للركوع، وإذ رفع رأسه من الركو ع ، رفعهما كذلك أيضاً وقال: "سمع الله لمن حمده، ربنا ولك الحمد" وكان لايفعل ذلك في السجود". (صحيح البخارى، كتا ب الأذان، باب رفع اليدين، في التكبيرة الأولٰى مع الافتتاح سواءً: ۱/۱۰۲، قديمى)(حديث نمبر: ۷۳۵، انيس)

"وعن على بن أبى طالب رضى الله عنه، عن رسول الله صلى الله عليه وسلم أنه كا ن إذ اقام إلى الصلٰوة المكتوبة ، كبر "ورفع يديه حذومنكبيه". (الحديث)(رواه الخمسة وصححه أحمد و الترمذى)

"وعن أبى حميد الساعدى رضى الله تعالٰى عنه قال: كا ن النبى صلى الله عليه وسلم: إذا قام إلٰى الصلٰوة رفع يديه حتٰى يحاذى بهما منكبيه " الحديث أخر جه الخمسة إلاالنسائى، وصححه الترمذى ". (آثار السن، أبواب صفة الصلاة، باب رفع اليدين عند تكبيرة الإحرام وبيان مواضعه: ۸۱، إمداديه ملتان (ح: ۳۱۵-۳۱۶) انيس)

(۲) وعن عبدالله بن عمر رضى الله تعالٰى عنهما أن رسول الله صلى الله تعالٰى عليه وسلم كان يرفع يديه حذو منكبيه إذا افتتح الصلٰوة، وإذا كبر للركوع، وإذا رفع راسه من الركوع رفعهما كذلك أيضاً، وقال: "سمع الله لمن حمده، ربنا ولك الحمد"، وكان لا يفعل ذلك فى السجود". (رواه الشيخا ن)

قال النيموى: وفي الباب عن أبى حميد الساعدى رضى الله تعالٰى عنه ومالك بن الحويرث ووائل بن حجر وعلى وغير هم . رضى الله تعالٰى عنهم من أصحا ب النبى صلى الله تعالٰى عليه وسلم ". (آثار السنن ، باب رفع اليدين عند الركوع وعند رفع الرأس من الركوع: ۱۲۹، إمداية، ملتان (أبواب صفة الصلاة (ح: ۳۹۳) انيس) ==

احکام کا مدار کتاب وسنت پر ہے، بخاری پر نہیں:

سوال: کیا فرماتے ہیں علما دین شرع متین اس مسئلہ کے بارے میں کہ ایک مقلد حنفی شخص نے رفع الیدین شروع کیا ہے اور کہتا ہے کہ مجھے عدم رفع الیدین پر دلیل دی جائے اور وہ بھی صرف بخاری شریف سے اور کسی کتاب کو نہیں مانتا ہوں، اس کی وضاحت فرماویں؟ بینوا توجروا۔

(المستفتی: حافظ افتخار علی شاہ خطیب جامع مسجد تقویٰ نوشہرہ۔ ۱۹۸۴/۲/۷ء)

الجواب

اس شخص سے آپ پوچھیں کہ آپ کے نزدیک بخاری حجت ہے، یا حدیث؟ اور یہ پوچھ لیں کہ جب بخاری شریف میں متضاد احادیث موجود ہوں، مثلاً احادیث جلسہ استراحت تو اس میں آپ کا کیا رویہ ہے؟ اور ان سے پوچھیں کہ بخاری شریف میں یہ کہاں ہے کہ پیغمبر علیہ السلام نے "دائماً حتیٰ الموت" رفع الیدین کیا ہے اور ترک نہیں کیا ہے۔(۱) **وھوالموفق** (فتاویٰ فریدیہ: ۲/۲۵۳-۲۵۴) ☆

== "عن علقمة قال: قال عبدالله بن مسعود رضى الله تعالىٰ عنه: ألا أصلى بكم صلوة رسول الله صلى الله عليه و سلم؟فصلىٰ،فلم يرفع يديه إلا فى أول مرة". رواه الثلاثة، وهوحديث صحيح ".

"عن أسود قال: رأيت عمربن الخطاب رضى الله تعالىٰ عنه يرفع يديه فى أول تكبيرة ثم لايعود ".(رواه الطحاوى وأبو بكر بن أبى شيبة وهو أثرصحيح ".(آثا رالسنن، باب ترك رفع اليدين فى غير الإفتتاح: ١٣٢. ١٣٦، إمدادية،ملتان)(أبواب صفة الصلاة (ح:٤٠٣-٤٠٤) انيس)

(۱) عن براء بن عازب قال أن رسول الله صلى الله عليه وسلم كان إذا إفتتح الصلاة رفع يديه إلىٰ قريب من أذنيه ثم لا يعود.(سنن أبى داؤد،باب من لم يذكرالرفع عند الركوع: ١/١١٦ (كتاب الصلاة،رقم الحديث: ٧٤٩،بيت الأفكار،انيس)

عن علقمة قال قال لنا عبد الله بن مسعود ألا أصلى بكم صلاة رسول الله صلى الله عليه وسلم؟فصلىٰ فلم يرفع يديه إلا مرة واحدة مع تكبيرةالافتتاح.(رواه الترمذى)(كتاب الصلاة،باب ماجاء أن النبى صلى الله عليه وسلم لم يرفع إلا فى أول مرة: ٦٣ (ح:٢٥٧)بيت الأفكار،انيس)/وأبوداؤد (كتاب الصلاة،باب من لم يذكرالرفع عند الركوع :١٠٢ (ح:٧٤٨)بيت الأفكار،انيس)/والنسائى (الصلاة،الرخصة فى ذلك: ١/ ١٤٠٥ (ح:١٠٥٧) دارالمعرفة، بيروت،انيس)/مشكاة المصابيح،باب صفة الصلاة: ١/ ٧٧)(الفصل الثالث (ح:٨٠٩،المكتب الإسلامى،انيس)

☆ **جدت پسندی کے مرض کا انجام بھیانک ہوتا ہے:**

سوال: السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ! اما بعد میں حنفی ہوں اور مقلد ہوں؛ لیکن رفع الیدین کی احادیث بھی موجود ہیں، اب میں باقاعدہ رفع الیدین کرتا ہوں آیا اس کا ثواب ہے یا عذاب، براہ کرم جواب سے مستفید فرمائیں؟ بینوا توجروا۔

(المستفتی: فضل عالم بڈھ بیر پشاور......۱۹۷۶/۵/۱۲ء)

الجواب

محترم! وعلیکم السلام کے بعد، واضح رہے اگر آپ شاہ ولی اللہؒ جیسے محقق ومدقق عالم نہ ہوں تو آپ جدت پسندی کے مریض ہیں، ایسے مریض پر رفتہ رفتہ الحاد وزندقہ میں مبتلا ہونے کا خطرہ ہوتا ہے، علماء احناف حدیث کو حدیث کی وجہ سے ترک کرتے ہیں، افسوس ہے کہ آپ حنفیت کو اپنی رائے سے ترک کرتے ہیں، اللہ کریم آپ کو استقامت کی نعمت سے نوازے۔ فقط (فتاویٰ فریدیہ: ۲/۲۲۶)

نماز میں عدم رفع الیدین اور تقلید فیصلہ شدہ مسائل ہیں:

سوال: مسئلہ رفع الیدین کے متعلق بخاری شریف: ۴۶۸ میں ابن عمر رضی اللہ عنہ کی روایت، مسلم شریف میں ابوقلابہ، جابر بن سمرہ اور بیہقی میں ہے کہ خلفاء اربعہ رفع الیدین کرتے تھے، اسی طرح فاتحہ خلف الامام بھی ثابت ہے۔ (بخاری: ۴۸۰، ترمذی: ۱۰۵) اس کا کیا جواب دیں گے، نیز تقلید شخصی کی وضاحت فرمائے؟ بینوا توجروا۔

(المستفتی: حکیم اللہ، محمد یوسف مسکین پور شریف مظفر گڑھ۔ ۱۸/۶/۱۹۷۵ء)

الجواب ـــــــــــــــــــــــــــــــ

محترم المقام!

یہ فیصلہ شدہ مسائل ہیں، ان کے ہر پہلو پر علما نے بحث کی ہے، آپ عینی اور معارف السنن کی مراجعت کریں اور تشفی حاصل کریں، البتہ تقلید شخصی کے متعلق واضح رہے کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں اس تقلید پر انکار کیا ہے کہ امام اور مقلد کے پاس ہدایت اور عقل نہ ہو؛ یعنی نہ دلیل نقلی ہو اور نہ دلیل عقلی ہو۔ حیث قال: ﴿**أولو كان آبائهم لا يعقلون شيئاً ولا يهتدون**﴾ (۱) مطلق تقلید شخصی پر انکار نہیں کیا ہے، لہٰذا وہ تقلید شخصی منکر نہ ہوگا، جس کے امام متعلقہ کے ساتھ دلیل عقلی یا نقلی موجود ہو، نیز ﴿**فاسئلوا أهل الذكر إن كنتم لا تعلمون**﴾ (۲) بھی ہے اور قرآن مطلق ہے، یعنی ہر حادثہ میں صرف ایک اہل ذکر کی مراجعت کرے اور جدا جدا اہل ذکر کی مراجعت کرنا دونوں کا مجوز ہے، **والأول هو التقليد الشخصي**، نیز تقلید شخصی خیر القرون میں بلانکیر موجود ہوئی ہے تو یہ سنت ہوگی، نہ کہ بدعت؛ **لأن الأئمة الأربعة كانوا أئمة في حياتهم فافهم ولا تجعل**، نیز حدیث: **عليكم بالسواد الأعظم** (۳) بھی تقلید شخصی کی افضلیت کا مؤید ہے؛ کیوں کہ ہر زمانہ میں خواص کا سواد اعظم مقلد رہا ہے، ''**كما لا يخفى على من راجع إلى تاريخ المحدثين والشارحين للحديث والفقهاء وأصحاب الطريقة من الشيوخ وأما غير المقلدين فإنهم يقلدون(في الحقيقة)أئمة شر القرون ويذرون أئمة خير القرون تلك قسمة ضيزى وهو الموفق**(فتاویٰ فریدیہ: ۲/۲۳۶-۲۳۷)

(۱) سورة البقرة: ۱۷۰۔

(۲) سورة النحل: ۴۳۔

(۳) عن ابن عمر قال قال رسول الله صلى الله عليه وسلم إتبعوا السواد الأعظم فإنه من شذ شذ في النار. (رواه ابن ماجة، من حديث أنس. (مشكوة المصابيح، باب الاعتصام والسنة، كتاب الإيمان: ۳۰/۱)(الفصل الثاني، رقم الحديث: ۱۷۴، المكتب الإسلامي، انیس)

غیر مقلدین کا رفع الیدین کرنا ہماری تحقیق کی بنا پر غلط

اور ان کا "أيها النبی" کے بجائے "علی النبی" پڑھنا خلاف احتیاط ہے:

سوال: کیا فرماتے ہیں علما دین شرع متین اس مسئلہ کے بارے میں کہ!

(۱) ہمارا ایک ساتھی رفع الیدین کرتا ہے اور دوسروں کو ایسا کرنے کی ترغیب دیتا ہے، کیا اس کے لئے ایسا کرنا اور دوسروں کو ترغیب دینا جائز ہے؟

(۲) نیز ہمارا یہ ساتھی تشہد میں "السلام علیک أيها النبی" کے بجائے "علی النبی" پڑھتا ہے اور اس کو محتاط قرار دیتا ہے اور دوسروں کو ترغیب بھی دیتا ہے کیا ایسا کرنا جائز ہے؟ بینوا توجروا۔

(المستفتی: ایم نثار محمد کوثر پڑانگ چارسدہ۔۵/۵/۱۹۶۹ء)

الجواب

(۱) یہ شخص کوئی غیر مقلد معلوم ہوتا ہے، لہٰذا وہ ہماری تحقیق کی بنا پر غلطی پر ہے۔(۱) (فتاویٰ فریدیہ: ۲/۲۴۹)

---

(۱) قال العلامة ابن عابدين: الدليل الشرعی اقتضی العمل بقول المجتهد وتقليده فيه فيما احتاج إليه وهو: ﴿فاسئلوا أهل الذكر﴾(سورة النحل: ٤٣، انيس) والسوال إنما يتحقق عند طلب وضع اليدين تحت الصدر أو تحت السرة، نعم قالوا: أن اختلاف الكيفيات الواردة محمول علیٰ اختلاف الأوقات والتوسع صرح به العينی والنووی ولأن آثار الصحابة وردت فی فعلها دون منعها مثل أثر ابن عمر رضی اللّٰه عنهما رواه احمد وأثر معاذ بن جبل رواه الطبرانی وأثر أبی هريرة رواه عبد الرزاق وأثر عقبة بن عامر رواه الحاكم فی تاريخه وأثار الصحابة تكفی لأثبات الاستحباب وكذا هی دالة علیٰ عدم النسخ ولأن ظاهر الرواية سكتة عنها وغيرها ناطقة بها فتعين المصير إليها، ولأن من رجح الإشارة من مشايخنا فهم الذين جمعوا بين الفقة والحديث بخلاف من رجح نفيها، فإن قيل لم يرو البخاری حديث الإشارة، قلنا ليس هو علیٰ شرط البخاری والحجة عندنا وعند الإمام البخاری هو الحديث الثابت دون ما هو علیٰ شرط البخاری، فإن قيل لم يذكر صاحب الهداية الإشارة قلنا لم يتعرض لها صاحب الهداية. فی الهداية لا نفيا ولا اثباتًا لعدم ذكرها فی ظاهر الرواية نعم ذكرها فی مختارات النوازل فإن قيل ذكر فی ظاهر الرواية بسط الأصابع عند القعدة قلنا البسط عند أول القعود لاينافی القبض عند الشهادة، فإن قيل ورد فيه لفظ "وعليه الفتویٰ" قلنا من قال أن لفظ "وعليه الفتویٰ" الآكد خالف عن قوله وأفتیٰ بخلافه، فعلم أن الاعتبار لقوة المدرک والدليل عند الاختلاف بين الخواص وبه يحصل قطع النزاع وبه وقع عمل السلف والخلف. (منهاج السنن شرح جامع السنن، باب ماجاء فی الإشارة: ١/١٦٦-١٦٧)

حكم الحادثة المعينة، فإذا ثبت عنده قول المجتهد وجب عمله به، وأما التزامه فلم يثبت من السمع اعتباره ملزمًا إنما ذلک فی النذر، ولافرق فی ذلک بين أن يلتزمه بلفظه أو بقلبه، علیٰ أن قول القائل... فلانًا فيما أفتیٰ به تعليق التقليد والوعد به، ذكره المصنف اهـ (كتاب الحدود، باب التعزير، فروع: أرتدت لتفارق زوجها تجبر علیٰ الإسلام. (مطلب فيما إذا ارتحل إلیٰ غير مذهبه: ٦/١٣٣، دار الكتب العلمية، بيروت، انيس)

ترک رفع یدین کے بارے میں ایک نایاب تحریر(۱):

(قوله: وكان يفعل ذٰلك، إلخ). (۲)

اس حدیث میں دو امر مختلف فیہ ہیں:

اولاً: یہ کہ (یرفع یديه حذو منكبيه)، اس کا جواب تو یہ ہے کہ دونوں امر آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے ثابت ہیں، بعض روایات سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ ہاتھ مونڈھوں تک اٹھاتے تھے، چنانچہ اس روایت سے ظاہر ہے اور بعض روایات میں صراحۃً یہ الفاظ مذکور ہیں کہ آپ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم ہاتھوں کانوں کی لوتک اٹھاتے تھے، (۳) یہ تو زیادہ جھگڑے کی بات نہیں ہے۔

ثانیاً: یہ ہے کہ "وكان يفعل ذلك" إلخ، اس روایت سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم رفع یدین فرماتے تھے اور مسلک حنفیہ اس کے خلاف ہیں۔ (۴)

(۱) حضرت کے مسودات میں ایک مختصر تحریر ترک رفع یدین پر موصول ہوئی تو مناسب معلوم ہوا کہ اسے بھی مرغوب الفتاویٰ میں شامل کرلیا جائے، چونکہ دادا کی ایک تحریر پر راقم کا حاشیہ تھا، اس لئے اسے "سعی المرغوبین علیٰ ترک رفع الیدین" کے نام سے موسوم کیا گیا۔

از

حضرت مولانا مفتی مرغوب احمد صاحب لاجپوری

تحشیہ وتحقیق

مرغوب احمد لاجپوری

(۲) یہ روایت بخاری شریف کی ہے، اس کے الفاظ یہ ہیں: "عبد اللّٰه بن عمر رضی اللّٰه تعالیٰ عنهما قال: رأيتُ رسول اللّٰه صلى اللّٰه عليه وسلم إذا قام في الصلاة، رفع يديه حتىٰ يكونا حذو منكبيه، وكان يفعل ذلك حين يكبر للركوع ويقول: سمع اللّٰه لمن حمده، ولا يفعل ذلك في السجود". (صحيح البخاري، باب رفع اليدين إذا كبر وإذا ركع وإذا رفع: ۱۰۲/۱، (كتاب الأذان، رقم الحديث: ۷۳٦، بيت الأفكار، انيس)

"حضرت ابن عمرؓ فرماتے ہیں کہ: میں نے رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو دیکھا کہ جب آپ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نماز کے لئے کھڑے ہوئے تو آپ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے دونوں ہاتھ اٹھائے یہاں تک کہ وہ آپ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے دونوں مونڈھوں کے مقابل ہوگئے اور حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم یہی عمل کرتے تھے جب رکوع کے لئے تکبیر کہتے تھے اور یہی عمل کرتے تھے جب رکوع سے سر اٹھاتے تھے اور "سمع الله لمن حمده" کہتے تھے اور سجدوں میں یہ عمل نہیں کرتے تھے۔ (تسہیل ادلہ کاملہ: ۲۷)

(۳) عن البراء أن رسول اللّٰه صلى اللّٰه تعالىٰ عليه وسلم كان إذا إفتتح الصلاة رفع يديه إلىٰ قريب أذنيه ثم لا يعود. (أبو داؤد، باب من لم يذكر الرفع عند الركوع: ۱۰۹/۱ (كتاب الصلاة، باب من لم يذكر الرفع عند الركوع، رقم الحديث: ۷٤۹، بيت الأفكار، انيس) /شرح معاني الآثار: ۱۱۰/۱، باب التكبير للركوع والتكبير للسجود والرفع من الركوع هل مع ذلك رفع أم لا؟/مصنف ابن أبي شيبة: ۲٦۷/۱، تحت باب من كان يرفع يديه في أول تكبيرة ثم لا يعود)

(۴) حنفیہ کے نزدیک رکوع میں جاتے اور رکوع سے اٹھتے وقت رفع یدین مکروہ یعنی خلاف اولیٰ ہے۔

اس سے معلوم ہوا کہ یہ وجہ نہیں؛ بلکہ صرف وجہ یہی ہے کہ خواہشات نفسانی اور ہوا و ہوس یہ باعث اختلاف ہیں، چنانچہ دیوبند وغیرہ میں بعض موقعوں میں یہ واقعات پیش آئے کہ کسی حنفیہ کی مساجد میں کسی نے رفع یدین و آمین بالجہر کی اور حنفیہ چونکے، مگر جب یہ کہہ دیا کہ یہ شافعی ہے، تمام جوش وخروش دفع ہوگیا، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ اختلافات باعث نزاع نہیں۔

اب رہا اس حدیث کے متعلق حنفیہ یہ جواب دیتے ہیں کہ امر ابتدائے اسلام میں مشروع تھے اور بعد میں متروک ہوگئے۔(۱)

چنانچہ عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ نے ایک شخص کو دیکھا کہ وہ رفع یدین کرتا تھا تو اس نے فرمایا کہ یہ نہ کرو؛ کیوں کہ یہ ایسا فعل ہے کہ جس کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کیا اور بعدازاں آپ نے (اس کو) چھوڑ دیا۔(۲)

یہ جواب تو بنابر نسخ کا ہے کہ اس کو منسوخ مان لیا جاوے، چنانچہ بعض حضرات کی تقریر سے بھی یہی ثابت ہوتا ہے کہ نسخ کے قائل ہوگئے۔

میں کہتا ہوں کہ بالفرض والتسلیم یہی مان لیا جاوے کہ نسخ نہیں، پھر بھی متعارض حدیثوں سے یہ بات ثابت ہوتی

== شامی میں ہے: ''قوله: (ألا في سبعة) أشار إلٰى أنه لا يرفع عند تكبيرات الانتقالات، خلافاً للشافعي و أحمد فيكره عندنا ولا يفسد الصلاة إلا في رواية مكحول عن الإمام'' (ردالمحتار، كتاب الصلاة، باب صفة الصلاة، آداب الصلاة، مطلب: في إطالة الركوع للجائي: ۱/۵۰۶، انیس)

صاحب درمختار نے اپنے قول ''الا فی سبع'' سے اس طرف اشارہ کیا ہے کہ تکبیرات انتقالیہ کے وقت ہاتھ نہیں اٹھائے جائیں گے۔ اس مسئلہ میں امام شافعیؒ اور امام احمدؒ کا اختلاف ہے، پس ہاتھ اٹھانا ہمارے نزدیک مکروہ ہے اور نماز فاسد نہیں ہوتی۔ (شامی: ۱/۳۷۴۔ ادلہ کاملہ: ۲۵)

ہم میں اور غیر مقلدوں میں جو باہمی نزاع ہو رہا ہے اس کی بنا یہ اختلاف نہیں کہ وہ تو رفع یدین کرتے ہیں اور ہم نہیں کرتے، اگر یہی باعث نزاع ہوتو اولاً شافعیہ سے ہونا چاہئے۔

اس لئے کہ امام شافعیؒ کے نزدیک رفع یدین سنت ہے، امام شافعیؒ حضرت ابن عمرؓ کی روایت ذکر کرنے کے بعد فرماتے ہیں:

''وبهٰذا نقول، فنأمر كل مصل إماماً أو مأموماً أو منفردا، رجلاً أو امرأةً، أن يرفع يديه إذا إفتتح الصلاة و إذا كبر للركوع وإذا رفع رأسه من الركوع''۔

''یہی ہمارا مذہب ہے، چنانچہ ہم ہر نمازی کو حکم دیتے ہیں خواہ وہ امام ہو یا مقتدی یا منفرد، مرد ہو یا عورت کہ وہ اپنے دونوں ہاتھ اٹھائے جب نماز شروع کرے، جب رکوع کے لئے تکبیر تحریمہ کہے اور جب اپنا سر رکوع سے اٹھائے۔ (کتاب الأم: ۱/۱۲۶۔ ادلہ کاملہ: ۲۶)

(۱) حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ فر سے مروی ہے:

''رفع رسول الله صلى الله تعالىٰ عليه وسلم فرفعنا وترك فتركنا'' ۔یعنی رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے رفع یدین کیا تو ہم نے بھی کیا، حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ترک کردیا تو ہم نے بھی ترک کردیا۔ (بدائع الصنائع، حكم رفع اليدين، كتاب الصلاة: ۱/۴۸۵)

(۲) عمدة القاری: ۵/۲۷۳۔

ہے کہ بعض سے استحباب معلوم ہوتا ہے اور بعض سے مکروہ تو اب عمدہ امر کیا ہے؟ ظاہر بات ہے کہ ترک مکروہ اولیٰ ہے۔(۱) کیونکہ غایت مافی الباب کرنے میں صرف یہی ہوگا کہ ترک فعل کا ثواب نہ ملا اور کرنے میں مرتکب فعل کراہیت کا لازم آئے گا، تو بہتر یہی ہے کہ کراہیت کو ترک کرے۔

دوسری بات یہ ہے کہ جب ایک مستحب فعل کے اختیار پر فساد وفتنہ کا خوف ہو تو اس کا ترک ضروری ہے، اب تمہیں غور کرو کہ اس استحباب کے اختیار پر کس قدر فتنہ وفساد برپا ہوتے ہیں۔

دیگر امر یہ ہے کہ حضرت امام ابوحنیفہؒ واوزاعیؒ کا اجتماع مکہ معظمہ، (۲) میں ہوا تو اوزاعیؒ نے کہا: کیا وجہ ہے کہ آپ رفع یدین نہیں کرتے؟ امام صاحبؒ نے فرمایا کہ مجھے اس میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے کوئی صحیح مضمون نہیں پہنچا، اوزاعیؒ نے کہا: کیوں نہیں پہنچا، حالانکہ مجھ سے زہریؒ نے عن سالم عن ابیہ کی روایت سے بیان کیا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم رفع یدین فرماتے تھے، امام صاحبؒ نے فرمایا مجھ سے حماد نے عن ابراھیم عن علقمہ عن عبداللہ بن مسعود بیان کیا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم سوائے تکبیر افتتاح کے ہاتھ نہیں اٹھاتے تھے، اوزاعیؒ نے کہا کہ میں زہری سالم اور ابن عمر سے بیان کر رہا ہوں اور آپ اس کے مقابلے میں حماد، ابراھیم، اور علقمہ سے بیان کرتے ہیں۔

مطلب یہ ہے کہ میری حدیث میں راوی تین ہیں اور قوی ہیں اور آپ چار راوی سے بیان کرتے ہیں اور ہم سے قوی نہیں، امام صاحبؒ نے فرمایا کہ حماد فقہ میں زہری سے بہت بڑھ کر ہیں اور ابراہیم سالم سے بڑھ کر ہیں اور حضرت علقمہ ابن عمرؓ سے فقہ میں کم نہیں، (۳) اگر چہ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کو صحبت کی فضیلت بہت ہے؛ لیکن تفقہ

---

(۱) ملا علی قاریؒ تحریر فرماتے ہیں:

”وفيه من أصر علىٰ أمر مندوب وجعله عزماً ولم يعمل بالرخصة فقد أصاب منه الشيطان من الاضلال فكيف من أصر علىٰ بدعة أومكروه“. (مرقاۃ المفاتیح شرح مشکاۃ المصابیح: ۳۵۳/۲) (باب الدعاء فی التشهد: ۷۵۵/۲، دار الفکر بیروت. انیس) (یعنی جوکوئی امر مندوب یا مستحب پر ایسا اصرار کرے کہ اس کو واجب اور لازم کرلے اور کبھی جواز اور رخصت پر عمل نہ کرے تو بیشک ایسے شخص کو گمراہ کرنے میں شیطان کامیاب ہوگیا، تو جو شخص بدعت یا فعل منکر پر اصرار کرے گا اس کا کیا حکم ہوگا۔)

اور علامہ طاہر پٹنیؒ نے تو یہاں تک لکھا کہ کسی امر مستحب کو اس کے مرتبہ سے بڑھا دیا جائے تو وہ مکروہ ہوجاتا ہے۔

”أن المندب وبينقلب مكروهاً إذاخيف أن يرفع عن رتبة“. (مجمع البحار: ۲۲٤/۲ - فتاویٰ رحیمیہ: ۳۶/۳)

”كل مباح يؤدى إلىٰ زعم الجهال سنية أمرأووجوبه فهومكروه“. (تنقيح الفتاویٰ الحامدية: ۳۶۷/۲) (مسئلة أفتى أعلام بتحريم شرب الدخان: ۲۳۳/۲، دار المعرفة بيروت/ قنية المنية لتتميم الغنية، باب في سجدة التلاوة والشكر، قبيل باب صلاة المسافر: ۲۵، مخطوطة جامعة الملک سعود. انيس)

(۲) مکہ معظمہ کی دار الحناطین (گیہوں کی منڈی) میں یہ مناظرہ ہوا ہے۔

(۳) اور یہ کوئی مستبعد نہیں؛ اس لئے کہ یہ ممکن ہے کہ کوئی غیر صحابی فقہی مہارت میں کسی صحابی کے برابر یا ان سے بھی بڑھ کر ہو، جس کی دلیل نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد ہے:

==

میں ان سے کسی درجہ کم نہیں اور حضرت عبداللہ بن مسعودؓ تو عبداللہ ہی ہیں تو میرے نزدیک ترجیح تفقہ (۱) کی وجہ سے انہیں راوی کو ہے۔ (۲)

دوسرا یہ کہ کثرت سے جلیل القدر صحابہ کرامؓ کی رائے یہی ہے کہ ترک کرنا چاہئے، چنانچہ بعض کتابوں سے تو عشرہ مبشرہ رضوان اللہ علیہم اجمعین کا مسلک یہی معلوم ہوتا ہے۔ (۳)

== فرب حامل فقه غير فقيه ورب حامل فقه إلى من هو أفقه منه. (في حديث ابن مسعود في مشكوة المصابيح، الفصل الثاني من كتاب العلم: ٣٥). (درس ترمذی ۱۴۵/۲ حاشیۃ: ۱)

اس کی تائید اس بات سے بھی ہوتی ہے کہ ابونعیم نے "حلیۃ الاولیاء" ۹۸/۲، ترجمہ ۱۶۴، میں قابوس ابن ابوظبیان سے نقل کیا ہے کہ میں اپنے والد سے پوچھا "لأي شئ كنت تأتي علقمة وتدع أصحاب النبي صلى الله عليه وسلم" تو ابوظبیان نے جواب میں فرمایا: "رأيت أصحاب النبي صلى الله عليه وسلم يسألون علقمة ويستفتونه" اس سے حضرت علقمہ کی فقاہت کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ (درس ترمذی: ۴۵/۲)

(۱) الترجيح بفقه الرواة لا بعلو الأسناد" یہ صرف امام ابوحنیفہؒ ہی کا اصول نہیں، بلکہ دوسرے محدثین بھی اسے تسلیم کرتے ہیں، چنانچہ امام حاکمؒ نے اپنی کتاب "معرفة علوم الحديث: ١١" میں اپنی سند کے ساتھ علی بن خشرمؒ کا یہ قول نقل کیا ہے:

"قال لنا وكيع أي الاسنادين أحب إليك، الأعمش عن أبي وائل عن عبد الله أو سفيان عن منصور عن إبراهيم عن علقمة عن عبد الله".

علی بن خشرمؒ فرماتے ہیں، میں نے جواب دیا:

"الأعمش عن أبي وائل".

تو وکیعؒ نے فرمایا:

"يا سبحان الله! الأعمش شيخ وأبو وائل شيخ وسفيان فقيه ومنصور فقيه وإبراهيم وعلقمة فقيه، وحديث يتداوله الفقهاء خير من حديث يتداوله الشيوخ"۔

اس سے معلوم ہوا کہ عام محدثین کے نزدیک بھی حدیث مسلسل بالفقہا علو اسناد کے مقابلہ میں راجح ہے۔ (درس ترمذی: ۴۶/۲)

(۲) ذكرها الإمام السرخسي في كتابه "المبسوط" ١٤/١ وابن الهمام في "فتح القدير" ٢١٩/١ والحارث في "جامع المسانيد" ٢٥٣/١ـ٣٥٣. معارف السنن: ٤٩٩/٢ /زجاجة المصابيح: ٢٢٩/١ /نور المصابيح ترجمه زجاجة المصابيح: ٢١١/٢ـ٢١٢ /عيني شرح الهداية: ٦٦٨/١ /مناقب موفق: ١٣١/١ /فتاوىٰ بزازية: ١٧٤/١ / كبيري: ٣٢٥/ كفاية: ٢٧١/١ /إعلاء السنن: ٥٩/٣ /إيضاح الأدلة: ٧٣)

(۳) حضرت ابوبکر صدیقؓ، حضرت عمرؓ، حضرت علیؓ، حضرت عبداللہ بن مسعودؓ، حضرت ابو ہریرۃؓ، حضرت عبداللہ بن عمرؓ، حضرت ابوسعید خدریؓ وغیرہ کے بارے میں روایت میں ہے کہ یہ حضرات رفع یدین نہیں فرماتے تھے۔ (حوالہ کے لئے دیکھئے! حدیث اور اہل حدیث: ۳۹۰-۴۰۹/ رسول اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کا طریقۂ نماز: ۱۹۲)

عشرۂ مبشرہ وہ دس جلیل القدر صحابہ کرامؓ کہلاتے ہیں جنہیں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے دنیا ہی میں جنت کی خوش خبری سنا دی تھی، وہ دس صحابہؓ یہ ہیں: حضرت ابوبکرؓ، حضرت عمر فاروقؓ، حضرت عثمان غنیؓ، حضرت علی مرتضیٰؓ، حضرت طلحہ بن عبید اللہؓ، حضرت زبیر بن العوامؓ، حضرت عبدالرحمن بن عوفؓ، حضرت سعد بن ابی وقاصؓ، حضرت سعید بن زیدؓ، حضرت ابوعبیدہ بن الجراحؓ"۔ (ترمذی: ۲۱۶/۲) ==

رہی ابن عمرؓ کی حدیث اس کا جواب یہ ہے کہ طحاویؒ نے مجاہد سے صحیح اسناد سے روایت کی ہے کہ میں نے عبداللہ بن عمرؓ کے پیچھے نماز پڑھی تو انہوں نے سوائے تکبیر افتتاح کے کہیں ہاتھ نہیں اٹھایا۔(۱) طحاوی کہتے ہیں: حضرت عبداللہ بن عمرؓ باوجود اس درجہ متبع سنت نبوی کے، چنانچہ مدینہ کے راستے میں جس مقام پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اتفاقی طور پر نماز پڑھی تھی، ان موقعوں کو انہوں نے بڑی تلاش کے بعد یاد کر لئے تھے اور جب کہیں اس نواح میں گذرنا ہوتا تو وہیں نماز پڑھتے تھے۔

اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ یہ حضرات بھی منسوخ ہی سمجھتے تھے، ورنہ ان کی ذات سے اتباع نہ ہونا بعید از قیاس معلوم ہوتا ہے، اس پر مخالفین ایک روایت پیش کرتے ہیں کہ طاؤسؒ کہتے ہیں کہ میں نے حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ کو دیکھا کہ آپ اسی طرح نماز پڑھتے تھے، جس طرح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے تو یہ روایت ہمارے مسلک کے خلاف نہیں ہوسکتی ہے، اس واسطے ہوسکتی ہے، یہ بات کہ یہ فعل حضرت ابن عمرؓ کا انہیں نسخ کا ثبوت ہونے کے قبل کا ہو، پھر جب انہیں ثبوت نسخ ہوگیا، چھوڑ دیا اور اس فعل کو اختیار کیا، جس کو مجاہدؒ نے روایت کیا۔(۲)

اس میں ہمارے مولاناؒ (۳) کی رائے یہ ہے کہ جو لوگ اس کے قائل ہیں کہ رفع یدین کرنا چاہئے، وہ تو ہیں مثبت اور جو یہ کہتے ہیں کہ نہیں کرنا چاہئے، وہ ہیں نافی؛ اس لئے جو مثبت ہے، انہیں یہ امر ثابت کرنا چاہئے کہ یہ ثبوت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے بلا معارض ثابت ہے اور اس کا ثبوت نہیں ہوسکتا تو مدعا ثابت نہ ہوگا؛ چنانچہ عدالت میں بھی یہی قاعدہ ہے کہ اگر مدعی کی جانب سے گواہ اور بینہ ٹھیک نہ گذرے تو اس کا مدعا ثابت نہیں ہوسکتا، ہمارے

==   اب سب کے بارے میں حضرت عبداللہ بن عباسؓ فرماتے ہیں:

"العشرة الذين شهد لهم رسول الله صلى الله عليه وسلم بالجنة ماكانوا يرفعون أيديهم إلا فى افتتاح الصلاة". (عمدة القارى: ۲۷۲/۵، أوجز المسالك: ۲۰۸، نقلاً عن البدائع: ۲۰۷/۱)

(یعنی وہ دس صحابہؓ جن کے متعلق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دنیا ہی میں جنتی ہونے کی گواہی دے دی تھی، وہ لوگ صرف شروع نماز میں ہی اپنے ہاتھوں کو اٹھاتے تھے۔)

اگر ان میں سے کسی کے متعلق رفع یدین منقول ہے تو وہ ضعیف روایت ہے۔(آثار السنن ۱۰۱/۱، وغیرہ/رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا طریقۂ نماز: ۱۸۸)

(۱) عن مجاهد قال: صليتُ خلف ابن عمر رضى الله عنهما فلم يكن يرفع يديه إلا فى التكبيرة الأولى من الصلاة" (شرح معانى الآثار للطحاوى: ۱ / ۱۵۵) (كتاب الصلاة، باب التكبير للركوع والتكبير للسجود والرفع من الركوع هل مع ذلك أم لا؟ رقم الحديث: ۱۳۵۷، عالم الكتب، انيس)

(۲) شرح معانى الآثار للطحاوى، باب التكبير للركوع و التكبير للسجود: ۱۱۰/۱۔

(۳) شاید اس سے مراد حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن صاحب دیوبندیؒ ہیں۔(إيضاح الأدلة: ۷۲)

لئے تو صرف احتمال نکال دینا کافی ہے؛ کیونکہ ہم منکر ہیں اور منکر کے لئے انکار کافی ہے، اب جس کو ثابت کرنا ہو، وہ بینہ پیش کرے۔(۱)

دوسرے ہمارے مولانا ؒ یہ فرماتے تھے کہ قیاس کا مقتضا یہ ہے نہ کیا جاوے؛ کیونکہ یہ فعل ایک نماز میں زیادتی کرنا ہے، وجہ اس کی یہ ہے کہ ہاتھ اٹھانے میں سر یہ ہے کہ گویا باری تعالیٰ کے درگاہ میں کہنا ہے کہ اے الہ العالمین! ہم ماسوی اللہ سے دست بردار ہو کر تیری درگاہ میں حاضر ہوئے ہیں اور چونکہ ابتدائے نماز سے انتہیٰ تک ایک ہی فعل ہے، ماسوی اللہ سے بدست برداری حاصل کرنے کے بعد ایک ہی فعل میں لگا ہوا ہے، اس واسطے اب اسی فعل میں دوبارہ دست برداری کی ضرورت نہیں، ہاں! یہ نماز ختم ہونے اور پھر دوبارہ شروع کرنے وقت اب دست برداری کی ضرورت ہوگی۔(۲)

رہا یہ امر کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے دور میں اس کو کیوں اختیار کرتے تھے؟ اس کی وجہ یہ ہے کہ ابتدائے نماز میں ہر فعل اور ہر رکن جداگانہ سمجھے جاتے تھے، چنانچہ اس کے ثبوت میں اتنا کہہ دینا کافی ہے، جب اثنائے نماز بعض لوگ آکر شریک ہوجانا چاہتے تھے، اس وقت اپنے قریب والے سے دریافت کرلیا کرتے تھے کہ کتنی رکعتیں ہوئیں؟ جب معلوم کرلیتے، اتنی رکعت الگ ادا کرلیتے اور بعد ازاں نماز میں شریک ہوجاتے تھے، (۳) تو چونکہ اس وقت میں ہر فعل اور ہر رکن الگ تھا اس وجہ سے بار بار دست برداری کی ضرورت ہوتی تھی اور بعد میں چونکہ ہمارے لئے ایک بہت وحدانی اور ایک صورت مخصوصہ معلوم ہوگئی، لہٰذا اب اس کی بار بار ضرورت نہ رہی۔

رہا وتر وعیدین وغیرہ میں جو ہے، وہ خلاف قیاس ثابت ہے، اس کو اپنے ہی محل میں رکھنا چاہئے۔

---

(۱) مشہور حدیث ہے:

البينة على المدعي واليمين على المدعى عليه.(جامع الترمذي،باب ما جاء في أن البينة على المدعي واليمين على المدعى عليه أبواب الأحكام : ۲٤۹/۱) (رقم الحديث: ۱۳٤۲،بيت الأفكار،انيس)

(۲) دیکھئے! ادلہ کاملہ: ۳۰۔

(۳) ابوداؤد شریف کی ایک طویل حدیث میں ہے:

”كان الرجل إذاجاء يسأل فيخبر بما سبق من صلاته وإنهم قاموا مع رسول الله صلى الله عليه وسلم من بين قائم وراكع وقاعد ومصل مع رسول الله صلى الله عليه وسلم“.(أبو داؤد، باب كيف الأذان،كتاب الصلاة: ۷٤/۱، (رقم الحديث: ۵۰٦،بيت الأفكار،انيس)

”جب کوئی شخص مسجد میں آتا (اور دیکھتا کہ جماعت ہو رہی ہے) تو پوچھتا کہ کتنی رکعتیں ہوگئی ہیں؟ سو جتنی رکعتیں ہوچکی ہوتیں اس کو بتادیا جاتا اور وہ اس قدر نماز میں آکر شریک ہوجاتا، چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پیچھے لوگ مختلف حالتوں میں ہوتے تھے کوئی کھڑا ہے کوئی رکوع میں ہے کوئی قعدہ میں ہے تو کوئی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ پڑھ رہا ہے۔

سوال: قاعدہ یہ ہے کہ مثبت اور نافی میں تعارض ہو تو مثبت کو ترجیح ہوتی ہے تو یہاں پر رفع یدین کے مسلک ہی کو ترجیح ہونی چاہئے۔

جواب: اس کا جواب یہ ہے کہ یہ قاعدہ خبر میں جاری ہے، انشاء میں نہیں، اس واسطے کہ انشاء میں تو امر و نہی مقصود ہوتی ہے تو چونکہ وہ احکام ہے، لہٰذا وہاں یہ قاعدہ نہیں ہے اور خبر میں جاری ہے؛ کیوں کہ مثبت اور نافی کے معنی یہ ہے کہ مثبت اپنے ذمہ ایک امر کا ثبوت لیتا ہے کہ امر ثابت ہے، بخلاف نافی کے کہ وہ تو یہ کہتا ہے یہ امر ثابت نہیں؛ یعنی مطلب یہ ہے کہ مجھے مسلم نہیں تو وہ اپنے علم کی نفی کرتا ہے اور مثبت ایک امر دیگر کا اثبات کرتا ہے تو اس کا قول معتبر ہوگا، چنانچہ حضرت بلالؓ یہ کہتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کعبۃ اللہ میں نماز پڑھی اور ابن عباسؓ کہتے ہیں کہ نہیں پڑھی، (۱) اب اگر اس واقعہ کو ایک ہی فرض کریں تو یہ مطلب ہوگا کہ حضرت ابن عباسؓ اپنے علم اور رؤیا کی نفی کرتے ہیں اور حضرت بلالؓ ایک امر ثبوت اپنے ذمہ لیتے ہیں، تو حضرت بلالؓ کا قول معتبر ہوگا اور تعدد واقعہ پر حمل کیا جاویں تو دونوں قول صحیح ہیں، (۲) ایک وقت میں پڑھی اور ایک وقت میں نہیں پڑھی ہو تو اس وقت میں کچھ اختلاف نہیں۔ هٰذا أحسن الكلام في هذا المقام

بندہ مرغوب احمد غفرلہ، لاجپوری سورتی۔ (مرغوب الفتاویٰ: ۱۳۲/۲-۱۴۲)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نماز کا طریقہ:

سوال: اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کس طرح نماز پڑھتے تھے:

(۱) تکبیر تحریمہ کے بعد نیت کہاں باندھتے تھے، سینہ پر یا ناف کے نیچے؟

---

(۳) عن بلال رضي الله عنه أن النبي صلى الله عليه وسلم في جوف الكعبة ، قال ابن عباس رضي الله عنه لم يصل ولكنه كبر. (جامع الترمذي، باب ما جاء في صلاة الكعبة، أبواب الحج: ۱۷۶/۱ (ح: ۸۷٤) بيت الأفكار ، انيس)

(۱) سنن دارقطنی کی روایت سے تعدد واقعہ کی تائید ہوتی ہے اور لطف یہ ہے کہ وہ روایت حضرت ابن عباسؓ ہی کی ہے:

عن ابن عباس رضي الله تعالىٰ عنه قال: دخل رسول صلى الله عليه وسلم البيت، فصلىٰ بين الساريتين ركعتين ثم خرج فصلىٰ بين الباب والحجر ركعتين، ثم قال: هٰذه القبلة، ثم دخل مرة أخرىٰ فقام فيه يدعو، ثم خرج ولم يصل.

ایک اور روایت حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے مروی ہے کہ!

''دخل النبي صلى الله عليه وسلم البيت، ثم خرج وبلال خلفه، فقلتُ لبلال: هل صلىٰ؟ قال: لا، قال: فلما كان الغد دخل فسألت بلالاً هل صلىٰ؟ قال: نعم، صلىٰ ركعتين، استقبل الجزعة وجعل السارية الثانية عن يمينه". (سنن الدارقطني باب صلاة النبي صلى الله عليه وسلم في الكعبة، كتاب العيدين. رقم الحديث: ۱۷۲۹-۱۷۳۱)

ان روایات کی وجہ سے تقریباً تعدد واقعات کی صورت متعین ہو جاتی ہے۔ (درس ترمذی ۱۲۹/۳)

(۲) امام کے پیچھے سورۂ فاتحہ پڑھنا چاہیئے یا نہیں؟

(۳) آمین بلند آواز سے کہتے تھے یا پست آواز سے کہتے تھے؟

(۴) اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم رفع یدین کرتے تھے یا نہیں کرتے تھے؟ یا کس وقت تک رفع یدین کیا، یا کس وقت رفع یدین منسوخ ہوا؟

هو المصوب

(۱) اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے دونوں طریقے منقول ہیں۔(۱) احناف کے نزدیک ناف کے نیچے نیت باندھنا افضل ہے۔(۲)

(۲) امام کے پیچھے مقتدی کو سورہ فاتحہ نہیں پڑھنا چاہیے۔(۳)

---

(۱) احادیث میں علی الصدر فوق السرۃ اور تحت السرۃ تینوں الفاظ آئے ہیں:

عن وائل بن حجر قال صليت مع رسول الله تعالىٰ عليه موسلم فوضع يده اليمنىٰ علىٰ يده اليسرىٰ علىٰ صدره.(صحيح ابن خزيمة، كتاب الصلاة،باب وضع اليمين على الشمال في الصلاة،رقم الحديث: ٤٧٩)

عن جرير الضبي قال: رأيت علياً يمسك شماله بيمينه على الرسغ فوق السرة،قال أبو داؤد: روى عن سعيد ابن جبير فوق السرة وقال أبو مجلز: تحت السرة.(سنن أبى داؤد ،كتاب الصلاة،باب وضع اليمنىٰ على اليسرىٰ في الصلاة،رقم الحديث: ٧٥٧)

عن أبي جحيفة أن عليًا رضي الله تعالىٰ عنه قال: السنة وضع الكف على الكف في الصلاة تحت السرة.(سنن أبى داؤد، كتاب الصلاة،باب وضع اليمنىٰ على اليسرىٰ في الصلاة،رقم الحديث: ٧٥٦)

(۲) عن علقمة بن وائل بن حجر عن أبيه قال رأيت النبي صلى الله تعالىٰ عليه وسلم يضع يمينه علىٰ شماله في الصلاة تحت السرة.(مصنف ابن أبي شيبة ،باب وضع اليمين على الشمال،رقم الحديث: ٣٩٥٩)

(۳) اس مسئلہ میں بھی دونوں طرح کی روایتیں ہیں،فقہا احناف نے سورہ فاتحہ نہ پڑھنے والی روایتوں کو ترجیح دیا ہے:

﴿وإذا قرئ القرآن فاستمعوا له وأنصتوا لعلكم ترحمون﴾(سورة الأعراف: ٢٠٤)

قال الشيخ أحمد: روينا عن مجاهد أنه قال: كان رسول الله صلى الله عليه وسلم يقرأ في الصلاة سمع قراءة فتىً من الأنصار فنزلت هذه الآية.(معرفة السنن والآثار،القراءة خلف الإمام (ح: ٣٧٣٩)/أحكام القرآن للطحاوي، تأويل قوله تعالىٰ:﴿وإذا قرئ القرآن فاستمعوا له وأنصتوا لعلكم ترحمون﴾: ٢٤٤/١،مركز البحوث الإسلامية التابع لوقف الديانة التركي.انيس)

عن أبي موسىٰ قال علمنا رسول الله صلىٰ الله تعالىٰ عليه وسلم قال إذا قمتم إلى الصلاة فليؤمكم أحدكم وإذا قرأ الإمام فانصتوا.(مسند الإمام أحمد،حديث أبي موسىٰ الأشعري (ح: ١٩٧٢٣)/الصحيح لمسلم ،باب التشهد في الصلاة،رقم الحديث: ٤٠٤)

(۳)　آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے دونوں طریقے مروی ہیں، احناف کے نزدیک آہستہ آمین کہنا بہتر ہے۔(۱)

(۴)　رفع یدین کے بارے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے دونوں طریقے منقول ہیں۔(۲) احناف کے یہاں رفع یدین نہ کرنا افضل ہے۔(۳)

تحریر: محمد طارق ندوی۔ تصویب: ناصر علی ندوی۔ (فتاویٰ ندوۃ العلماء: ۸۱/۲-۸۲)

☆☆☆

---

(۱)　عن الحسن أن سمرة بن جندب وعمران بن حصين تذاكرا فحدث سمرة بن جندب أنه حفظ عن رسول اللّٰه صلى اللّٰه تعالىٰ عليه وسلم سكتتين: سكتة إذا كبر وسكتة إذا فرغ من قراءة غير المغضوب عليهم ولا الضالين.(سنن أبى داؤد، باب السكتة عند الافتتاح: ۷۷٤) انيس)

(۲)　أن رسول اللّٰه صلى اللّٰه تعالىٰ عليه وسلم كان يرفع يديه حذو منكبيه إذا إفتتح الصلاة وإذا كبر للركوع وإذا رفع رأسه من الركوع رفعهما كذلك أيضاً.(صحيح البخارى، كتاب الصلاة باب رفع اليدين فى التكبيرة الأولىٰ مع الإفتتاح سواء، رقم الحديث: ۷۳۵)

عن علقمة قال قال عبداللّٰه بن مسعود رضى اللّٰه تعالىٰ عنه: ألا أصلى بكم صلاة رسول اللّٰه صلى اللّٰه تعالىٰ عليه وسلم قال: فصلىٰ فلم يرفع يديه إلا مرة.(سنن أبى داؤد، باب لم يذكر الرفع عند الركوع، رقم الحديث: ۷٤۸/ جامع الترمذى، باب رفع اليدين عند الركوع، رقم الحديث: ۲۵۵)

(۳)　ولا يرفع يديه لا فى التكبيرة الأولىٰ.(الهداية مع فتح القدير: ۳۱۵/۱)